ممتاز حسین کی علمی اور ادبی خدمات

تلخیص

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی

مقالہ نگار

نازیہ سنبل

نگراں

پروفیسر شہاب الدین (ثاقبؔ)

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۲۰ء

تلخیص

فہرست ابواب

پروفیسر ممتاز حسین (یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء-۱۵/اگست ۱۹۹۲ء) کا شمار اردو کے سربرآوردہ نقادوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا لیکن بہت جلد تنقید نگاری کی طرف مائل ہو گئے اور ترقی پسند ناقدین کی فہرست میں نمایاں طور سے اپنی جگہ بنالی۔ مطالعے کی وسعت، گہرائی، تنقیدی بصیرت اور مختلف علوم وفنون سے واقفیت کی وجہ سے بہت جلد ان کی شناخت قائم ہوگئی۔ اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، عزیز احمد اور احتشام حسین ان کے پیش روؤں میں سے تھے۔ ممتاز حسین جس وقت ادبی دنیا میں وارد ہوئے اس وقت ترقی پسند تحریک جماعتی مصلحتوں یا کوتاہ نظری کے باعث غلط روش پر گامزن تھی۔ انھوں نے نہ صرف ان سے اختلاف کیا بلکہ نظریاتی جنگ بھی لڑی۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵٦ء تک ترقی پسند ادبی تحریک میں انتہا پسندی عروج پر تھی۔ اس وقت عبدالحلیم اور سردار جعفری نے ادیبوں کو قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالنے کی تلقین کی تھی۔ ان حالات میں ترقی پسند ادیبوں کو ان کی کوتاہیوں سے آگاہ کرنے والوں میں ممتاز حسین سب سے آگے تھے۔ ترقی پسند تحریک سے گہری وابستگی کے باوجود انھوں نے ترقی پسندوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کو اجاگر کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ وہ اپنے موقف پر عمر بھر قائم رہے۔

اردو کے دیگر ناقدین کے مقابلے میں ممتاز حسین کا امتیاز یہ تھا کہ انہیں فلسفے سے بہت گہرا شغف تھا۔ فلسفے کا ان کا مطالعہ مارکسزم تک محدود نہیں تھا بلکہ انھوں نے دیگر فلسفوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے مارکس کے افکار کو جذب کرکے اس طرح اپنی تحریروں میں پیش کیا جس کی مثال دوسرے ناقدین کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کا مارکسزم کا مطالعہ صرف روس کی سرکاری مطبوعات تک محدود نہ تھا بلکہ دیگر یوروپی ممالک سے شائع ہونے والی تصانیف کا بھی انھوں نے بغور مطالعہ کیا۔ وہ نہ صرف کلاسیکی

مارکسزم سے واقف تھے بلکہ مغرب میں مارکسزم سے متعلق ہونے والے تازہ ترین کام اور مباحث سے بھی واقفیت رکھتے تھے، جس کی جھلک ان کے نظام لکچر میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

ممتاز حسین کا سخت گیر ترقی پسندوں سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ ان کا خیال تھا کہ جس نظام فکر اور نظام حیات میں اختلاف رائے کی گنجائش، اس کی ضرورت اور اس کے اظہار کا طریقہ موجود نہیں ہوتا وہ نظام فکر اور نظام حیات زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ سوویت روس کی شکست و ریخت اور روس میں کمیونزم کے انحطاط کی وجہ وہ اسی کو مانتے ہیں۔ سخت گیر موقف کی جگہ انھوں نے آزاد خیالی کو راہ دی اور زندگی کے آخری لمحوں تک آزاد خیال مفکر اور نقادوں کے طور پر اپنی حیثیت برقرار رکھی۔

ممتاز حسین کا انتقال اگست ۱۹۹۲ء میں ہوا، ان کے انتقال کو اب ۲۹ سال ہو چکے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق ابھی تک کوئی ایسی تصنیف یا مربوط تحریر سامنے نہیں آئی ہے کہ ممتاز حسین کی علمی اور ادبی خدمات کو تحقیق کا موضوع بنایا جائے۔ اسی خیال کے تحت میں نے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ لکھنے کا ارادہ کیا۔

ممتاز حسین کی علمی و ادبی خدمات سے متعلق اس تحقیقی مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''ممتاز حسین کے مختصر سوانحی حالات'' پر مشتمل ہے، جس میں ان کے بزرگوں کے حالات، ان کی ولادت، بچپن، ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم، ملازمت، شادی، ادبی زندگی کا آغاز، ہجرت پاکستان، آخری ایام اور وفات تک کے تمام اہم حالات و واقعات بہ مشکل تمام یکجا کر کے ان کی سوانح اور شخصیت کا ایک خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ممتاز حسین نے ہندوستان سے ترک وطن کر کے پاکستان میں سکونت اختیار کر لی تھی اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزرا، اس لیے ان کے سوانحی حالات تک رسائی حاصل کرنا اور وہ بھی موجودہ حالات میں خاصہ مشکل کام تھا۔

دوسرے باب میں ممتاز حسین کی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تنقید اور تحقیق کے موضوع پر ان کی کل چودہ کتابیں: ''نقد حیات، ادبی مسائل، نئی قدریں، نئے تنقیدی گوشے، یگانہ: شخص اور شاعر، انتخاب غالب مع مقدمہ، باغ و بہار مع مقدمہ و فرہنگ، ادب اور شعور، غالب ایک مطالعہ، امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری، نقد حرف، امیر خسرو دہلوی (بزنان انگریزی) حالی کے شعری نظریات، مارکسی

جمالیات'' یہاں دستیاب ہیں۔ ان کی دو کتابوں ''میر تقی میر: حیات اور شاعری'' اور ''اقبال'' کا ذکر تو ملتا ہے لیکن تلاش بسیار کے باوجود یہ دونوں کتابیں دستیاب نہیں ہوسکیں۔ ممتاز حسین کی ایک اور کتاب ''روح عصر'' ۲۰۰۳ء میں پاکستان میں شائع ہوئی جو ہماری دسترس سے ہنوز باہر ہے۔

تیسرے باب ''ممتاز حسین کی تنقید نگاری'' میں ممتاز حسین کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جائزے سے قبل تنقید کے معنی و مفہوم کی وضاحت کے ساتھ ساتھ شعرائے اردو کے تذکروں میں تنقیدی عناصر کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ممتاز حسین کے تنقیدی سرمایے کا جائزہ لینے سے قبل اردو تنقید کے مختلف دبستان اور چند اہم تنقید نگاروں کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے۔ بعد ازاں ممتاز حسین کی تنقید نگاری کا مطالعہ اور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کے چوتھے باب میں ممتاز حسین کی تحقیقی کاوشوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن اس سے قبل تحقیق کے مفہوم اور معنی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اردو میں تحقیق و تدوین کی روایت کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں ممتاز حسین کی تحقیقی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کے پانچویں باب میں ممتاز حسین کی ادبی خدمات پر عمومی تبصرہ کیا گیا ہے تاکہ ان کی تحقیقی و تنقیدی خدمات کا ایک واضح نقش مرتب ہوسکے اور تحقیق و تنقید میں ان کے مقام اور مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکے۔

ممتاز حسین یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو قصبہ پارہ غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پارہ ہی میں ہوئی، انٹرنس کا امتحان یہیں سے پاس کیا۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایونگ کرسچین کالج سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی ایڈ کیا اور ۱۹۴۶ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔

ممتاز حسین نے تدریسی زندگی کا آغاز کالون کالج لکھنؤ سے کیا، اس کے بعد ممبئی میں دو برس تک انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیے۔ اس کے علاوہ ممبئی یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے طالب علموں کی تدریس بھی کی۔ تقسیم ہند کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں دو

سال تک وہ فری لانس جرنلزم کرتے رہے۔ اس سے قبل ممبئی میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار ''نیا زمانہ'' سے وابستہ رہے۔ علاوہ بریں پاکستان میں دیگر کئی اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ایک ادبی رسالہ ''روح ادب'' نکالا تھا۔ وہ مشہور روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ کچھ عرصے کے بعد پھر دوبارہ انھوں نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور کراچی کے مختلف کالجوں میں بیس برس تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ وہ سراج الدولہ کالج کراچی سے ۱۹۷۶ء میں بحیثیت پرنسپل ریٹائر ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد بھی کئی برسوں تک کراچی یونیورسٹی میں ایم اے کے طلباء کو اعزازی طور پر پڑھایا۔ پی ایچ ڈی کے نگراں بھی رہے۔ اپنی وفات کے وقت وہ فیڈرل کالج میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے ایم اے اردو کے طلباء کو تعلیم دیتے رہے۔

ممتاز حسین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نویسی سے کیا۔ ان کے کچھ افسانے ممتاز رومانی کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کے یہاں طبع زاد اور غیر طبع زاد دونوں طرح کے افسانے ملتے ہیں۔ ان کا پہلا طبع زاد افسانہ ''تصور کی شکست'' ہے جو الہ آباد یونیورسٹی کے سالانہ میگزین میں ۱۹۳۸ء میں چھپا تھا، لیکن ان کی بیٹی ناہید سلطان کا کہنا ہے کہ میں نے ان کا ۱۹۳۵ء میں شائع شدہ افسانہ جس کا عنوان شاید کالی لڑکی تھا، پڑھا ہے۔ ممتاز حسین کو ان دو کتابوں ''غالب: ایک مطالعہ'' اور ''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری'' پر داؤد ادبی انعامات سے نوازا گیا۔ ان کتابوں پر انھیں رائٹر گلڈ کا انعام بھی ملا۔ ترقی پسند خیالات کی وجہ سے ممتاز حسین کو قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ ۱۹۵۲ء میں فیض احمد فیض کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کیا گیا۔ تقریباً چھ ماہ قید میں رہے۔ دوسری بار ۱۹۵۴ء میں گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا، اس دفعہ روپوش ہو گئے۔ کچھ عرصے کے لیے ہندوستان چلے آئے۔ پھر حالات معمول پر آنے پر پاکستان لوٹے۔

ممتاز حسین مطالعے کے عادی تو تھے ہی، انھیں کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ انھیں سائنس کے مضامین سے بڑی رغبت تھی۔ وہ علوم فلکیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

ممتاز حسین کی پہلی تنقید کتاب ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آئی۔ اپنی اس پہلی تصنیف کے ذریعے ہی انھوں نے تنقید کی دنیا میں اپنی جگہ بنالی۔ وہ ادب میں مارکس اور ترقی پسند نظریہ کے حامی تھے۔ ان کے طرز تحریر میں انفرادیت تھی۔ انھوں نے اپنے پیش رووں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی ڈگر الگ بنائی

اوراس رستے پر عمر بھر فعال وسرگرم رہے۔ وہ اردو کے ان گنے چنے نقادوں میں سے ایک ہیں جو ادبی تنقید اوراس کی شرائط سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان شرائط پر ممکنہ حد تک عمل پیرا بھی رہتے تھے۔ ممتاز حسین کی تصنیف و تالیف کا دورانیہ پچاس سال پر محیط ہے۔ ممتاز حسین تنقید کو اعلیٰ انسانی خیالات کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

ممتاز حسین نے اپنی تنقید کی عمارت ٹھوس علمی اساس پر کھڑی کی۔ ان کی تنقید میں فلسفیانہ تصورات، سماجی بصیرتیں اور سیاسی اعمال آپس میں گندھے ہوئے ہیں۔ وہ ادب کو فنی یا جمالیاتی نظر سے دیکھنے کے بجائے پیداوار کے ذرائع کے ساتھ حیات انسانی کے ابھرتے ہوئے شعور سے کام لیتے ہیں۔ آل احمد سرور کے مطابق ''ان کی تنقید میں منطقی لب ولہجہ اور سائنٹفک ترتیب پائی جاتی ہے۔''

ممتاز حسین کا تعلق ترقی پسندی اور مارکسیت دونوں سے تھا۔ تنقید نگاروں کے درمیان ان کی پہچان ایک وسیع النظر، وسیع المشرب اور بے تعصب نقاد کی تھی۔ وہ ایک آزاد خیال مفکر اور تنقید نگار تھے۔ ان کی ترقی پسندی مارکسزم سے بلند ہو کر ایک کثیر الجہت رجحان کی حامل بن گئی تھی۔ اس رجحان نے انہیں لکیر کا فقیر بننے سے بچالیا تھا۔

ممتاز حسین نے مارکسی فلسفے کا بہت زیادہ مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے طبقاتی کشمکش اوراس کے اثرات کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا تھا۔ مارکسی تنقید میں اقتصادی مسائل کی تفہیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس پر مختلف فنون کی عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں اوراس کو نظر انداز کر کے زندگی کی تنقید کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ واضح علمی اسلوب اور فلسفیانہ طریقۂ کار کے ساتھ ساتھ ان کی تنقید میں جو منطقی لب ولہجہ اور سائنٹفک ترتیب پائی جاتی ہے، اس سے ان کی تنقید اور بھی امتیازی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

ممتاز حسین نے ہندوستانی ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادبیات کا مطالعہ کیا تھا۔ مغربی ادیبوں میں انھیں شیکسپیئر، گوئٹے، پشکن، چیخوف، میکسم گورکی، روماں، رولاں، بالزاک، لوٹر گاں برگ اور سولوخوف بہت زیادہ پسند تھے۔ ان ادیبوں کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مغربی ادیبوں کے کارناموں پر سطحی نظر ڈالنے کی وجہ سے ادب میں بعض غلط فہمیوں کا اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور بھی اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔

ممتاز حسین نے اردو شاعری میں مختلف شعراء کے فکروفن کا محاسبہ کیا ہے۔ اپنی تنقید میں انھوں نے غالب، حالی اور اقبال کے فکروفن کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ غالب کے فن پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے انھوں نے غالب کو مفکر طبقے کا پیش رو تسلیم کیا ہے۔ حالی کو انھوں نے پہلا ترقی پسند نقاد قرار دیا ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ حالی نے ادب اور زندگی میں رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر اقبال کی شاعری کو بہت عقیدت و احترام کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ شاعر مشرق اور شاعر اسلام جیسے القاب اسی بات کی غمازی کرتے ہیں۔ ممتاز حسین کہتے ہیں کہ ایسے جذباتی القاب سے اقبال کا فن مکمل طور پر آشکار ہونے سے رہ گیا ہے۔ ممتاز حسین کا اعتراض ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کے زوال پر نظر ڈالتے وقت صرف فکری محرکات پر غور کیا ہے، مادی اسباب کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اسکی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اقبال مابعدالطبیعاتی رجحانات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ذرائع پیداوار کی تبدیلی اور نئے معاشرے کے وجود میں آنے کو اہمیت نہیں دی۔ وہ دوٹوک انداز میں کہتے ہیں کہ ''کوئی بھی شاعر کسی مذہبی یا سیاسی تحریک کی بنا پر آفاقی نہیں بن سکتا۔''

ممتاز حسین کی تنقیدوں میں ''انسان'' کو مرکزیت حاصل ہے اور یہیں سے ان کی عملی تنقید کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ انسان کو انھوں نے ایک نظریہ اور ایک اجتماعی قوت تصور کیا ہے۔ عالمگیریت، حریت اور اخوت کے تصورات کو وہ اسی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ممتاز حسین کی تنقید اعلیٰ انسانی اقدار کے رنگ ونسل اور طبقاتی امتیازات کو رد کرتی ہے۔ یہ انسان دوستی انہیں قدیم ادب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ممتاز حسین کا انسان تاریخ کو اپنے شعور سے تخلیق کرتا ہے اور کائنات پر چھا جاتا ہے۔ ان کا یہ تصور ان کے دل ودماغ پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ اس کا اعلان تبلیغی انداز اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنے مضامین میں بار بار اس کا حوالہ دیتے ہیں۔

ممتاز حسین نے اپنی من پسند تنقید نگاری کے ذریعہ اپنے زمانے کے تنقیدی رجحانات اور تنقید وفکر کو سائنسی سمت اور فلسفیانہ انداز دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہ زندگی اور معاشرے کے تمام حالات و اقدار کو حرکت و تغیر کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ جس خیال اور رجحان کے علمبردار تھے اس پر عمر بھر سختی سے جمے رہے۔ پروفیسر شہزاد منظر نے ممتاز حسین کو احتشام حسین کے پائے کا نقاد بتایا

ہے اور یہ اعتراف کیا ہے کہ کبھی کبھی وہ بعض معاملات میں احتشام حسین پر بھی فوقیت حاصل کر لیتے ہیں۔

ممتاز حسین کے یہاں تنقید و تحقیق میں گہرا رشتہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے تنقید نگاری کے ساتھ ساتھ تحقیق کے میدان میں بھی کئی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں جس کو ہر حلقے میں اعتبار و استناد حاصل ہے۔ ممتاز حسین کا تحقیقی سفر باغ و بہار سے شروع ہوا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ باغ و بہار امیر خسرو کی تصنیف قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے اور یہ ترجمہ میرامن دہلوی نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر کیا تھا۔ قصہ چہار درویش کا اصل مصنف کون ہے؟ یہ مسئلہ آج بھی تحقیق طلب ہے۔ اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی اہم ہے کہ میرامن کے ترجمے کی نوعیت کیا تھی؟ لفظی یا آزاد؟ ممتاز حسین نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ باغ و بہار کا ماخذ نوطرز مرصع ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے یہ غلط فہمی بھی دور کی کہ میرامن نے باغ و بہار کی تالیف کے وقت نوطرز مرصع کا ذکر نہیں کیا اور اپنی کتاب کا ماخذ قصہ چہار درویش کو ٹھہرایا۔ ممتاز حسین یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ آکسفورڈ کی بورڈن لائبریری میں قصہ چہار درویش کا ایک نسخہ موجود ہے اور اس نسخے کے سرورق پر قصہ چہار درویش لکھا ہوا ہے۔ ممتاز حسین کی تحقیق کے مطابق محمود شیرانی کے پیش نظر جو نسخہ تھا اس کو تقدم حاصل نہیں ہے۔ انھوں نے حافظ شیرانی کے اس بیان کو کہ میرامن نے امیر خسرو سے متعلق روایت کو فارسی مطبوعہ نسخے (مولفہ امیر احمد شاہ خلف محمد شاہ) کے دیباچے سے نقل کیا ہے، غلط ٹھہرایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قصہ محمد شاہ سے پہلے عوام کے درمیان مشہور تھا۔

''غالب: ایک مطالعہ'' ممتاز حسین کا دوسرا بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اپنی تصنیف میں ممتاز حسین نے غالب کے فن اور شخصیت کے کئی اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے مطالعہ غالب کو نئی جہت عطا کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں غالب کے ان مختلف عطایا کا ذکر کیا ہے جن سے اردو ادب کے............ میں خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے غالب کے خیالات کو تجدید حیات کا سرچشمہ مانا ہے اور یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ غالب کے اشعار نے ہمارے ادب کو نئی جمالیات عطا کی ہے اور تقلید کے بجائے تنقید کا شعور بخشا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے انگریزی تہذیب و تمدن کے زیر اثر آنے والے تغیرات سے غالب کے ذہنی رشتے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

''غالب: ایک مطالعہ'' اس لحاظ سے بھی ممتاز حسین کی ایک اہم تصنیف ہے کہ اس میں انھوں نے

غالب کی تعقل پسندی اور انسان دوستی کو اہمیت دی ہے۔ یہ مطالعہ تاریخ کا ایک اہم رخ ہے۔ یہ مطالعہ کسی بھی دور کے انسان، ان کی تہذیب، ان کی طرز فکر، مستقبل کی طرف بڑھتے قدم، انسانی ارتقا اور تنزل کے اسباب و علل پر غور کرنے کا ایک تاریخی زاویہ بھی فراہم کرتا ہے۔

''انتخاب غالب'' ممتاز حسین کی بڑی دلچسپ تصنیف ہے۔ اس میں ممتاز حسین مرزا غالب سے ہم کلام نظر آتے ہیں۔ ممتاز حسین غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ان سے سوال کرتے ہیں اور غالب ان کا جواب دیتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے غالب کے خاندانی حالات اور ذاتی زندگی کے احوال کے علاوہ ان کی تعلیم اور شعر و شاعری سے متعلق بعض نکتوں کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے اس روایت کو غلط بتایا ہے کہ غالب نے نظیر اکبرآبادی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد اعظم سے حاصل کی تھی۔ غالب کی تعلیم کے سلسلے میں ایک اور نام ملا عبدالصمد کا بھی آتا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ ممتاز حسین نے غالب کی شاعری میں عجمیت، زرتشتیت، اشراقیت اور افلاطونیت کے جن عناصر کی نشاندہی کی ہے، وہ قابل توجہ ہے۔ غالب نے اپنے اکثر اشعار میں تصوف کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ انتخاب غالب میں ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ تصوف سے ان کی دلچسپی نظریاتی تھی نہ کہ عملی، غالب کو فلسفے سے خاصی دلچسپی تھی۔ وہ تاعمر فلسفے کا مطالعہ کرتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ ممتاز حسین نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ شیخ محمد اکرام نے غالب کی شاعری کو کیوں کر فلسفے سے خارج قرار دیا۔ ان کے خیال میں شیخ اکرام کی یہ رائے ناانصافی پر مبنی ہے۔

تنقید اور تحقیق کی دنیا میں ممتاز حسین کی کتاب ''حالی کے شعری نظریات: ایک مطالعہ'' کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ حالانکہ حالی کے بعض مغربی مآخذ کو پہلی بار ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمہ شعر و شاعری مرتب کرتے ہوئے متعارف کرایا تھا لیکن حالی کے سلسلے میں ان کا انداز جارحانہ تھا۔ اس سلسلے میں ممتاز حسین کا رویہ وحید قریشی سے مختلف ہے۔ انھوں نے مقدمے کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی زیادہ تر توجہ حالی کے مآخذ پر ہی رہی۔ حالی نے افلاطون، شیکسپیئر، ملٹن، والٹر، اسکاٹ، گولڈ اسمتھ وغیرہ کا خود تذکرہ کیا ہے، لیکن بعض مباحث کے بیان میں یہ لکھا ہے کہ ''ایک یورپین محقق ان لفظوں کی شرح اس طرح کرتا ہے'' اور پھر واوین میں اس کی رائے درج کی ہے۔ ممتاز حسین نے اپنی تحقیق سے یہ

ڈھونڈ نکالا ہے کہ وہ یورپین محقق کولرج ہے۔ انھوں نے کولرج کی اصل عبارت بھی اپنی کتاب میں درج کر دی ہے۔ اس طرح انھوں نے حالی کے بیانات کو اصل ماخذ کی روشنی میں پرکھا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے ممتاز حسین کی اس کوشش کو تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ ممتاز حسین نے اس کتاب میں ان تمام مآخذ کو دریافت کیا ہے، جو اس سے قبل دریافت نہیں کیے گئے تھے۔ انھوں نے ان تمام مآخذ پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ سید محمد عقیل نے ممتاز حسین کی اس تصنیف کو اردو والوں کے لیے Eye opener (انتباہ) بتایا ہے۔

غالب کے مطالعے کے بعد ممتاز حسین نے امیر خسرو کے مطالعے پر اپنی توجہ صرف کی۔ ایک طویل اور عمیق مطالعے کے بعد ان کی کتاب ''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری'' منظر عام پر آئی، جس میں انھوں نے امیر خسرو سے متعلق متعدد غلط روایات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی تردید کی۔ انھوں نے ۲۹۵ صفحات کی اس تصنیف میں بہت چھان بین کے بعد بعض ایسے نکتے ابھارے جن پر یا تو لوگوں کی نظر نہیں گئی تھی یا گئی تو اختلافات باقی رہے تھے۔ اپنی تحقیق سے انھوں نے ثابت کیا کہ امیر خسرو کے والد کا نام سیف الدین لاچین تھا جبکہ عوام کے درمیان سیف الدین محمود رائج تھا۔ خسرو کی جائے پیدائش کے بارے میں انھوں نے تحقیق کے ذریعہ بتایا کہ خسرو پٹیالا میں نہیں بلکہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود خسرو کے نام کے متعلق ان کی تحقیق ہے کہ ان کا نام ابوالحسن یمین الدین نہیں بلکہ اصل نام محمد خسرو تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ سے ان کے تعلقات پیری مریدی کے نہیں دوستی و ہم نشینی کے تھے۔ امیر خسرو نے ایک سیاست دان اور دنیادار کی زندگی گزاری۔ امیر خسرو کی عقیدت حضرت نظام الدین اولیاؒ سے چاہے جتنی گہری ہو لیکن انھوں نے اپنی جاہ طلبی کو خیرباد نہیں کیا تھا۔ حافظ کی غزل گوئی سے متعلق ممتاز حسین نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ حافظ نے خسرو سے فیض حاصل کیا۔ سعدی اور حافظ کے درمیان خسرو ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔

ممتاز حسین نے اپنے تحقیقی مضامین اور تصانیف میں نہایت باریک بینی کے ساتھ نئے نئے حقائق کا انکشاف کرتے ہوئے بہت سی مروجہ روایتوں کی تردید کی۔ اردو تحقیق میں وہ اپنی اس باریک بینی اور نکتہ رسی کی بنیاد پر یاد رکھے جائیں گے۔ ادبی نقاد کی حیثیت سے انھوں نے افراط و تفریط سے گریز کرتے

ہوئے توازن اوراعتدال کی راہ اختیار کی۔ترقی پسند ہونے کے باوجود ان کےنظریات میں وہ شدت نہیں ہے جو بعض دوسرے ترقی پسند نقادوں کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ممتاز حسین نے کلاسیکی شعر و ادب کا ازسرنو مطالعہ کرکے اس کا جائزہ لینے اور قدر و قیمت متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی۔اردو تنقید میں بھی وہ اپنے متوازن انداز اور اصابت رائے کی بنا پر یاد رکھے جائیں گے۔

○

کتابیات

(الف) ممتاز حسین کی تصانیف/تالیفات

تصنیف	مصنف	ناشر	سن
ادب اور شعور	ممتاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۶۱ء
ادبی مسائل	ممتاز حسین	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۵۵ء
امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری	ممتاز حسین	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
انتخاب غالب مع مقدمہ	ممتاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۵۷ء
باغ و بہار مع مقدمہ و فرہنگ	ممتاز حسین	اردو ٹرسٹ، کراچی	۱۹۵۸ء
حالی کے شعری نظریات (ایک تنقیدی مطالعہ)	ممتاز حسین	سعد پبلیکیشنز، کراچی	۱۹۸۸ء
غالب: ایک مطالعہ	ممتاز حسین	انجمن ترقی اردو، کراچی	۱۹۶۹ء
مارکسی جمالیات (نظام لکچر)	ممتاز حسین	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی	۱۹۸۹ء
نقد حرف	ممتاز حسین	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۵ء
نقد حیات	ممتاز حسین	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	۱۹۵۰ء
نئی قدریں	ممتاز حسین	استقلال پریس، لاہور	۱۹۵۳ء
نئے تنقیدی گوشے	ممتاز حسین	آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی	۱۹۶۴ء
یگانہ: شخص اور شاعری	ممتاز حسین	اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۸ء

(ب) دیگر امدادی کتب

تصنیف	مصنف	ناشر	سن
ادب اور انقلاب	اختر حسین رائے پوری	ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد	۱۹۴۳ء
ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۴ء
ادبی اصناف	ڈاکٹر گیان چند	گجرات اردو اکادمی	۱۹۸۹ء
ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خاں	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۵ء
ادبی تحقیق	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۶ء

ادبی تنقید کے اصول	کلیم الدین احمد	کے۔جی۔سیدین میموریل ٹرسٹ جامعہ نگر، دہلی	۱۹۸۳ء
ادبی تنقید کے لسانی مضمرات	مرزا خلیل احمد بیگ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۲ء
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	۱۹۸۳ء
اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ	۱۹۸۳ء
اردو تنقید کا ارتقا	عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۲ء
اردو تنقید-منتخب مقالات	حامدی کاشمیری	ساہتیہ اکادمی	۱۹۹۷ء
اردو تنقید (مسائل و مباحث)	مرتبہ: پروفیسر منظر عباس نقوی	شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۹۳ء
اردو تنقید کی تاریخ	ڈاکٹر مسیح الزماں	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۶ء
اردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۲ء
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۷ء
اصول انتقادِ ادبیات	عابد علی عابد	مجلس ترقی اردو، لاہور	۱۹۶۰ء
اصول تحقیق و ترتیب متن	تنویر احمد علوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۳ء
اصول تحقیق	عبدالستار دلوی	شعبہ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی	۱۹۸۴ء
افکار کے دیئے	آل احمد سرور	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۰ء
ایجاب و انحراف (تحقیق و تنقید)	نسیم احمد نسیم/ ذہن اختر ندوی	نئی دہلی	۱۹۹۹ء
آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید	شارب ردولوی	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۹۱ء
پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال	شہزاد منظر	منظر پبلیکیشنز	۱۹۹۶ء
تاریخ ادب اردو	نور الحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۱ء
تاریخ ادب اردو (ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک، جلد اول)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۷ء
تاریخ ادب اردو (ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک، جلد دوم)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۷ء
تحقیق شناسی (ترتیب و حواشی)	رفاقت علی شاہد	القمر انٹر پرائزز، غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور	۲۰۰۳ء
تحقیق کا فن	ڈاکٹر گیان چند	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۴ء
تحقیق نامہ	مشفق خواجہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۱۹۹۱ء
تحقیق و تدوین (مسائل اور مباحث)	حنیف نقوی	اسکرین پلے، تل بھانڈیشور، وارانسی	۲۰۱۰ء

تحقیق وتدوین — ابن کنول — شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی — ۲۰۰۶ء

تحقیق وتنقید — یوسف سرمست — آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرس کونسل — ۱۹۹۹ء

تدوین، تحقیق، روایت — رشید حسن خاں — ایس اے پبلیکیشنز — ۱۹۹۹ء

ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر — قمر رئیس — نیا سفر پبلیکیشنز — ۱۹۸۷ء

ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری — انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ — ۱۹۵۷ء

ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری — یعقوب یاور — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۱۹۹۷ء

ترقی پسند تحریک — اطہر نبی — ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ — ۱۹۸۶ء

ترقی پسند تنقید اور محمد حسن — شبنم ناز — شوبی آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، دہلی — ۲۰۱۰ء

ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ — سید محمد عقیل — دریا آباد، الہ آباد — ۲۰۰۹ء

ترقی پسند تنقید — تنویر خانم — تخلیق مرکز، لاہور — ۱۹۸۴ء

ترقی پسند ادب — عزیز احمد — پروپرائٹر ادارہ اشاعتِ اردو — ۱۹۴۵ء

ترقی پسند تحریک کی نصف صدی — علی سردار جعفری — شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی — ۱۹۸۷ء

تنقید اور عملی تنقید — سید احتشام حسین — یونین پرنٹنگ پریس، اردو بازار جامع مسجد دہلی — ۱۹۵۲ء

تنقید اور اصول تنقید — عبادت بریلوی — ادارہ ادب وتنقید، لاہور — ۱۹۸۴ء

تنقید اور جدید اردو تنقید — وزیر آغا — مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی — ۱۹۸۹ء

تنقید اور تجزیہ — جمیل جالبی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۱۹۸۹ء

تنقید شعر العجم — محمود شیرانی — ۱۹۴۳ء

تنقید کیا ہے — آل احمد سرور — مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی — ۲۰۱۱ء

تنقید کے بنیادی مسائل — آل احمد سرور — علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ — ۱۹۶۷ء

تنقیدی اشارے (مع اضافہ جدیدہ) — آل احمد سرور — ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ — ۱۹۶۴ء

تنقیدی تناظر — قمر رئیس — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۱۹۷۸ء

تنقیدی دبستان — ڈاکٹر سلیم اختر — بک کارپوریشن، دہلی — ۲۰۰۵ء

تنقیدی عمل — شارب ردولوی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۱۵ء

تنقیدی مباحث — شارب ردولوی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۱۹۹۵ء

تنقیدی مطالعے — شارب ردولوی — نصرت پبلشرز — ۱۹۸۴ء

تنقیدی نظریات (حصہ دوم) — سید احتشام حسین — اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ — ۲۰۰۹ء

تنقیدیں	خورشید الاسلام	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۷ء
تنقیدی افکار	شمس الرحمٰن فاروقی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۴ء
تنقیدی مقالات	سید محی الدین قادری زور	مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی اسٹیشن روڈ حیدرآباد، دکن	۱۹۲۷ء
جدید ادب منظر اور پس منظر	احتشام حسین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
جدید اردو تنقید: اصول و نظریات	شارب ردولوی	اتر پردیش اردو اکادمی	۱۹۹۴ء
جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات	ڈاکٹر خورشید جہاں	منشا پبلی کیشنز، ہزاری باغ	۱۹۸۹ء
جدید تنقیدی مقالے	محمد حنیف/ ارتضیٰ کریم	معرف گنج، گیا	۱۹۸۳ء
دبستانوں کا دبستان۔ کراچی حصہ اول	احمد حسین صدیقی	محمد حسن اکیڈمی	۲۰۰۳ء
سودھ پرودھی اور پرکریا	چندر بھان رات اور رام کمار کھنڈیلوال، جواہر پشتکالے، متھرا		۱۹۷۹ء
سودھ سوروپ ایوم مانک	بیج ناتھ سنگھل	میکملن کمپٹی آف انڈیا، دہلی	۱۹۸۰ء
شعرائے اردو کے تذکرے	حنیف نقوی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۸ء
صورت و معنی سخن	شمس الرحمٰن فاروقی	اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس	۲۰۱۱ء
فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	نور الحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۹ء
فیض میر	مصنفہ: سلطان الشعراء حضرت میر محمد تقی میر، مع مقدمہ و ترجمہ فرہنگ		
	مرتب: سید مسعود حسن رضوی ادیب، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ		دوسرا ایڈیشن
قاضی عبدالودود: تحقیقی و تنقیدی جائزے	نذیر احمد	غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ نئی دہلی	۱۹۹۱ء
قدیم اردو کی تازہ تحقیق	محی الدین قادری زور	سید از سری نگر	
لفظ و معنی	شمس الرحمٰن فاروقی	شب خون، کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد	۱۹۶۸ء
مابعد جدیدیت (مضمرات و ممکنات)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۴ء
مارکسی جمالیات	اصغر علی انجینئر	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۸۴ء
مارکسی فلسفہ (اشتراکیت اور اردو ادب)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۰ء
مارکسزم اور ادب (منتخب مضامین)	پروفیسر محمد حسن	اعلیٰ پریس، دہلی	۱۹۸۱ء
مشرقی شعر اور اردو تنقید کی روایت	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۲ء
مطالعہ و تنقید	اختر انصاری	فرینڈس بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
معاصر اردو تنقید: مسائل و میلانات	شارب ردولوی	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۹۴ء
معاصر تنقیدی رویے	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۵ء

مقدمات عبدالحق (اضافہ شدہ)	ڈاکٹر عبادت بریلوی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۵ء
نظریاتی تنقید- مسائل اور مباحث	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۶ء
نقد و تحقیق	ساحل احمد	اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد	۱۹۹۸ء
نئی تنقید	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۸ء
ہماری شاعری (معیار و مسائل)	سید مسعود حسن رضوی ادیب	کتاب نگر دین دیال روڈ، لکھنؤ	۱۹۶۷ء

(ج) رسائل و جرائد

فکر و نظر	جولائی	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۶۳ء
روح ادب ماہنامہ	ادارہ فروغ اردو کراچی	شمارہ نمبر ۱۹	
روح ادب ماہنامہ	ادارہ فروغ اردو کراچی	شمارہ نمبر ۱۷	
روح ادب ماہنامہ	ادارہ فروغ اردو کراچی	شمارہ نمبر ۱۸	
روح ادب ماہنامہ	ادارہ فروغ اردو کراچی	شمارہ نمبر ۱۵، ۱۶، مئی- جون ۱۹۵۳ء	
خیال (سہ ماہی)	حبیب احسن	جلد ۵- شمارہ: ۱۷- اپریل تا جون ۲۰۰۶ء	
جدید رجحانات کا ادبی آئینہ)			
ہم قلم (ماہنامہ، جلد ۱، شمارہ ۱۲)	ادارہ مصنفین پاکستان، حلقہ کراچی، اگست ۱۹۶۱ء		
ہم قلم (ماہنامہ، جلد ۱، شمارہ ۳)	ادارہ مصنفین پاکستان، حلقہ کراچی، نومبر ۱۹۶۰ء		

☆

فہرست ابواب

باب اوّل

ممتاز حسین کے مختصر سوانحی حالات

سید ممتاز حسین کی پیدائش ضلع غازی پور (اتر پردیش) کے ایک گاؤں پارہ میں یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ایک زمیندار اور تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ زمانے کے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ انھوں نے 'گلستاں'، 'بوستاں'، 'انوار سہیلی' کے کچھ حصے اپنے والد سید فیاض حسین سے پڑھے جو کہ کسی ریاست میں منیجر (منشی) تھے۔ پڑوسی گاؤں نوشہرہ کے ایک ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر سے تھوڑی سی انگریزی پڑھی۔ بعد میں ان کا داخلہ ایک انگریزی اسکول میں کرادیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں سٹی ہائی اسکول غازی پور سے سکینڈ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کا داخلہ الہ آباد کے کرسچین کالج میں ہوا جہاں سے انھوں نے ۱۹۳۶ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں بی ایڈ کا امتحان پاس کیا، بعد ازاں ۱۹۴۶ء میں آگرہ یونیورسٹی سے پرائیوٹ ایم اے (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔ تقریباً دو سال تک انجمن اسلام ممبئی کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ ان کی عملی زندگی کا باقی اور بڑا حصہ پاکستان میں گزرا۔ پاکستان کی علمی، ادبی اور سیاسی فضا میں تقریباً بیالیس سال سرگرم عمل رہے۔ ۱۵/اگست ۱۹۹۲ء میں انتقال کیا۔ سخی حسن قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

پروفیسر ممتاز حسین کے مذکورہ بالا سوانحی حالات کی توثیق ان کی صاحبزادی ڈاکٹر ناہید سلطان کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

> ''ریکارڈ کے مطابق ابا یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو غازی پور کے ایک گاؤں پارہ میں پیدا ہوئے۔ ابا نے ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ گلستاں، بوستاں اپنے والد سے پڑھی اور فارسی میں عبور حاصل کیا۔ سٹی ہائی

اسکول غازی پور سے ۱۹۳۴ء میں میٹرک کرنے کے بعد الہ آباد آ گئے،
جہاں کرسچین کالج سے انٹر اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے مکمل کیا۔ اس
کے بعد مسلم یونیورسٹی سے بی ایڈ اور آگرہ یونیورسٹی سے پرائیوٹ ایم
اے (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔ ابا کے ایک بڑے بھائی بھی تھے،
جنھوں نے فارسی میں ایم اے کیا تھا۔ ہندوستان کی معروف ترقی پسند
اور روشن خیال شخصیات ڈاکٹر مونس رضا اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر
راہی معصوم رضا ابا کے ماموں زاد بھائی تھے۔''[۱]

ڈاکٹر ناہید سلطان اپنی ننھیال کی بااثر اور نمائندہ شخصیات کے بارے میں پوچھے گئے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہیں:

''ہمارے خالو جناب شفیق نقوی ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کے
بانیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ایک ماموں کمال الدین نقوی کراچی
یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ جبکہ دوسرے انصار الدین سید
کا تعلق بھی جامعہ کراچی سے رہا اور تیسرے پروفیسر جمال نقوی کا تعلق
اردو کالج سے رہا۔ ہمارے ننھیال میں زیادہ تر لوگ لفٹسٹ تھے۔''[۲]

ڈاکٹر ناہید سلطان نے مذکورہ بالا انٹرویو میں اپنے بھائی بہنوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ:

''میرے بڑے بھائی جو کہ امریکہ میں ہیں وہ انجینئر ہیں اور دوسرے کا
تعلق فارماسیوٹیکل ادارے سے ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں اور میری چھوٹی
بہن آرکیٹیکٹ ہے۔ ابا کی طرح ہم سب بھی سلف میڈ ہیں۔''[۳]

پروفیسر ممتاز حسین کے والد خاصے تعلیم یافتہ اور علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ سید فیاض حسین کی علم دوستی کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کے دونوں بیٹے عصری تعلیم کے اعلیٰ مدارج تک پہنچے۔ ممتاز حسین سائنسی مزاج اور منطقیانہ طرز فکر کے حامل تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں سائنس پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ انھوں نے اپنے بچوں کو ادب و تاریخ کی جگہ میڈیکل اور

انجینئر نگ جیسے سائنسی علوم کی تحصیل کی طرف رغبت دلائی۔ ممتاز حسین کو ادب کے ساتھ ساتھ سائنس سے بڑی رغبت تھی وہ طالب علمی کے زمانے میں 'نیچر' میگزین شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ علوم فلکیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

سید ممتاز حسین نے ملازمت کا آغاز درس و تدریس سے کیا۔ انھوں نے ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک کالون تعلقدار کالج (لکھنؤ) میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے مامور رہے۔ وہ اس ادارے میں ریسرچ کے کام کے ساتھ ساتھ ممبئ یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے طلبا کی تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

ممبئ کی علمی و ادبی فضا انہیں بہت راس آئی۔ صحیح معنوں میں یہیں سے ان کی تخلیقی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ قیام ممبئ کے دوران ان کے حلقۂ احباب میں زیادہ تر ترقی پسند شعرا اور مصنفین ہوا کرتے تھے۔ ممبئ میں ممتاز حسین علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی ایک ہی فلیٹ میں رہتے تھے جہاں بقول ڈاکٹر ناہید سلطان: ہر اتوار کے کھانے کے بعد تین بجے سے نشست ہوتی تھی اور تازہ تحریریں پڑھی جاتی تھیں۔ جو لوگ شریک ہوتے تھے ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ساحر لدھیانوی، ملک راج آنند، علی سردار جعفری، مہدی حسن اور کنور مہندر سنگھ وغیرہ شامل تھے۔ ممبئ کے اس ادبی ماحول نے ان کے فکر و فن پر گہرے اثرات مرتب کیے اور یہیں سے انھوں نے ترقی پسند تحریک میں فعال اور موثر کردار ادا کرنا شروع کیا۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء میں وہ پاکستان چلے گئے۔ ابتدائی دو سال تک اردو اور انگریزی میں فری لانس جرنلزم میں مصروف رہے۔ بعد ازاں کئی اخبار و رسائل کو اپنی خدمات پیش کیں۔ کچھ دنوں روزنامہ ''امروز'' اور ''پاکستان ٹائمز'' کراچی سے وابستہ رہ کر پھر سے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا اور تقریباً بیس بائیس سال تک مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ بالآخر سراج الدولہ گورنمنٹ کالج کراچی سے ۱۹۷۶ء میں پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے سبکدوش ہوئے لیکن سبکدوشی کے بعد بھی انھوں نے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا اور کئی برسوں بعد تک اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے فیڈرل اردو کالج (موجودہ اردو یونیورسٹی) اور کراچی یونیورسٹی میں ایم اے کے طلبا و طالبات کو اردو

پڑھانے کے علاوہ ریسرچ اسکالر کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔

پاکستان میں ممتاز حسین اور ان کے اہل خانہ کا قیام پی آئی بی کالونی میں رہا جہاں ان کے حلقۂ احباب میں عزیز حامد مدنی، جمیل اختر، احمد ہمدانی، اطہر نفیس اور صہبا لکھنوی جیسے لوگ شامل تھے، بعد میں فیڈرل بی ایریا منتقل ہوگئے جہاں اخلاق اختر حمیدی، مسعود احمد برکاتی، قمر جمیل اور سلیم احمد جیسی اہم ادبی شخصیات کا اضافہ ہوا۔ یہاں ان کا زیادہ تر وقت انھیں شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں کے ساتھ زندگی کے مختلف مسائل اور ادبی معاملات وموضوعات پر گفتگو کرنے میں گزرتا۔ وہ رات گئے تک تخلیقی کاموں میں مصروف رہتے۔

پروفیسر ممتاز حسین ترقی پسند تحریک کے بڑے اہم اور مضبوط ستون تھے، ان کی علمی، ادبی اور تحریکی سرگرمیوں نے اس عہد ساز تحریک کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے روشن خیالی، سماجی مساوات، انسان دوستی کے پیغام کو سماج میں عام کیا۔ ان کی کتاب پر انہیں رائٹرز گلڈ ایوارڈ دیا گیا۔ ماسکو، چین، لندن، کناڈا، ایران، دبئی اور ہندوستان میں انھیں بلایا گیا۔ ہندوستان، پاکستان کی مختلف یونیورسٹیز میں ان کی علمی وادبی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہ حیثیت مجموعی ان کی علمی وادبی خدمات پر سیر حاصل کام نہیں ہوا، جس کا خود انھیں بھی ملال تھا۔ غالباً اس کی وجہ ان کی ترقی پسندانہ فکر تھی جس کی انہیں پاکستان میں بھرپور قیمت چکانی پڑی۔ بقول ڈاکٹر ناہید سلطان:

> ''۱۹۵۲ء میں فیض صاحب کے ساتھ ابا (سید ممتاز حسین) کے خلاف بھی وارنٹ جاری ہوئے۔ وہ گرفتار ہوئے اور چھ ماہ پس زنداں بھی رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پھر ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے وہ انڈر گراؤنڈ ہوگئے اور کچھ عرصے کے لیے بھارت چلے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی گرفتاری کے احکامات پھر جاری ہوئے، اس طرح ادب اور ترقی پسندی نے انہیں نام ونمود، عزت وشہرت دی مگر ان کو ان کا حق اور ذہنی سکون ملنے نہیں دیا۔'' [۴]

ممتاز حسین کا مزاج سائنسی تھا اور طبیعت میں سنجیدگی غایت درجے کی تھی۔ ان کے یہاں بقول ڈاکٹر محمد رضا کاظمی جذبات کے اظہار کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ وہ والہانہ لہجے میں کبھی کسی کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ تنقیدی معاملات میں علمی اور ادبی دیانت سے کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ اس معاملے میں دوست احباب اور رشتہ داروں کی ناراضگی کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے۔ مبصرین نے ان کی ادبی دیانت کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں۔ وہ ن م راشد کے برخلاف عسکری سے اتفاق کرتے ہوئے ورڈز ورتھ کو عظیم شاعر قرار دیتے تھے۔ تنقید نگار کی حیثیت سے جتنا ان کے ہم عصران کی پذیرائی کرتے تھے اتنا ہی زیادہ ان کی طبیعت کی سنجیدگی اور مطالعے کی گہرائی سے گھبراتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں آل احمد سرور ان کی کتاب ''نقد حیات'' پر تفصیلی اور توصیفی تبصرہ کرتے ہیں تو دوسری طرف سید سجاد ظہیر جلسۂ عام کے لیے ان کی موجودگی کو ناموزوں قرار دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر کاظمی نے مجتبیٰ حسین کی موجودگی میں از راہ مذاق کہہ دیا تھا کہ یگانہ پر آپ کا مضمون مجتبیٰ حسین کے مضمون سے بہتر ہے۔ اس سادہ لوح ناقد نے یہ جملہ ممتاز حسین کے سامنے دہرا دیا۔ یہ بات ممتاز حسین کو سخت ناگوار گزری اور انھوں نے برملا اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ تب ڈاکٹر کاظمی نے معذرتی طور پر کہا کہ میں نے تو یہ بات مذاقاً کہی تھی۔ ممتاز حسین نے جواب دیا ''جی نہیں، ایسا جملہ آپ مذاق سے بھی نہیں کہہ سکتے۔'' ایسے کئی واقعات ہیں جن سے ادبی اقدار سے ان کی گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

ممتاز حسین کی ذاتی زندگی سے متعلق بہت کم تفصیلات ملتی ہیں۔ لیکن جس قدر حالات معلوم ہوئے ہیں اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عائلی زندگی خاصی خوش گوار اور آسودہ حال رہی ہوگی۔ ان کی ذاتی زندگی میں خاصہ نظم وضبط اور رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ اپنی اولاد کی پرورش اور تعلیم وتربیت میں انہیں نمایاں کامیابی ملی۔ ان کے چاروں بچوں نے اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کی اور اچھی اچھی ملازمتیں حاصل کیں۔ مختصر یہ کہ ان کی علمی وادبی سرگرمیاں ان کی عائلی زندگی سے متعلق ذمہ داریوں اور فرائض کی ادائیگی کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوئیں۔ اپنے بچوں کی سیر وتفریح کے لیے بھی ان کے پاس کافی وقت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر ناہید سلطان سے یہ پوچھا گیا کہ ان کے والد کو کن کن چیزوں کا شوق تھا تو وہ بتاتی ہیں:

''ابا کو جانوروں کا بہت شوق تھا۔ وہ ہمیں Zoo لے جاتے تھے اور

جانوروں کی فلمیں بھی دکھاتے تھے۔انھوں نے ایک کتا بھی پالا تھا جسے
خود ہی نہلانے لے جاتے تھے۔‘‘

ممتازحسین کا ادبی ذوق اور تخلیقی شعور ان کے بچوں میں منتقل نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنے بچوں کو سائنسی علوم کی تحصیل کی طرف رغبت دلانے میں کامیابی ضرور حاصل کی تاہم ان کے بچوں کا ادبی ذوق افسانہ پڑھنے سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ بچے ان کی تنقیدی تحریریں پڑھنے سے گھبراتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی تنقیدی تحریروں میں استعمال ہونے والے الفاظ و اصطلاحات خاصے مشکل ہوا کرتے تھے۔[۴]

ممتازحسین کا پڑھنے اور لکھنے کا انداز بالعموم ریسرچ اسکالر جیسا ہوتا تھا۔ ان کے لکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ دیر رات تک چلتا رہتا تھا۔ وہ عام طور پر تخت پر بیٹھ کر کام کرتے تھے اور دوران کار ان کے چاروں طرف کھلی ہوئی کتابیں اور رسالے بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ مخصوص طریقۂ کار ان کی تنقیدی تحریروں کو تحقیقی اعتبار و استناد سے ہم کنار کرتا تھا۔

ممتازحسین کی حیات میں ان کی چودہ کتابیں چھپ چکی تھیں۔۲۰۰۳ء میں ایک اور کتاب ’’ادب اور روح عصر‘‘ شائع ہوئی تھی جو ہمیں دستیاب نہیں ہوسکی۔ ان میں سے دو کتابوں ’’غالب ایک مطالعہ‘‘ اور ’’امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری‘‘ پر انہیں داؤد ادبی انعامات و اعزازت سے نوازا گیا۔ ان کی دو کتابیں زیر طبع ہیں۔ میر تقی میر: حیات اور شاعری اور اقبال۔ ممتازحسین کی زیر طبع اور غیر مطبوعہ تحریروں کے بارے میں جب ڈاکٹر ناہید سلطان سے استفسار کیا گیا تو انھوں نے کہا:

> ’’اقبال پر ہمیں ان کے جستہ جستہ مضامین ملے ہیں، جنھیں یکجا کر کے چھاپا جاسکتا ہے مگر میر پر ہمیں کوئی مواد نہیں ملا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مشفق خواجہ کی لائبریری میں بیٹھ کر کچھ تحریر کر رہے تھے مگر ہمیں کچھ نہیں مل سکا۔ جوش ملیح آبادی پر ان کا ایک طویل مقالہ جو انھوں نے کناڈا میں پڑھا تھا موجود ہے۔ اخبارات و رسائل میں شائع شدہ انگریزی مضامین کو بھی چھاپا جاسکتا ہے۔‘‘[۵]

ممتازحسین کے انتقال کے بعد ان کے ذاتی کتب خانے سے کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ ان کے

وارثوں نے مدینۃ الحکمت لائبریری کو اس شرط پر دیا تھا کہ مذکورہ لائبریری میں ان کے نام کا گوشہ قائم ہو لیکن یہ شرط پوری نہیں ہوئی۔ اب بھی بہت سی کتابیں ان کے گھر میں موجود ہیں جن میں زیادہ تر کتابیں مارکسزم سے متعلق ہیں۔

ممتاز حسین کے انتقال کے بعد ان کے کارناموں کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے وارثوں نے کراچی یونیورسٹی کو دس ہزار روپئے کا عطیہ اس غرض سے دیا کہ اس رقم سے اردو میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلباء کو انعام دیا جائے۔ علاوہ بریں ان کے گھر والوں نے ارتقا ادبی فورم کے اشتراک سے سالانہ یادگاری خطبات کا بھی سلسلہ شروع کیا ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے اس وقت کیا جب وہ بی اے کے طالب علم تھے۔ عام خیال یہ ہے کہ ان کا پہلا افسانہ ''مصور کی شکست'' الہ آباد کے سالانہ میگزین میں ۱۹۳۸ء میں چھپا۔ لیکن ان کی صاحبزادی ڈاکٹر ناہید سلطان کا بیان ہے کہ ان کا پہلا افسانہ ''کالی لڑکی'' کے عنوان سے ۱۹۳۵ء میں چھپا۔ ان کے ابتدائی تین افسانے مختلف ادبی گلدستوں میں بھی شائع ہوئے۔ ان کے کچھ افسانے ممتاز رومانی کے نام سے بھی شائع ہوئے۔ مگر جلد ہی ان کا میلان طبع تنقید نگاری کی طرف ہو گیا۔ ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''نقد حیات'' کے عنوان سے ۱۹۵۰ء میں الہ آباد پبلشنگ ہاؤس کے زیر اہتمام سلیمی برقی پریس سے شائع ہوا، بعد ازاں تنقیدی مضامین کے مختلف مجموعوں کے ساتھ ساتھ بعض شعراء کی شخصیت اور شاعری سے متعلق مستقل کتابیں بھی اشاعت پذیر ہوئیں۔

ممتاز حسین کے تنقیدی شعور کی ترقی اور بالیدگی انہیں تحقیق کی طرف لے گئی۔ انھوں نے اس حقیقت کو شدت سے محسوس کیا کہ تنقید تحقیق سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ بالفاظ دیگر تحقیق کے بغیر تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ غالب اور امیر خسرو سے متعلق ان کی تصانیف تنقید و تحقیق کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ سید ممتاز حسین کو ان دونوں کتابوں پر اہم ادبی اعزازات سے نوازا گیا۔

پروفیسر ممتاز حسین اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین کئی دہائیوں تک اردو انگریزی کے معیاری رسائل و جرائد میں تواتر کے ساتھ چھپتے رہے۔ انگریزی زبان سے واقفیت اور غیر معمولی شغف نے جہاں انہیں مغرب کے ادبی سرمایے

سے روشناس کیا تو دوسری طرف ان کے تصور شعروادب میں بھی وسعت و ہمہ گیری پیدا کی۔

پروفیسر ممتاز حسین نے متعدد ممالک کی سیر کی، قومی اور بین الاقوامی سطح کے مذاکرات میں تنقیدی اور تحقیقی مضامین پیش کیے۔ عالمی ادب کی شاہکار تخلیقات کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس دور کی عظیم ادبی شخصیات سے مسلسل تبادلۂ خیال نے ان کے ذہن و دل پر گہرے اور مثبت اثرات مرتب کیے۔ ممتاز حسین کی افتادِ طبع انہیں مارکسزم اور ترقی پسندیت کی طرف لے گئی۔ مارکسزم اور ترقی پسندی اس زمانے کا عام رجحان بھی تھا۔ دوسری طرف اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، پروفیسر عبدالعلیم، احتشام حسین، عزیز احمد اور سجاد ظہیر جیسی قدآور ادبی شخصیات سے ان کے قریبی تعلقات اور گہرے مراسم نے ان کے ترقی پسندانہ رجحانات و خیالات کو اور بھی مہمیز کیا۔ پروفیسر ممتاز حسین اپنے عہد کے دوسرے ترقی پسند ناقدین سے کسی قدر مختلف نظر آتے ہیں۔ ممتاز حسین کے یہاں ان کے ہم عصروں کی طرح نظریاتی شدت نظر نہیں آتی۔ سحر انصاری کا یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ ''پروفیسر ممتاز حسین ترقی پسند تنقید کی ایک خاص روایت کے آخری آدمی تھے۔'' اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر وہ آگے لکھتے ہیں کہ:

> ''خود احتسابی کو وہ اپنی ذات اپنی انجمن دونوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے اسی لیے ان کی تنقید فکر انسانی کے ارتقاء سے گہری واقفیت کا پتا دیتی ہے، جس میں عصبیت، کوتاہ نظری اور جانب داری کا دخل نہیں ہے۔ وہ ایک سائنس داں کی طرح حقائق معلومہ سے ایسے نتائج کی طرف جانا چاہتے ہیں جو ان حقائق کا سائنسی اور منطقی نتیجہ ہوں۔ اس میں اپنی ذاتی خواہش کو شامل کر کے وہ حقائق کا رخ بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ ایسی معروضیت اردو کے نقادوں میں کم ہی کے حصے میں آئی ہے۔''[۶]

معروضیت کے ساتھ ساتھ غیر جانداری وسیع النظری، روشن خیالی اور توازن و اعتدال ان کی تنقید نگاری کی بنیادی خصوصیات قرار پاتی ہیں۔ پروفیسر ممتاز حسین کو بنی بنائی ڈگر پر چلنا ہرگز گوارا نہیں تھا ان کی طبیعت کی انفرادیت انہیں اپنی راہ آپ منتخب کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس لیے وہ کوئی بھی ادبی محاکمہ اپنی ذاتی سمجھ کو بروئے کار لائے بغیر نہیں کرتے تھے۔ اپنے تنقیدی نگارشات میں وہ ہم عصروں سے اکثر

اختلاف کرتے تھے اور اپنے موقف کی حمایت میں مضبوط اور قابل فہم دلیلیں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر ممتاز حسین کا مزاج منطقی اور فلسفیانہ تھا۔ وہ باقاعدہ فلسفے کے طالب علم کبھی نہیں رہے لیکن مارکسزم کے غیر معمولی مطالعے نے ان کے مزاج میں منطقیت اور فلسفیانہ انداز پیدا کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر بڑے فنکاروں کی تخلیقات میں فکری عناصر کی چھان بین کرتے نظر آتے ہیں۔ ''جوش: فکر و فن کے آئینے میں'' ایسا ہی ایک عالمانہ مضمون ہے۔ اس مضمون کے اعتبار و استناد کی اصل بنیاد مارکسیت سے ان کی گہری واقفیت ہی قرار دی جاسکتی ہے۔ جوش کے فکر و فن سے متعلق ان کے ہم عصروں کی تحریروں میں جو ابہام پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ مارکسیت پر ان کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔

ممتاز حسین کی تنقیدی بصیرت کا نقش اول ان کا مشہور اور معرکۃ الآرا مضمون ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق'' تھا۔ اس مضمون کی اشاعت نے اردو ناقدین کو محض چونکایا ہی نہیں غور و فکر پر بھی آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس مضمون میں اٹھائے گئے مباحث کی بناء پر بحث و تمحیص کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس مضمون میں ممتاز حسین نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ماضی کے تہذیبی اور ادبی ورثے کی تلاش اور پرکھ میں مسلسل غلطیاں ہوتی رہی ہیں۔ انھوں نے اس معاملے میں روسی دانشوروں کو بھی مستثنٰی قرار نہیں دیا تھا۔ ممتاز حسین نے اپنے موقف کی حمایت میں لکھا ہے کہ:

> ''مارکسی تنقید میں اقتصادی بنیاد کی اولیت اور طبقاتی جنگ ادبی جانچ پڑتال کا بہترین آلہ ہے، لیکن جب اس آلے کو باقاعدہ تمام حالات اور علوم کا جائزہ لیے بغیر میکانکی طور سے استعمال کیا جاتا ہے تو یہی آلہ دشمنی اور جہالت کا حربہ بھی بن جاتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے پہلے اور بعد میں نہ صرف روس ہی میں بلکہ اینگلز اور مارکس کے زمانے میں خود جرمنی میں بھی ایسے ناقدین موجود تھے جو مارکسزم کو ایک میکانیکی علم بنا کر ماضی کے ادب کو جانچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر مارکس اور اینگلز دونوں ہی نے اپنا قلم اٹھایا ہے۔ اسی طرح لینن نے ہرزہ گو معلموں کے خلاف نہ صرف بہت کچھ لکھا ہے بلکہ عملی تنقید کے ذریعے ہماری

رہنمائی بھی کی ہے۔ہم کوشش کریں گے کہ اپنے ماضی کے ادب کو کسوٹی
بناتے وقت ان کی تعلیمات کو سامنے رکھیں۔'' ۷؎

سماجی زندگی کا تاریخی ارتقاء ممتاز حسین کی تنقیدی فکر میں اساسی حیثیت رکھتی ہے۔وہ اسی پیمانے پر مارکسیت کو بھی پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے خیال میں غلامی طبقاتی شعور کی مختلف منزلوں سے دوچار رہی ہے اور طبقاتی کشمکش کا ہی منطقی نتیجہ ہے۔طبقاتی سمجھوتوں کو الگ الگ ترقی پسند ناقدین نے الگ الگ طریقے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں ممتاز حسین کا نقطۂ نظر ہم عصر مارکسی نقادوں سے بڑی حد تک الگ ہے۔وہ ڈکنس کے ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ڈکنس کمپرومائز کرتا تھا۔تاہم اس کے ناولوں میں پایا جانے والا جمالیاتی کیف ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ان کے خیال میں شیکسپیئر کے ڈرامے کا ہیرو تقدیر کے تابع ہونے کے باوجود ڈرامے کے جمالیاتی کیف پر اثرانداز نہیں ہوتا۔وہ ادب کی جمالیاتی اقدار کے پوری طرح قائل تھے اور انہیں اس جہت میں مارکس اور حافظ شیرازی کی رہنمائی حاصل تھی۔

ممتاز حسین کی تنقید نگاری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے جہاں مارکسی نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کی، وہیں دبستان تنقید کو مقبول تر اور قابل فہم بنا دیا۔اس روش نے انہیں احتشام حسین اور ڈاکٹر عبدالعلیم سے بالکل الگ ایک انفرادی پہچان عطا کی تھی۔بعض ناقدین کا خیال ہے کہ متذکرہ بالا دونوں ناقدین کی تحریروں سے ادبی دہشت پسندی کی ایک صورت بھی نکلتی ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے کہ:

''ترقی پسند نقادوں میں ممتاز حسین کو صحیح معنوں میں مارکسی نقاد کہا جاسکتا ہے۔مارکسی ہونے کا دعویٰ تو بہت سے دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کو بھی ہے لیکن ان ادیبوں نے مارکسی نظریے کو پوری طرح سمجھے بغیر محض جوش عقیدت میں اپنایا ہے۔جن حضرات نے مارکسی فلسفے کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے ان کے یہاں مارکسزم کو پوری طرح ہضم نہ کرنے کے سبب یا فنون لطیفہ سے طبعی مناسبت نہ ہونے کی

وجہ سے ایک میکانکی طریقۂ کار ملتا ہے، جس نے ادب اور تنقید کے بہت سے مسائل کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیا ہے۔ ان سے بعض ایسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن سے ترقی پسند ادیبوں کو بھی نقصان پہنچا اور ان کے اپنے شعور کی خامی نے بعض اہل نظر کو مارکسی فلسفے سے ہی بدظن کر دیا۔ ممتاز حسین نے اپنا وقیع اور گراں قدر مقالہ ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق'' لکھ کر اس دشوار گزار راہ کو بڑی حد تک روشن اور واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ان کا پہلا مقالہ ہے جس نے ترقی پسند ادبی حلقوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور بہت سے ادبی مجاہد اپنے اپنے قلم لے کر میدان میں اتر آئے اور مناظرے اور مجادلے کی فضا پیدا ہوگئی۔ چونکہ ممتاز حسین کا مطالعہ مغرب و مشرق کے فلسفے کا عمومی حیثیت سے اور مارکسی فلسفے کا خصوصی حیثیت سے بہت گہرا ہے اور ادبی تاریخ کے ارتقاء پر بھی ان کی نظر ہے۔ اس لیے انھوں نے علمی دلائل کی روشنی میں اس معرکے کو سرانجام دیا اور ہمارا خیال ہے کہ کامیابی انہیں کے ہاتھ رہی۔''[۸]

ممتاز حسین کے یہاں دوسرے مارکسی ناقدوں کی طرح شدت پسندی نہیں ہے۔ ترقی پسندوں میں ان کی ایک الگ ہی پہچان ابھرتی ہے اور وہ پہچان ہے ایک لبرل اور آزاد خیال مارکسی نقاد کی۔ انھوں نے شعر و ادب کے جو اصول و ضوابط وضع کیے وہ ادب کی دائمی اقدار سے متعلق ہیں اور بڑی مضبوط دلیلوں پر استوار کیے گئے ہیں۔ وہ ادب کے سماجی پہلو کے ساتھ معاشی پہلو پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ سماجی نظام کی تشکیل و تعمیر میں اقتصادی قوتوں کے ساتھ فکری جہتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں۔ ممتاز حسین مارکس کے متوازن نظریے کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مارکسی تنقید کا بھی نظریہ انتہاپسندوں سے بچنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک وہ خالص خارجیت جو واقعہ نگاری اور Ideological

Literature کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری خالص داخلیت جو
اپنی عصبیتوں اور ذہنیت کا پہاڑ کھڑا کر دیتی ہے مارکسی ناقد ان دونوں
پہلوؤں کے موزوں اور متوازن نکات کو بروئے کار لاتا ہے۔''۹

ممتاز حسین شعر و ادب کا جائزہ طبقاتی شعور کی روشنی میں لیتے ہیں۔ یہ طبقاتی شعور سماجی زندگی کے تاریخی ارتقاء کے مطالعے سے پیدا ہوتا ہے اور غالباً اسی بناء پر ماضی کے تہذیبی و ادبی روثے کی اہمیت پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ شعر و ادب کی افادیت کے ساتھ جمالیاتی اقدار کی ابدیت کے بھی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جمالیاتی اور فنی عناصر ادب کو ابدیت عطا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ماضی کے ادبی ورثے کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

ممتاز حسین نے اپنا نظریہ شعر و ادب مارکس کے نظریۂ ادب کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد تشکیل دیا تھا۔ اس لیے ان کا نظریۂ ادب مارکس کے نظریے سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ وہ تاریخی ارتقاء کے تسلسل سے متعلق مارکس کے رویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ماضی کے ادب عالیہ کے بارے میں کارل مارکس کا نقطۂ نظر تاریخی
تھا۔ چونکہ اس کی حقیقت بیں نگاہیں ایک دور کو دوسرے دور کے ساتھ
گڈمڈ نہیں کرتی تھیں اور چونکہ وہ سماجی شعور کے مختلف منازل سے بھی
واقف تھا اس لیے وہ جمالیاتی حظ حاصل کرنے سے بھی پرہیز نہیں کرتا
تھا۔ آخر ادب کا بھی تو ایک حسن ہے جسے مارکس نے ابدی حسن کہہ کر یاد
کیا ہے۔''۱۰

ممتاز حسین کے اس بیان سے مارکس کے ادبی نظریات سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ مارکس ادبی حسن کی ابدیت اور جمالیاتی اقدار کی اہمیت کا معترف تھا۔ انھوں نے مارکس کی تحریروں کی روشنی میں ہی اپنا ادبی نظریہ اور تنقیدی رویہ وضع کیا تھا اور بڑی آسانی سے مطابقت کی راہ ہموار کر لی تھی۔ عام ترقی پسندوں کی طرح وہ بھی مواد کو ہیئت پر اور معنی کو اسلوب پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی تحریروں میں مارکس کے اس خیال کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ مادہ خیال سے مقدم

ہے۔ بقول ممتاز حسین:

''جس طرح خیال اور مادے، سماجی شعور اور زندگی کا باہمی عمل جدلیاتی ہے یعنی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح صورت و معنی کا عمل بھی جدلیاتی ہے لیکن ہر صورت میں جس طرح مادہ مقدم ہے خیال پر اور زندگی مقدم ہے سماجی شعور پر، اسی طرح معنی مقدم ہے صورت پر۔''[۱۱]

''ادب اور سیاست'' ترقی پسند تنقید کا اہم اور متنازعہ موضوع ہے۔ اس معاملے میں ترقی پسند ناقدین دو گروہ میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک طرف وہ گروہ تھا جس کی قیادت سجاد ظہیر کر رہے تھے، یہ سمجھتا تھا کہ ادیبوں کا عملی سیاست میں حصہ لینا بے حد ضروری ہے۔ دوسرا گروہ جس میں اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، پروفیسر عبدالعلیم، احتشام حسین وغیرہ پیش پیش تھے ادیبوں کے عملی سیاست میں حصہ لینے کو غیر ضروری خیال کرتا تھا۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے ناقدین کا خیال تھا کہ ادیبوں اور فن کاروں کو اپنی ادبی اور فنی تخلیقات کے ذریعے سیاست وقت پر اثر انداز ہونا چاہیے۔ ادبی تخلیقات کو کھلا پروپیگنڈہ اور نعرے بازی کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ ممتاز حسین کی تنقیدی بصیرت ایک درمیانی راہ پیدا کرتی ہے۔ ان کے خیال میں تقاضائے وقت کے تحت شاعر و ادیب عملی سیاست میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ ادب کسی ازم کی تبلیغ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد قومی تاریخ کو اس کے بڑھتے ہوئے روپ میں پیش کرنے اور حقیقت کو دریافت کرنے کا ہے لیکن اگر کسی منزل حیات میں قومی زندگی کا اظہار سیاست ہی میں رونما ہو رہا ہو تو کیا اس سے آنکھیں بند کر لینا ادب اور زندگی کی خدمت ہوگی۔''[۱۲]

اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عملی سیاست میں حصہ لینا ترقی پسندوں کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ تقاضائے وقت کے تحت وہ سیاست میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ اگر ادیب سماج کا حساس فرد ہے تو وہ سماجی مسائل سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ عام حالات میں ماحول سے متاثر ہونے کی بناء پر

جانبداری کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ ادیب اگر طبقاتی شعور رکھتا ہے تو وہ اپنے طبقے کی حمایت یا جانبداری کا اظہار ضرور کرے گا لیکن کبھی کبھی اس کے برخلاف بھی ہوسکتا ہے یعنی ادیب اپنے ہی طبقے کے خلاف لکھ سکتا ہے۔ یہ بات ممتاز حسین نے مارکس اور اینگلز کے حوالے سے کہی ہے۔ انھوں نے یہ بات پورے وثوق اور تیقن سے کہی ہے کہ ہر ادیب کسی نہ کسی معنی میں اپنے طبقے کا طرف دار ضرور رہتا ہے۔ خاص طور پر بحرانی دور میں یہ طرف داری اور کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

ممتاز حسین ادبی تنقید کے عمل میں طبقاتی شعور، جدلیاتی مادیت کے ساتھ اقتصادی، سماجی، تاریخی، فکری اور جمالیاتی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ ادب میں ماضی کی اہمیت کے قائل ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ماضی کے ادب کو جو چیز سب سے زیادہ ابدیت عطا کرتی ہے وہ اس کا جمالیاتی پہلو ہے۔ بہ حیثیت مجموعی انھوں نے مارکسی فکر کو تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہے اور مارکسی فلسفے میں ادب کے جمالیاتی، فنی اور ادبی شعور کی نشاندہی بھی کی ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو مارکسی تنقید کے صحیح اور متوازن نظریے سے روشناس کرایا۔ شارب ردولوی کے درج ذیل بیان سے بھی ان حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔ شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> ''اردو تنقید میں ممتاز حسین کی شناخت ایک نظریہ ساز کی ہے۔ انھوں نے تنقید میں فلسفیانہ، مارکسی، سائنٹفک نقطۂ نظر کو فروغ دیا ہے لیکن وہ عام مارکسی نقادوں کی طرح صرف مارکس کے معاشی اور طبقاتی فلسفے کی تعبیر تشریح نہیں کرتے بلکہ ادب کی جمالیاتی، فنی اور ادبی حیثیت کا مطالعہ سماجی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے ایسے مدلل اور شگفتہ انداز میں کرتے ہیں کہ اس نقطۂ نظر کا نہ ماننے والا بھی ان کے نتائج سے انکار نہیں کرپاتا۔''[۱۳]

ممتاز حسین نے اصول تنقید اور ادبی مسائل پر قلم اٹھا کر اردو ادب کی نظریاتی سطح پر پائی جانے والی کم مائیگی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں اردو ادب کا سرمایہ نہایت محدود تھا۔ ممتاز حسین کی سنجیدہ کوششوں سے یہ کمی بڑی حد تک دور ہوگئی۔ ان کے تنقیدی مضامین کو پڑھ کر یہ پتا چلتا ہے کہ تنقید کا منصب

کیا ہے اور اس کی روح کن عناصر میں مضمر ہے۔ وہ شعر و ادب کو ذہنی، فکری اور تہذیبی زندگی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور ادبی اقدار کے تعین کے عمل میں فکری رجحانات اور بدلتے ہوئے عالمی حقائق کو خصوصیت سے مدنظر رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی حساس شاعر کے افکار و خیالات اس دور کے علوم و فنون اور سیاسی رجحانات سے بے تعلق نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کسی فن پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ کیا کہا گیا ہے اور کس طرح کہا گیا ہے۔ شاعر نے اپنی تخلیق میں اس عہد کی دردمندی اور انسان دوستی کے جذبات کو پیش کرنے میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے۔ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں اور اپنے دور کی اخلاقیات اور احساس دردمندی کے بدلتے ہوئے معیار و مفاہیم کا عکس اس کی تخلیقات میں نظر آتا ہے یا نہیں۔ ممتاز حسین کی تنقید نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ لفظ و معنی کے اٹوٹ رشتے کے قائل ہیں اور خیال اور زبان دونوں پر یکساں طور پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک صرف خیال کو ادب کے پرکھنے کا معیار نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ادب صرف تنہا خیالات ہی کے بل بوتے پر قدر آفریں نہیں ہوا کرتا وہ قدر آفریں اس وقت تک نہیں ہوتا جب کہ اس میں زبان کا بھی تخلیقی تصرف نہ کیا گیا ہو چنانچہ ادب کو جانچنے کا تنہا یہی معیار نہیں ہے کہ اس میں صداقت کے نئے پہلو دریافت کیے گئے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ آیا اس میں زبان کی بالقوۃ قوتوں کا تصرف کیا گیا ہے یا نہیں۔''[۱۴]

ممتاز حسین کے یہاں نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقیدیں ملتی ہیں۔ ان کے یہاں نظریہ و عمل میں قابل تعریف مطابقت پائی جاتی ہے۔ اپنے تنقیدی مضامین میں انھوں نے اپنے وضع کردہ اصولوں کو ہی بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ ''رسالہ در معرفت استعارہ'' اس کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے تنقید کے میدان میں پاؤں جمانے سے پہلے ذہنی، فکری، سیاسی اور سماجی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ بعد ازاں اسی مطالعے کی روشنی میں شعر و ادب کا جائزہ لیا ہے۔ مثال کے طور پر استعارے کی تفہیم کے سلسلے میں ان کا رویّہ تمام ہم عصروں سے بالکل الگ ہے۔ وہ پہلے استعارے کا جائزہ تہذیبی، سماجی اور علمی پس منظر میں لیتے ہیں پھر اس کے حاصل شدہ نتائج کی روشنی میں شاعری کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح

استعارے کا جومفہوم متعین ہوتا ہے، وہ علم بدیع کی کتابوں میں پیش کردہ تعریفوں سے بالکل الگ اور اس سے بلندتر ہوتا ہے۔اس طرح انھوں نے اردو تنقید میں نیا رجحان پیدا کیا ہے۔

ممتاز حسین کی تنقید نگاری کی دوسری بڑی خصوصیت ان کا عالمانہ اور محققانہ اسلوب ہے جو فلسفیانہ طریقہ کار یا اندازِ نظر کے باوجود بیان کی سادگی اور وضاحت کو برقرار رکھتا ہے۔مخصوص طریقۂ کار کی بنا پر ان کی تنقید کو سائنٹفک تنقید کے خانے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔

شارب ردولوی کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ ان کی تنقید میں سائنٹفک تنقید کے تقریباً تمام عناصر مل جاتے ہیں۔ادبی تنقید کی غرض و غایت پر معروضی انداز سے بحث کرتے ہوئے ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''ادبی تنقید اصل میں ادب کی تنقید ہے لیکن چونکہ ادب بذات خود زندگی کی تنقید ہے ادب کے پس منظر میں، اس لیے ادبی تنقید لامحالہ زندگی کی تنقید بن جاتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تنقید کرتے وقت ہم اپنا سارا وقت خیالات کے ہی تجزیہ میں صرف کردیں۔یہی دیکھتے رہیں کہ آیا اس میں زندگی کا صحیح عکس اور قدروں کا صحیح احساس ہے کہ نہیں اور اس کی ہیئت، جمالیاتی جذبہ، تخیل کی صورت آفرینی، جذبات کی دنیا، زبان کے حسن اور موسیقی کو نہ دیکھیں اور پرکھیں، جن کا یہ خیال ہے کہ ترقی پسند تنقید میں ان چیزوں کو کم اہمیت دی جاتی ہے انہیں مغالطہ ہوا ہے کیونکہ اگر ادب سے اس کا فارم جدا کردیا جائے تو وہ ادب کیونکر رہے گا۔''۱۵

مندرجہ بالا اقتباس جہاں ممتاز حسین کی نظری اور عملی تنقید پر ماہرانہ دسترس کا مظہر ہے، وہیں اس بات کا بھی مظہر ہے کہ انھوں نے فلسفۂ جمال اور عمرانیات کو ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔وہ ہیئت اور مواد دونوں کو یکساں اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔وہ ادب کی افادیت اور جمالیاتی پہلو دونوں سے ایک ساتھ نباہ کرتے ہیں۔

ممتاز حسین کی تنقیدی تصانیف میں ''غالب: ایک مطالعہ'' اور ''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری''

خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں دورِ جدید کی پیداوار ہیں اور اپنے مسائل و مباحث کے اعتبار سے عہد آفریں ثابت ہوئی ہیں۔ یہ دونوں تصانیف ممتاز حسین کے افکار و خیالات اور تنقیدی طریقۂ کار سے متعلق بنیادی حوالے کا کام کرتی ہیں۔

مذکوہ بالا دونوں تصانیف میں ممتاز حسین نے اپنی تنقید کی عمارت تحقیق کی مضبوط اور پائیدار بنیادوں پر اٹھائی ہے۔ مطالعۂ غالب میں مصنف نے غالب کا مطالعہ دورِ جدید کے افکار و خیالات کی روشنی میں کیا ہے اور غالب شناسی کی جہت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ غالب شناسی کے عمل میں ممتاز حسین کا تنقیدی رویہ ہمیں بطورِ خاص متوجہ کرتا ہے۔ ممتاز حسین شاعری میں شخصیت کے عنصر کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن شخصیت کے اظہار سے زیادہ شاعر کے شعری عمل پر زور دیتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شاعری اظہار ذات سے زیادہ عرفان ذات ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''فن کی معروضیت کو تسلیم کیے بغیر حسن ادا کا مسئلہ حل ہی نہیں ہوسکتا ہے۔ معنی میں گہرائی اور گیرائی طرز ادا سے پیدا ہوتی ہے۔ طرز ادا معنی کا ایک جزو ہے اور طرز ادا زبان پر قدرت حاصل کرنے کا نام ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو شاعری میں موازنہ اور مقابلہ بیکار ہو جائے اچھے اور برے کا معیار ہی اٹھ جائے اور شاعری صرف شخصیت کا اظہار بن جائے۔ نئی نسل کے بہت سے شعرا اسی گمرہی میں مبتلا ہیں۔ شاعری اظہاذات نہیں بلکہ عرفان ذات کا اظہار ہے۔ شخصیت کے تجزیے سے کسی بھی شاعر کی شاعری کے بہت سے پہلو اجاگر کیے جاسکتے ہیں لیکن یہ نفسیاتی تحلیل یہ نہیں بتاسکتی ہے کہ کوئی شعر اچھا ہے تو کیوں، اور برا ہے تو کیوں۔'' ۱۶

''امیر خسرو: حیات اور شاعری'' ممتاز حسین کی تنقیدی بصیرت کے ساتھ ان کی تحقیقی ژرف نگاہی کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ یہ کتاب حضرت امیر خسرو سے متعلق کئی چشم کشا حقائق کو پہلی بار منظر عام پر لاتی ہے اور تنقید میں تحقیق کی کارفرمائی اور ناگزیریت کو ظاہر کرتی ہے۔ ممتاز حسین نے امیر خسرو کی ابتدائی زندگی سے متعلق کئی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ مثلاً امیر خسرو پٹیالی کے نہیں، دہلی کے باشندہ تھے۔ وہ مخلوط

ازدواج کی پیداوار تھے، والد ترکی النسل تھے اور والدہ نومسلم راجپوت عماد الملک کی بیٹی تھیں۔ خسرو کے والد کا ترکی نام لاچین تھا اور اسلامی نام شمس الدین تھا اور وہ سیف الدین شمسی کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ خسرو کی مادری زبان دہلوی تھی۔ ان انکشافات کے علاوہ ممتاز محقق سید حسن عسکری نے ممتاز حسین کو خراج تحسین پیش کی ہے کہ انھوں نے حافظ شیرازی کی غزلوں پر امیر خسرو کی پیروی کے خاصے اہم ثبوت فراہم کیے ہیں۔ ممتاز حسین اپنی مشہور کتاب ''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''امیر خسرو نے اپنے دیوان ''تحفۃ الصغر'' کے دیباچے میں اپنے والد کا نام لاچین بتایا ہے اور تیسرے دیوان ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں انہیں پدر سیف شمسی اور پھر بعد میں سیفی کہہ کر یاد کیا ہے لیکن انھوں نے کہیں بھی محمود کا لفظ اپنے والد کے سلسلے میں استعمال نہیں کیا ہے، نہ تنہا، نہ کسی اور لفظ کے ساتھ ملا کر۔ لیکن دور حاضر کے مصنفین اول تو لاچین کو نظر انداز کرتے ہیں۔ گویا یہ کوئی نام نہیں بلکہ اسقاط نام ہے۔ ثانیاً سیف الدین شمسی لکھنے کے بجائے سیف الدین محمود اس دھڑلے سے لکھتے ہیں گویا یہ نام متحقق ہے۔ مجھے اعتراض لاچین کو صرف نظر کرنے اور سیف الدین کے ساتھ 'محمود' کے اضافے پر ہے کیونکہ خود خسرو یا ان کے کسی معاصر مورخ یا تذکرہ نگار نے نہ تو انہیں تنہا محمود کے نام سے یاد کیا ہے اور نہ سیف الدین کے ساتھ محمود کا اضافہ کیا ہے۔
>
> تحقیق کی دنیا میں ایسا کوئی سانحہ شاذ و نادر ہی گزرا ہوگا جب کسی محقق نے کسی شخص کے والد کے نام سے متعلق اس کے صحیح الدماغ بیٹے کے بیان کو جھٹلایا ہو۔ ایسا ایک المناک واقعہ کچھ دنوں تک میر تقی میر کی ولدیت سے متعلق تو روا رکھا گیا تھا، ایک فرضی نام عبداللہ ان کے والد کا گھڑ لیا تھا لیکن یہ سانحہ اتنا سنگین نہ تھا کیونکہ ذکر میر کے دستیاب ہونے سے پہلے میر کے والد کا نام لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ وہاں معاملہ صرف ایک

فرضی نام کے گھڑنے کا تھا۔ یہاں معاملہ صحیح الدماغ خسرو کے بیان کی تردید کا ہے نہ کہ عدم واقفیت یا کسی افسانہ طرازی کا......''

ممتاز حسین کے خیال میں خسرو کے اس بیان کے سامنے آجانے کے بعد کہ

''خسرو لاچین بندہ کمترین کے والد کا نام لاچین ہے۔'' حجت تمام ہوجاتی ہے لیکن:

''علامہ شبلی اور ڈاکٹر وحید مرزا دونوں کا یہ اصرار ہے کہ یہ ان کے والد کا نام نہیں، بلکہ ان کے قبیلے یا ان کے قبیلے کے کسی مورث اعلیٰ کا نام ہوگا اور اپنے اس اصرار کا یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ سمرقند کا ایک تذکرہ نگار دولت شاہ سمرقندی جو کبھی خود ہندوستان آیا نہ گیا، خسرو کی وفات کے پونے دوسال بعد اپنے تذکرۃ الشعراء (سن تالیف ۸۹۲ھ) میں ان کے والد کا نام نہ تو لاچین لکھتا ہے اور نہ سیف شمسی بلکہ محمود بتاتا ہے اور اس محمود کو ہزارہ لاچین نام کے قبیلے کا سردار بھی بتاتا ہے...... امیر خسرو سے متعلق جہاں بہت سے افسانے گڑھے گئے ایک افسانہ یہ بھی وضع کیا کہ وہ پٹیالی میں پیدا ہوئے تھے...... سب سے پہلے اس افسانے کو جہاں تک میں دریافت کرسکا ہوں حامد فضل اللہ جمالی نے 'سیر العارفین' میں تصنیف کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تولد اورا در قصبۂ مومن آباد است کہ اورا قصبہ پٹیالی گویند بکنار گنگ واقع است...... دوسرا واقعہ جو 'سیر الاولیاء' سے نقل کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جب شیخ نظام الدین اولیاء معز الدین کیقباد کے زمانے میں شہر دہلی کی روز بروز گرتی ہوئی اخلاقی حالت سے عاجز آکر یہ محسوس کرنے لگے کہ اب اس شہر میں ایمان کو محفوظ رکھنا ممکن نہیں تو انھوں نے غیاث پور میں سکونت اختیار کرنے سے پہلے اس خیال کا اظہار کیا، کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ پٹیالی چلا جاؤں جہاں

ان دنوں ترک (امیر خسرو) رہ رہا ہے۔ چنانچہ ان دونوں الگ الگ واقعے کو جوڑ کر لوگوں نے یہ بات وضع کر لی کہ خسرو کے والد پٹیالی میں سکونت پذیر تھے اور وہیں خسرو کی پیدائش ہوئی......جن تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ ان کے والد دہلی میں سکونت پذیر ہوئے یا یہ کہ خسرو دہلی میں پیدا ہوئے ان کو یکسر نظر انداز کیا گیا......خسرو کے وطن اصلی کے تعین سے متعلق تو ڈاکٹر وحید مرزا نے دولت شاہ سمرقندی کے بیان کی اس قدر پرزور وکالت کی ہے کہ اگر وہ غریب خود وکالت کرتا تو اتنے دلائل و براہین مہیا نہ کر پاتا جتنے کہ ڈاکٹر صاحب نے مہیا کیے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر خسرو کے والد کے وطن اصلی سے متعلق دولت شاہ کا بیان صحیح ہے تو پھر ان کے نقل وطن سے متعلق اس کا بیان کیوں غلط ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے' (پدر امیر خسرو) بدیار ہند افتادہ بہ دہلی مقام گرفتہ، ڈاکٹر وحید مرزا اس دولت شاہ سمرقندی کا ساتھ اس مقام پر کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔''[۷]

یہ طویل اقتباس ایک محقق کی بہت سی خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ اس اقتباس میں مصنف کے مطالعے کی وسعت، تجزیاتی طریقۂ کار نتائج کی قطعیت اور تنقیدی اسلوب میں تخلیقیت کی شان واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں تنقید کی خشک اور بے رنگ فضا میں ان کے طنز و مزاح کی دھوپ چھاؤں قاری کے لیے لطف و انبساط کا سامان بھی مہیا کر دیتا ہے۔ مثلاً خسرو کے والد کے نام کے سلسلہ میں مورخین کی غلط فہمیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''تحقیق کی دنیا میں ایسا کوئی سانحہ شاذ و نادر ہی گزرا ہوگا جب کسی محقق نے کسی شخص کے صحیح الدماغ بیٹے کے بیان کو جھٹلایا ہو۔'' مصنف کے بیان میں اس وقت اور بھی قطعیت پیدا ہو جاتی ہے جب وہ خسرو کی زبان سے اپنے موقف کی حمایت میں یہ کہلواتے ہیں کہ......''خسرو لاچین بندۂ کمترین اپنے شاہانہ نام سے نادم ہانک پکار کر کہتا ہے کہ اس بندہ کمترین کے والد کا نام لاچین ہے۔''

ممتاز حسین امیر خسرو کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی بڑی قطعیت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ''خسرو سے متعلق جہاں بہت سے افسانے گڑھے گئے، ایک افسانہ یہ بھی وضع کیا گیا کہ وہ پٹیالی میں پیدا ہوئے تھے۔'' ممتاز حسین خسرو کے والد کے وطن کے تعین سے متعلق ڈاکٹر وحید مرزا کی دلیلوں کو مسترد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وحید مرزا نے دولت شاہ سمرقندی کے بیان کی اس قدر پرزور وکالت کی ہے کہ اگر وہ غریب خود اپنی وکالت کرتا تو اتنے دلائل وبراہین مہیا نہ کر پاتا جتنے کہ ڈاکٹر صاحب نے مہیا کیے ہیں۔'' آئندہ سطور میں مصنف کے اس استدلال نے قارئین کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے کہ ''اگر خسرو کے والد کے وطن سے متعلق دولت شاہ کا بیان صحیح ہے تو پھر ان کے نقل وطن سے متعلق ان کا بیان کیوں غلط ہے۔''

ممتاز حسین نے عمر بھر زندگی کی سچائیوں سے واسطہ رکھا اور ادب کو زندگی کا سچا ہمدرد سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ ادب کا صداقت سے گہرا اور ناگزیر رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب زندگی کے ارتقاء میں ہمیشہ معین ومددگار ثابت ہوا ہے۔ ان کے مطابق 'خیال' مادی تصورات کی ارتقائی صورت کی طرف حرکت کرتا ہے اور زندگی کی سچائیوں تک مادے کے ارتقاء کے ساتھ ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ صداقت تک پہنچنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ ہم صداقت کو مادی تجربات پر پرکھتے جائیں۔ ان کا خیال ہے کہ صداقت مقصود بالذات تو ہے ہی یہ ایک طریقہ کار بھی ہے۔ سطور بالا میں جن مادی تجربات اور صداقت تک پہنچنے کے جن راستوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ علم، عقل، الوہیت اور علویت کے ذریعے ممکن ہے لیکن سماج میں کچھ ایسی ذہنیتیں بھی ہوتی ہیں جو ایک اسکیم یا سازش کے تحت منصوبہ بند طریقے سے انسانوں کو علم اور عقل سے دور رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ ذہنیتیں آدمی کو مادی ارتقاء سے دور رکھ کر ان کی جہالت اور بے خبری کا استحصال کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے ''کلچر اور فرقہ پرستی'' میں تمدنی استحصال کے پیچیدہ عمل پر روشنی ڈال کر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کلچر کے محرکات انسانی فطرت کی تعمیر میں کس طرح حصہ لیتے ہیں۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ:

> ''کلچر کے محرکات، انسانی فطرت کی تعمیر میں حصہ لیتے رہے ہیں لیکن
> جب بھی زردار طبقوں کی رجعت پسند طاقت نے ان قوتوں کو اپنے

ذاتی مفاد میں ڈھال لیا ہے تو کلچر نے بھی ہتھیار ڈال دیے ہیں، پھر ایک زوال پسند اور رجعت پسند نظام کے لیے ایک رجعت پرست فطرت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔یہی وہ سبب ہے کہ رجعت پرست طبقے علم وعقل کی مخالفت کرتے ہیں اور انسانی فطرت میں قدیم تعصّبات کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔فسطائیت، سرمایہ داری کا ایک خارجی مظہر تھا لیکن فسطائیت کو یہ معلوم تھا کہ فسطائی نظام کے لیے فسطائی درندوں کی بھی ضرورت ہے چنانچہ اسی ضرورت کے ماتحت ہٹلر نے تعلیم اور انسانی ضمیر کی مخالفت کی ہے۔اس کے (ہٹلر کے) الفاظ یہ ہیں:

''ضمیر انسان کا صرف وہم ہے، تعلیم اور ضمیر انسانوں کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ مجھے یہ برتری حاصل ہے کہ میں اس قسم کے وہم سے بالکل آزاد ہوں۔'' ۱۸

مذکورہ بالا اقتباس میں ممتاز حسین نے ہٹلر کی مثال پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ فسطائیت سرمایہ داری کے خارجی مظہر کے طور پر ہی سامنے آئی تھی۔ممتاز حسین کے نزدیک انسانیت اور انسانی ارتقاء کے لیے ظلم وجور سے پاک آزاد فضا ضروری ہے، یہ اور بات ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسی آزاد فضا بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ بلاشبہ خلفاء راشدین کا زمانہ انسانی ضمیر اور انسانی معاشرے کی حقیقی آزادی کا زمانہ ہے لیکن یہ آزادی بنی امیہ اور بنی عباس کے دور حکومت میں مسلسل روبہ زوال نظر آتی ہے۔مصر میں غلامی کی ایک طویل روایت رہی ہے۔مغربی استعاریت،فسطائیت اور نازی ازم کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ طاقتور قوموں نے طرح طرح کے بہروپ بھر کر انسانیت اور انسانی ارتقاء کی مختلف صورتوں کو بہر طور اپنے حق میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ظلم و جبر کو تسلیم کر لینا ہی ان کا مقدر ہے لیکن انسانی ضمیر نے ہر دور میں اس رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اور اس سے نجات پانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔اسلام نے بنی نوع انسان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے جو سماجی اصول بنائے ہیں اس میں ایمان، اخلاق، اخلاص اور اخوت کو کلیدی حیثیت دی

تھی مگر اقتدار پسندوں نے شاہی کی روایت سے انکار کے باوجود بنی امیہ اور بنی عباس کی خلافتوں میں ایک نئے انداز کی شاہی پیدا کر دی جو اسلامی جمہوریت سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔ انجام کار پھر سے عالمی سطح پر ظلم و جور اور دباؤ کی فضا پیدا ہو گئی جس کے اثرات محمرہ، کربلا، ہیروشیما اور ویتنام ہوتے ہوئے افغانستان اور عراق تک پہنچتے ہیں۔ تاریخ کے ان اوراق پر فسطائیت اور سرمایہ داری کے خارجی مظاہر پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ممتاز حسین کی تنقید تاریخی پس منظر اور تہذیبی اور تمدنی مطالعے کی طرف رجوع کرتی ہے اور انسانی جذبات اور نفسیاتی پر تہذیبی اور تمدنی عوامل کی کارفرمائی کو خصوصی اہمیت کا حامل قرار دیتی ہے۔ ممتاز حسین کے خیال میں زندگی اور اخلاقیات سے متعلق افلاطون کے مثالی نظریے کو اسلامی مقننین اور اس وقت کے نظریہ سازوں نے اس لیے اپنایا کہ ان سے ایک ایسی اجتماعیت کا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا جس سے اس وقت کے امرا و سلاطین کی عسکری ضرورتیں پوری ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ بالفاظ دیگر اقتدار کی حفاظت اور حصول اقتدار کی ہوس یہاں بھی بنیادی محرک کی حیثیت اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''افلاطون کا فلسفہ پہلے ایرانی ادب میں ہارون (رشید) اور مامون رشید کے زمانے میں آیا جب صوفیائے کرام نے اسے اپنانے کی کوشش کی لیکن محبت کا دھارا ایک نہ رکنے والی طاقت تھی جس کی زد سے عزلت نشین صوفی بھی نہ بچ سکے...... یہی وجہ ہے کہ ایرانی صوفی شعراء کے اشعار کو حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کے لباس پہنائے جا سکتے ہیں...... ہلاکو خاں کے حملے کے بعد اس کے جاگیردارانہ نظام میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی...... عورت حرم کی دیوی بنی رہی اور ترکی مغ بچے مئے نوشی کی سبیل چلاتے رہے۔ عوام کی حیثیت بالکل غلام کی سی تھی۔ جن کے جذبات کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی...... لیکن ایک ایسی محبت جس سے خیالی محبت کی پرستش کی جائے اور محبوب کے وصل کا تصور طلسماتی جھروکوں سے ہی ممکن ہو سکے امیر طبقے کی امتیازی شان تھی۔''[19]

یہ درست ہے کہ کلاسیکی غزل ہمیں عشق کی اس تصوراتی دنیا میں لے جاتی ہے، جس کا خمیر بنیادی طور پر افلاطونی افکار ونظریات کی مدد سے تیار ہوا تھا لیکن بعد میں یہ اسلام کی اخلاقیات کی پابند ہوگئی تھی اور عرصۂ دراز تک اشرافیہ طرز زندگی کے رکھ رکھاؤ اور طبقاتی دستور حیات کی نمائندگی کرتی رہی۔ اردو کی عشقیہ شاعری کا بڑا حصہ ایک زمانے تک اسی رجحان کا غماز رہا ہے۔

ممتاز حسین تعقل پسند ناقد تھے اور روایات میں تاریخ اور معاشرے کی جستجو ان کا خصوصی طریقۂ کار تھا۔ ان کی تعقل پسندی کی بنیاد زندگی کے ٹھوس تجربات پر رکھی گئی ہے، اس لیے احساس وادراک سے عاری نہیں معلوم ہوتی۔ وہ ہر زمانے کے انسان کو اہم سمجھتے ہیں اور اس انسان کی ضرورتوں، وسائل اور محرومیوں سے اس کی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً انیسویں صدی کے نصف آخر میں غالب کی شخصیت اپنے عہد کے جن مسائل، ضروریات اور جن محرومیوں سے نبرد آزما تھی اس کا تاریخی اور سماجی مطالعہ انہیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ غالب کے غم نے نہ صرف یہ کہ ان کی تخلیقی قوت کو ابھارا بلکہ اس کی انسانیت اور دل سوزی کو بھی جلا بخشی۔

ممتاز حسین کی کتاب ''غالب'' اسداللہ خاں غالب کا ایک نیا اور قابل غور مطالعہ پیش کرتی ہے کہیں کہیں مصنف کی جذباتیت قارئین کو تذبذب میں مبتلا ضرور کرتی ہے مگر مصنف نے غالب کی نفسیاتی کشمکش سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ بقول سید محمد عقیل ''انسان دوستی کے بہترین لمحات کی فکر کو اجاگر کرتی ہے۔''

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ غالب کو عمر بھر ایک مکمل انسان کی تلاش رہی۔ وہ آدمی اور انسان کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور شدت سے محسوس کرتے تھے اور بجا طور پر انہیں دنیا اور زمانے کے ہر فرد کا پیرہن کاغذی نظر آتا تھا لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ غالب کی صوفیانہ انسان دوستی کو اپنے دور اور خیالات کی طرف سے بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ غالب بھی اپنے دور کے جاگیردارانہ خمار سے یکسر آزاد نہیں تھے۔ اسی لیے انہیں ''وبائے عام میں مرنے سے انکار تھا'' ''نمبر اور ٹکٹ'' کی خواہش کے علاوہ دربار انگلشیہ میں ایک خاص مقام کی ''تلاش'' اور پوشاک اعزازی کی تمنا ایک زمانے تک رہی۔ غالب کی ان ساری خواہشات کے پیچھے بقول عقیل احمد جاگیرداری کے زمانے کا ایک معزز اور مفتخر انسان بولتا اور سوچتا نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ جزوی عدم توازن کے باوجود ممتاز حسین کی یہ کتاب ''غالب ایک مطالعہ'' غالب کی تعقل

پسندی اور انسان دوستی کا بے حد اہم رخ پیش کرتی ہے۔اس کتاب کا مطالعہ بقول عقیل احمد ''اس تاریخ کو بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے جس کے گھیرے میں کسی بھی دور کے انسان، ان کی تہذیب اور سوچ سب متحرک رہتے ہیں۔اس طرح انسانوں کا بیرون اور حقیقتیں سب زندگی کے مستقبل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔یہیں انسانی ارتقاء اور تنزّل سب کی تاریخ بھی بنتی بگڑتی رہتی ہے۔''

''حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ'' ممتاز حسین کی آخری مگر چشم کشا کتاب ہے۔اس مطالعے میں مصنف نے حالی کے نظریۂ شاعری سے متعلق ایسے سوالات اٹھائے ہیں اور ایسے چشم کشا حقائق پیش کیے ہیں کہ ان کی روشنی میں حالی کے نظریۂ شاعری پر از سر نو غور کرنا لازم ہو گیا ہے۔

ممتاز حسین نے مولانا حالی کی دیانت پر کوئی سوال کھڑا نہیں کیا ہے تاہم ان کے تسامحات کی بنیاد تک ضرور پہنچتے نظر آتے ہیں۔مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں ملٹن کے حوالے سے 'سادگی، اصلیت اور جوش' کو اچھی شاعری کی بنیادی خصوصیات قرار دیا ہے لیکن ممتاز حسین کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ حالی نے ملٹن کا جو قول پیش کیا ہے وہ دراصل کولرج کا ہے۔ملٹن نے جس 'سادگی' سے بحث کی ہے وہ طلباء کے نصاب میں شامل ہونے والی شعری تخلیقات سے متعلق ہے۔اسی ضمن میں 'اصلیت' اور 'جوش' کی اصطلاح بھی زیر بحث آتی ہے۔ملٹن کا منشاء یہ تھا کہ طلباء کو ایسی شاعری پڑھانی چاہیے جو انہیں آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ممتاز حسین پورے اعتماد سے لکھتے ہیں کہ ملٹن نے سادگی، اصلیت اور جوش کا ذکر اچھی شاعری کی بنیادی خصوصیات کے طور پر کہیں اور کبھی نہیں کیا ہے۔چنانچہ ممتاز حسین نے بڑی صاف گوئی سے لکھا ہے کہ:

> ''شاعری کی تعریف کے سلسلے میں ملٹن نے یہ تین الفاظ نصاب تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے ادا کئے تھے...... حالی نے اس پورے مسئلے کو نصاب تعلیم کے ضمن میں نہیں جانچا بلکہ ان تین الفاظ سادگی، اصلیت اور جوش کو اچھی شاعری کی کسوٹی قرار دیتے ہوئے پوری اردو شاعری کو پرکھنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ایسی باتیں بھی لکھیں جو ان کے اپنے بیانات کی تکذیب کرتی ہیں۔''[۲۰]

ممتاز حسین کے اس بیان سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ حالی انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مغربی ماٰخذ تک ان کی رسائی ترجمے وغیرہ کے ذریعے ہوئی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مقدمہ شعر وشاعری میں مولانا نے خود کو مصنف کے بجائے مولف لکھا ہے۔

بہرحال ''حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ'' میں مقدمہ شعر وشاعری سے متعلق ممتاز حسین کے انکشافات کے بعد اس عہد آفریں کتاب پر کئی اہم اور قابل غور سوالات قائم ہوئے ہیں اور اس کتاب کے زیر اثر وجود میں آنے والا تنقیدی سرمایہ مکمل طور پر بے وقعت ثابت ہو جاتا ہے۔ ممتاز حسین کی اس دریافت سے آگاہ ہونے کے بعد ہمیں حالی کے اس ادبی موقف سے بھی اتفاق کرنے میں تامل ہونا چاہیے کہ:

سلف لکھ گئے جو قیاس و گماں سے — صحیفے ہیں اترے ہوئے آسماں سے

بلاشبہ، یہ عہد آفریں تصنیف ہمیں ادبی مسائل کی تفہیم میں حالی اور ہم عصروں کے ذریعے اپنائے گئے مغربی پیمانے کو قبول کرنے سے متعلق احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دیتی ہے۔ اردو تنقید کے قارئین کو اس انکشاف کے لیے ممتاز حسین کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ممتاز حسین کی تنقید عقلیت ومعروضیت کے ساتھ تنقید وتحقیق کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ وہ ایک کامیاب مارکسی نقاد تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی خدمات کے ذریعے ادب، تنقید اور ترقی پسند تحریک تینوں کی بیک وقت معقول اور مناسب رہنمائی کی ہے۔ ان کی تنقیدی نگارشات میں عالمانہ بصیرت اور دانشورانہ حسیت دونوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ عام طور پر ان کی تحریریں صاف اور رواں دواں ہوتی ہیں۔ البتہ ان کی ابتدائی تحریروں میں مطالعے کی وسعت، فکر کی گہرائی اور فلسفیانہ موشگافی کی وجہ سے ایک بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے جو تادیر قائم نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ بوجھل پن ختم ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وضاحت اور روانی ان کے اسلوب کا نمایاں وصف بن جاتا ہے۔

حواشی:

(۱) ''خیال''، سہ ماہی، کراچی، مدیر: حبیب احسن، جلد۵، شمارہ ۱۷-اپریل تا جون ۲۰۰۶ء، ص: ۱۰۵
(۲) محولہ بالا، ص: ۱۰۶
(۳) محولہ بالا، ص: ۱۰۶
(۴) محولہ بالا، ص: ۱۰۸
(۵) محولہ بالا، ص: ۱۰۸
(۶) دبستانوں کا دبستان، کراچی، حصہ اول، احمد حسین صدیقی، محمد حسن اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، ص: ۴۷۳ (ہفت روزہ ''معیار'' کراچی، ۱۹۹۲ء کے سالنامہ میں سحر انصاری صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے)
(۷) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص: ۳۲۲
(۸) محولہ بالا، ص: ۳۲۲، ۳۲۱
(۹) نقد حیات، ممتاز حسین، الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۰ء، ص: ۵۳
(۱۰) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص: ۳۲۴
(۱۱) نئے تنقیدی گوشے، سید ممتاز حسین، آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دلی-۶، ۱۹۶۴ء، ص: ۴۰
(۱۲) ترقی پسند تنقید اور محمد حسن، شبنم ناز، شوبی آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، دہلی ۲۰۱۰ء
(۱۳) جدید اردو تنقید: اصول و نظریات، ڈاکٹر شارب ردولوی، اترپردیش اردو اکادمی، چھٹا ایڈیشن، ص: ۳۷۹
(۱۴) ادب اور شعور، ممتاز حسین، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۶۱ء، ص: ۳۹
(۱۵) محولہ بالا، ص: ۱۷۲
(۱۶) غالب: ایک مطالعہ، ممتاز حسین، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۹ء، ص: ۱۸
(۱۷) امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری، ممتاز حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص: ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶
(۱۸) نقد حیات، ممتاز حسین، ص: ۱۹
(۱۹) ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ، سید محمد عقیل، دریا آباد، الہ آباد، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۰۴
(۲۰) حالی کے شعری نظریات، ایک تنقیدی مطالعہ، ممتاز حسین، سعد پبلیکیشنز، فروری ۱۹۸۸ء، ص: ۵۷

بابِ دوم

ممتاز حسین کی کتابوں کا تعارف

ممتاز حسین نے تدریسی اور انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں بھی اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ صرف کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے کئی درس گاہوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ کچھ دنوں تک ان کا تعلق بمبئی کے انجمن اسلام سے بھی رہا۔ یہاں انھوں نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ کچھ دنوں تک ان کا تعلق صحافت سے بھی رہا۔ اشتراکیت کی طرف ذہنی میلان کی وجہ سے وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بمبئی کی شاخ کے سکریٹری ہوئے اور کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار ''نیا زمانہ'' سے وابسطہ ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور چلے گئے۔ وہاں بھی صحافت سے ان کا تعلق قائم رہا۔ کئی اخبار و رسائل سے وابستگی رہی۔ انھوں نے ایک رسالہ ''روحِ ادب'' نکالا۔ بعد میں مشہور روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر بھی ہو گئے۔ بعد ازاں لاہور سے کراچی چلے آئے اور تدریس کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔ تعلیم کے سلسلہ میں وہ سندھ مسلم کالج، اردو کالج کراچی اور پھر اسلامیہ کالج سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد سراج الدولہ کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹۷۶ء میں اس عہدے سے سبک دوش ہوئے۔[۱]

دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ ممتاز حسین تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہے۔ تحقیق و تنقید کے مختلف موضوعات پر ان کی ایک درجن سے زاید کتب منظر عام پر آئیں جن کا ذکر سطورِ ذیل میں کیا جائے گا:

۱۔	نقد حیات	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس	الہ آباد	۱۹۵۰ء
۲۔	نئی قدریں	استقلال پریس	لاہور	۱۹۵۳ء
۳۔	ادبی مسائل	مکتبہ اردو، لاہور	لاہور	۱۹۵۵ء
۴۔	انتخاب غالب مع مقدمہ	اردو اکیڈمی سندھ	کراچی	۱۹۵۷ء

۵۔	باغ وبہار (میرامن) مع مقدمہ وفرہنگ	اردوٹرسٹ	کراچی	۱۹۵۸ء
۶۔	ادب اور شعور	اردو اکیڈمی، سندھ	کراچی	۱۹۶۱ء
۷۔	نئے تنقیدی گوشے	آزاد کتاب گھر، کلاں محل	دہلی	۱۹۶۴ء
۸۔	غالب ایک مطالعہ	انجمن ترقی اردو	کراچی	۱۹۶۹ء
۹۔	امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	دہلی	۱۹۸۲ء
۱۰۔	نقد حرف	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	دہلی	۱۹۸۵ء
۱۱۔	حالی کے شعری نظریات (ایک تنقیدی مطالعہ)	سعد پبلیکیشنز	کراچی	۱۹۸۸ء
۱۲۔	یگانہ شخص اور شاعری	اعجاز پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۱۹۸۸ء
۱۳۔	مارکسی جمالیات (نظام لکچرز)	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی	دہلی	۱۹۸۹ء

نقد حیات:

یہ ممتاز حسین کی پہلی کتاب ہے جو تنقید سے متعلق ہے۔ الٰہ آباد پبلشنگ ہاؤس سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں تنقید کے مختلف موضوعات سے متعلق گیارہ ابواب ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ''کلچر اور فرقہ پرستی''، ''غزل کی ہیئت''، ''تنقید کا مارکسی نظریہ''، ''بدلتی ہوئی نفسیات''، ''انفعالی رومانیت''، ''کچھ فسانہ کچھ حقیقت''، ''کیا اقبال آفاقی شاعر ہیں''، ''اردو شاعری کا مزاج اور غالب کی شکست کا تجزیہ''، ''نئے ادب کے معمار اور سیاہ حاشیے''۔

کلچر اور فرقہ پرستی کے عنوان کے تحت ممتاز حسین نے کلچر کی تعریف کرتے ہوئے مختلف زمانے میں اس کی اہمیت سے متعلق بحث کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کلچر کے محرکات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ کلچر کے محرکات انسانی فطرت کی تعمیر میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ لیکن کلچر نے جب ہتھیار ڈال دیے تو یہ فسطائیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا آلہ کار بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہٹلر نے تعلیم اور انسانی ضمیر کی مخالفت کی۔

''غزل کی ہیئت'' والے باب میں غزل کی صنف سے متعلق مختلف تعریفوں کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز

حسین نے اس صنف سے متعلق مروجہ غلط فہمیوں کا جائزہ لیا ہے۔اس کے بعد غالبؔ، حافظؔ، سعدیؔ، عرفیؔ، نظیری اور میرؔ کی غزلوں کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کی غزلوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کا ایک مرکزی موڈ اور تصور ہے اور یہ تصور پانی کی ننھی منی بوندوں سے بہت سی لہروں میں تبدیل ہوجانے کی مانند ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزل کا ہر ایک شعر اہم ہوجاتا ہے۔[۲]

''تنقید کا مارکسی نظریہ'' والے باب میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کا ہر ادیب اور شاعر کائنات اور حیات سے متعلق ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے۔یہی نظریہ زندگی کے تجربات کی تفہیم میں مدد پہنچاتا ہے۔انھوں نے عینیت پسند مکتب فکر کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ یہ خیال کو زندگی سے مقدم سمجھتا ہے۔اس کے برخلاف مارکسی فلسفہ مادے کو خیال سے مقدم تصور کرتا ہے اور اسے متحرک اور تغیر پسند بتاتا ہے۔انسانی زندگی اسی متحرک اور تغیر پسند مادے کی انقلابی صورت ہے۔مارکسی تنقید کا نظریہ انتہا پسندی سے بچنے میں مدد کرتا ہے۔یہ خالص خارجیت جو واقعہ نگاری کی طرف لے جاتی ہے اور خالص داخلیت جو اپنی عصبیتوں اور ذہنیت کا پہاڑ کھڑا کردیتی ہے، دونوں پہلوؤں کے موزوں اور متوازن نکات کو بروئے کار لاتا ہے۔[۳]

''بدلتی ہوئی نفسیات'' والا باب عورتوں سے متعلق ہے جس میں عورتوں سے متعلق متضاد اقوال اور آراء مثلاً عورت مکروفریب کی دیوی ہے، 'حیلہ گر اور عشوہ ساز ہے'، 'عورت کی تخلیق قوس وقزاح کی رنگینیوں سے ہوتی ہے، لیکن وہ ایک ناگن کی مانند ہے'، 'عورت تیرا نام کمزوری ہے'، 'عورت ایک معمہ ہے، اسرار فطرت کی نہ سلجھنے والی گتھی ہے، اس کی محبت شراب ہے اور اس کا لمس حیات ہے'، وغیرہ وغیرہ۔ممتاز حسین نے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے یہ تلقین کی ہے کہ ہم ایسے نظام کی طرف قدم اٹھائیں جس میں انسانی محبت کی قدر کی جائے۔عورت اور مرد کے درمیان صحیح محبت کا نظریہ اس وقت تک پائدار نہیں ہوسکتا جب تک اسے اقتصادی اور سماجی حیثیت سے مردوں کے مساوی نہ کھڑا کردیا جائے۔ آزاد محبت کا نظریہ ایک غیر طبقاتی نظام ہی میں قائم ہوسکتا ہے۔انھوں نے اس بات کی وکالت کی ہے کہ جس طرح مرد توسیع نسل کے علاوہ سوسائٹی کے دوسرے کام کرتا ہے اسی طرح عورت بھی مرد کے شانہ بشانہ چل کر سوسائٹی کے مفید کام انجام دے سکتی ہے۔[۴]

''انفعالی رومانیت'' والے باب میں ممتاز حسین نے ادب میں مجہول رومانیت کے مضر اثرات سے متنبہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اعصابی حقیقت نگاری نہ صرف ہمیں حقیقت سے دور رکھتی ہے بلکہ شراب اور تخریب محض کی راہیں بھی دکھلاتی ہے۔ ان کے بقول لکھنے والوں کا ایک اچھا خاصا گروہ آج صرف اپنے اعصاب ہی کو حقیقت کا معیار بنائے ہوئے ہے۔۵

''کچھ فسانہ کچھ حقیقت'' میں ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ افسانے کی تکنیک نئے مواد سے ہم آہنگ ہوکر ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ کلاسیکی انداز میں افسانے کی تعریف اور اس کے قواعد اور ضوابط کے تعین سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نثر و نظم کی تعریف سے زیادہ اہم کہانی کا موضوع ہے جو صحیح معنوں میں فن کار کی تحقیق ہے۔۶

''کیا اقبال آفاقی شاعر ہیں'' والے باب میں ممتاز حسین نے اقبال کے افکار سے بحث کرتے ہوئے ان کے افکار کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اول جسے فلسفۂ اسلام یا فلسفۂ ملت کہتے ہیں، دوسرا انسانی نفسیات اور اس کے عملی امکانات سے متعلق ہے۔ مختلف دلائل کے سہارے وہ اقبال کی شاعری اور فلسفے کو مسلمانوں کے حق میں بہتر نہیں سمجھتے۔۷

مضمون ''اردو شاعری کا مزاج اور غالب کی شکست کا تجزیہ'' میں ممتاز حسین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس طرح کسی بھی شخص کا مزاج اس کے انفرادی افتاد طبع کی غمازی کرتا ہے اسی طرح کسی بھی زبان یا قوم کی شاعری مخصوص عناصر کی شیرازہ بندی کے باعث ایک مزاج حاصل کر لیتی ہے جسے روایات بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن روایات اور مزاج میں فرق ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غالب کا مزاج انحطاطی شعراء کے کلام سے زیادہ مانوس تھا۔ انھوں نے ظہوری اور بیدل کی پیروی کی اور ان ہی کی طرح الفاظ کی بازی گری میں الجھے رہے۔ غالب کی شاعری میں غم، اضمحلال اور افسردگی کی دبی ہوئی چنگاریاں ملتی ہیں۔ یہ جذبہ بھرپور خوشی نہ حاصل کر سکنے کے ردِ عمل سے پیدا ہوتا ہے۔۸

''نئے ادب کے معمار'' کے تحت ممتاز حسین نے اسرار الحق مجاز، دیوندر ستیارتھی، سعادت حسین منٹو، ساحر لدھیانوی اور مخدوم محی الدین کے کلام اور کہانیوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مجاز کا انداز نظر رومانوی ہے۔ اس کی رومانیت میں دکھی انسانیت کا درد بھی موجود ہے۔ دیوندر ستیارتھی سے متعلق ان کی

رائے ہے کہ اس نے گیتوں کی فضا کو کہانی میں ڈھالا ہے۔منٹو سے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی جدت اور تفنن طبع سے اپنی کہانیوں کو مزیدار اور دل چسپ بھی بنا سکتا ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو اس کی کہانی کا مواد اور ڈھانچہ ہمیشہ یکساں ہی رہتا ہے۔ساحرلدھیانوی کی شاعری سے متعلق ان کا خیال ہے کہ ساحر کی ابتدائی نظموں میں ایک عام متوسط طبقے کی شاعری کی طرح گریز،شکست اور یاسیت کے عناصر موجود ہیں لیکن ان تمام نغموں کے پیچھے ایک متحرک جذبہ بغاوت بھی کارفرما ہے۔مخدوم محی الدین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی شاعری میں انقلاب کی سلگتی ہوئی چنگاری اور اپنی پرانی فطرت سے قطع نظر اس نے کوئی ایسا موضوع ہی نہیں چھوا ہے جہاں آتش باری، زلزلہ افگنی اور کائنات کو لرزہ میں لانے والا لہجہ پیدا ہوسکتا ہے۔۹

آخری باب ''سیاہ حاشیے'' میں منٹو کے افسانوی مجموعہ ''سیاہ حاشیے'' جو مکتبہ جدید سے شائع ہوا تھا' کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ افسانوں کی کتاب نہیں بلکہ لطیفوں، چٹکلوں اور پہیلیوں کی کتاب ہے۔ یہ لطیفے اور چٹکلے فساد کے واقعات سے مرتب کیے گیے ہیں۔منٹو پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ مزید کہتے ہیں کہ اس کا ادبی نظریہ اس کی انفرادیت پرستی اور سنسنی خیز افتادطبع کے تابع ہے......اسے گرے پڑے انسانوں کے کردار سے ہمدردی تھی،اسے انسانوں کے کمینہ پن سے نفرت تھی۔اسے سماج کے تمام گھنونے مظاہر سے نفرت تھی۔۱۰

نئی قدریں:

''نئی قدریں'' ممتاز حسین کی دوسری اہم کتاب ہے جو استقلال پریس کراچی سے ۱۹۵۳ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ دراصل ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں ''آرٹ اور حقیقت''،''نیا ادبی فن''،''غالب کا نظریہ شعر''،''اردو زبان میں عوامی ادب کا مسئلہ''،''پشکن کی شاعری''،''تغزل اور انقلابی شاعری''، ''تحلیل نفسی''،''حقیقت نگاریاں''،''چند ادبی اصطلاحیں''،''نئی غزل— کا موجد حالی''،''سرسید کا تاریخی کارنامہ''،''علامہ اقبال اور تصوف''،''اردو ادب میں انیس کی جگہ''،''وجدان''،''ناول اور افسانہ''،''غزل یا شاعری'' کے عنوانات کے تحت سولہ مضامین شامل ہیں۔تقریباً سارے مضامین بہت اہمیت کے حامل ہیں لیکن انھوں نے خود ''وجدان'' اور ''میر انیس کی اردو ادب میں جگہ'' کو زیادہ اہمیت کا حامل سمجھا ہے۔ وجدان

کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایک سنجیدہ مضمون ہے اور اگر تنقید بالکل عملی ہی ٹھہری تو یہ مضمون اس تنقید کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ [۱۱] آئندہ سطور میں اس کتاب کے مضامین کا الگ الگ مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مضمون ''آرٹ اور حقیقت'' میں انھوں نے کہا ہے کہ آرٹ کا تعلق محسوسات کی دنیا اور فکری دنیا کے ساتھ ایک اٹوٹ وحدت قائم رکھتا ہے۔ آرٹ کی خوبیاں اور حقیقت نگاری کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے ماحصل کے طور پر کہتے ہیں کہ آرٹ ان معنوں میں حسّیاتی اور ذہنی دنیا کے درمیان ایک پل ہے اور ادب ان ہی معنوں میں حقیقت کے بارے میں انسان کی آگہی کی ترسیل کرتا ہے۔ [۱۲]

''نیا ادبی فن'' کے عنوان کے تحت انھوں نے ہلنسکی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ ادب اور سائنس اپنے مختلف النوع مواد کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ سائنس جن چیزوں کو منطق اور استدلال سے ثابت کرتی ہے ادب ان ہی چیزوں کو ذہنی تصویروں کے ذریعہ دکھاتا ہے۔ ممتاز حسین نے کہا ہے کہ یہاں پر ہلنسکی کا سائنس سے مراد سماجی علوم ہے کیوں کہ سماجی علوم میں طبقاتی نقطہ نگاہ کا جھلکنا لازمی ہے، وہ ادب کو ایک طبقاتی مظہر قرار دیتے ہیں۔ [۱۳]

مضمون ''غالب کا نظریہ شعر'' میں انھوں نے بتایا ہے کہ غالب نے ایک بڑے انقلابی دور میں جنم لیا۔ اس عہد میں بدیسی سامراج نے پوری معاشرت میں تبدیلی پیدا کی جس کے نتیجے میں پیدا شدہ کش مکش کو غالب نے خود محسوس کیا۔ لہٰذا ان کے اشعار میں خواہ عشق کا موضوع ہو یا نشاط کا یا دوسرے موضوعات، اس میں غم کا اظہار ضرور ملتا ہے۔ اس کے ماحول نے اسے غم کا شاعر بنا دیا۔ [۱۴]

''اردو زبان میں عوامی ادب کا مسئلہ'' میں ممتاز حسین بیسویں صدی کے ادب پر بات کرتے ہوئے عوامی ادب کی تخلیق کے رموز و نکات سے بحث کرتے ہیں۔ عوامی ادب کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کی بنیاد یہ ہے کہ ادب کی جڑیں عوام کی زندگی میں پیوست ہوتی ہیں۔ ادب کی تخلیق میں محنت کش انسانوں کا حصہ ہوتا ہے۔ ادب اپنے اصلی روپ میں حقیقت کی بنیاد تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ زندگی کے پورے مرقعے کو پیش کرتا ہے۔ اردو ادب کی ترقی میں حالی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ حالی کا نام بزرگوں میں بہت بڑا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند ادب کی بنیاد ڈالی۔ اردو زبان کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اردو زبان کی بول چال کا فارم عوامی ہے اور اس بول چال کے فارم پر اردو زبان میں جمہوری مواد

کے ساتھ جوادب تخلیق کیا گیا وہ سب عوامی ہے۔ ۱۵؎

''پشکن کی شاعری'' میں ممتاز حسین نہ صرف روس میں بلکہ عالمی سطح پر پشکن کی شاعرانہ عظمت اور مقام کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ مضمون کے آغاز میں ہی انھوں نے میکسم گورکی کا قول نقل کیا ہے کہ ''وہ دنیا کا سب سے بڑا فن کار ہے''۔ اس کی عظمت کی وجہ شاید یہ بھی ہوسکتی ہے کہ خود میکسم گورکی ان ادیبوں میں سے تھا جسے دنیا کے تمام عظیم ادب سے محبت تھی۔ پشکن کا ادب عوامی خیالات اور جذبات کے اظہار کا ایک آلہ کار تھا۔ اس کی نظمیں ''آزادی''، ''دیہات'' اور ''خنجر'' زارشاہی کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ ۱۶؎

مضمون ''تغزل اور انقلابی شاعری'' میں وہ بتاتے ہیں کہ تغزل کا جو مفہوم رائج ہے یعنی عاشق اور معشوق کی بات وہ تصور ان کے ذہن میں نہیں ہے۔ اس کے لیے انگریزی میں لیری سزم کا لفظ ہے اور اردو زبان میں اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ لیرک سے مراد وہ ایسی نظموں سے لیتے ہیں جس میں موضوع کے ساتھ بے حد جذباتی قربت ہو اور لہجے میں شخصی اظہار ہو اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کا اسلوب سادہ، بے ساختہ اور سنگیت مقبول عام ہو۔ اس تصور کے ساتھ انھوں نے صفی لکھنوی، مخدوم محی الدین، سردار جعفری اور نذرالاسلام کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ ۱۷؎

''تحلیل نفسی'' میں ممتاز حسین نے ''ماسز اور مین اسٹریم'' رسالے میں فرانس کے آٹھ معالج نفسیات کے شائع شدہ مضمون پر اظہار رائے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو چیز اس مقالے کو دوسرے مقالوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا طبقاتی تجزیہ ہے۔ مقالے کی اسی خوبی کو دیکھتے ہوئے وہ اردو کے قارئین کو اس حکمت سے روشناس کرانا چاہتے ہیں۔ اس مضمون کے بنیادی خیالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تحلیل نفسی بورژوا طبقے کا فلسفہ ہے۔ تحلیل نفسی کی بنیاد انفرادیت پسندی پر ہے ۱۸؎۔ مضمون ''حقیقت نگاریاں'' میں ممتاز حسین یہ سوال قائم کرتے ہوئے کہ سماجی حقیقت ہر دور کی تو ایک ہی ہوتی ہے پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اس کی تعبیریں مختلف ہو جاتی ہیں، وہ بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: حقیقت نگاری کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے ہر زمانے کی معاشی تنظیم، پیداوار کی تکنیکی ترقی اور مادی علوم کی سطح کو جانچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مضمون میں ان کا مقصد صرف اپنے دور کی حقیقت کو جانچنے کا ہی ہے۔ لہٰذا وہ مثالیں بھی ویسی ہی پیش کرتے ہیں جن کا

تعلق ان کے زمانے سے ہے لیکن بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے گہرائی سے نہیں بلکہ سرسری طور پر مختلف قسم کی حقیقت نگاریوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ۱۹

''چند ادبی اصطلاحیں'' میں ممتاز حسین اردو زبان میں مروجہ چند اصطلاحات کا ذکر کرتے ہیں جن کا استعمال مفہوم اور معنی کے طور پر صحیح طور پر نہیں کہا جاتا مثلاً 'حقیقت'، 'جدلیاتی رشتے'، 'انقلاب' اور 'ادب' وغیرہ۔ وہ ایک جملہ '' آپ بات تو ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ابھی حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچے'' نقل کرتے ہیں پھر یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص بات ٹھیک بھی کہے، غلط بیانی بھی کرے اور پھر بھی حقیقت تک نہیں پہنچ پائے۔ اس کے بعد تفصیلاً اس پر بات کرتے ہیں کہ حقیقت نگاری کس طرح کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح وہ یہ بتاتے ہیں کہ مختلف جگہوں پر لوگ جدلیات کے مفہوم کو غلط طور پر استعمال کرتے ہیں مثلاً بعض حضرات آگ اور پانی کے مخالف تصورات کو یا مخالف کیفیتوں کو جدلیاتی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے اصل مفہوم کو پیش کرنے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ کہیں بھی سماجی انقلاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک طریق پیداوار اور پیداواری رشتے نہ بدلیں اور سماجی رشتوں میں ایک کیفیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے.... انقلاب ایک لمحے کی چیز نہیں بلکہ ایک طریق کار بھی ہے۔ لفظ 'ادب' کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ نہایت بے ادبی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ادب ویسا ہی ایک سماجی فن ہے جیسا کوئی اور فن مثلاً آہن گری۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی زبان میں شاعر اور کاریگر کو ایک ہی لفظ سے یاد کیا جاتا تھا اس کے باوجود فنون بہ اعتبار کام کے جدا جدا ہیں۔ ۲۰

''نئی غزل کا موجد — حالؔی'' ان کا دل چسپ مضمون ہے۔ ممتاز حسین کہتے ہیں کہ غالب کے کلام کو ان کے دور کی بہ نسبت بعد کے دور میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ غالب کو مقبول عام بنانے میں الطاف حسین حالی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ حالی نے یہ خدمت اس وقت انجام دی جب کہ وہ مغرب سے اٹھتے ہوئے اس آفتاب کی طرف تک رہے تھے جس کی روشنی میں دلّی کا آخری سنبھالا بھی حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ حالی نے اس سنبھالے کو ہمیشہ فصل خزاں سے تعبیر کیا ہے۔ ممتاز حسین کا خیال ہے کہ حالی بہ حیثیت غزل گو زیادہ کام یاب ہیں بہ نسبت نظم نگار کے۔ جو کاوش انھوں نے غزل میں کی ہیں وہ نظموں میں نہیں ہیں۔ ممتاز حسین کا خیال ہے کہ غزل کو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی جو کوشش آج ہے اس کی ابتدا حالی سے ہوئی۔ حالی کا دماغ غزل کی

عطر افشانی اور نزہت سامانی سے معطر رہا لیکن اسے شاہد بازاری کے ہاتھوں فروخت کرنے، محفل میں تزئین گفتگو کے کام میں لانے کے بجائے انھوں نے اس سے اس شعور کو جگانے کا کام لینا چاہا جو انجمنی زندگی کا دیا ہوا تھا۔ قومی نظموں میں لوگوں نے حالی کو بہ حیثیت مجدد فن کے ضرور سراہا لیکن وہ سیاسی گھن گرج میں حالی کے تغزل کو نہ پہچان سکے۔۲۱

''سرسید کا تاریخی کارنامہ'' ممتاز حسین کا دلچسپ اور معلومات افزا مضمون ہے۔ اس میں ممتاز حسین ایک طرف سرسید کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہیں تو دوسری طرف ''بت شکنی'' والا انداز اپناتے ہوئے قومی معاملات میں سرسید کی کوتاہیوں کو گرفت میں بھی لاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سرسید سے قبل لوگ ہندو، مسلمان، کافر، مومن، مرتد، ملحد کچھ بھی تھے مسلمان ''محمڈن'' نہیں تھے۔ پھر آگے چل کر اس کی تشریح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ یہ سرسید ہی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے پہلے ہمیں محمڈن بنایا اور جب ایک قدم آگے بڑھے تو اینگلو محمڈن بنا دیا۔ ان کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو موڈرن بنایا، یا یوں کہیے کہ جدید خیالات سے روشناس کیا۔ اس کا ہمیں کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے۔ لیکن اس سے آگے کی ان کی کوشش جس میں وہ مسلمانوں کو انگریزوں کے تئیں زیادہ سے زیادہ وفاداری کا اظہار کرنے اور مغربی معاشرت کی تقلید کی بات کی، وہ قدم قوم کے حق میں ٹھیک ثابت نہیں ہوا۔ اسی کے بارے میں ممتاز حسین کہتے ہیں کہ ''جہاں انھوں نے اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر ہمیں اینگلو محمڈن بنا دیا ہم ان کے اس خطاب کو نہایت احترام کے ساتھ واپس کرتے ہیں۔''۲۲

مضمون ''علامہ اقبال اور تصوف'' اقبال کے خطبات ''اسلام کی تشکیل نو'' جس میں اقبال نے کہا ہے کہ وہ تصوف کے نفسیاتی تجربات کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ تصوف کے قرونِ وسطیٰ کی تکنیک کے خلاف ہیں، سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں ممتاز حسین علامہ اقبال کے فلسفیانہ خیالات پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علامہ اقبال چوں کہ فلسفی زیادہ تھے اور سیاست داں کم اس لیے ان کی فلسفیانہ تعمیم کہیں کہیں ملک کی سیاست سے برسرپیکار بھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری غلامی کا بنیادی سبب یہ نہ تھا کہ ہم فلسفے کی ایک پٹری کو چھوڑ کر دوسری پر چل پڑے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں جب کہ یورپ سائنس اور صنعت و حرفت کی مدد سے آلات پیداوار اور طریق پیداوار میں تبدیلی کر چکا تھا، ہم اپنی پرانی

ڈگر پر چل رہے تھے۔ ہماری زندگی میں جمود اور تعطل تھا۔ ممتاز حسین سرسید اور حالی کی فکر کو سراہتے ہیں، جنھوں نے مغرب کی صنعتی ترقی کو نظر انداز نہیں کیا۔ اقبال کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے مغرب کی صنعتی ترقی کو نظر میں تو رکھا ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے تضاد اور اس کی غارت گری کا صحیح تجزیہ کرنے سے قاصر رہے۔ [۲۳]

''اردو ادب میں انیسؔ کی جگہ'' انیس کی ۷۷ ویں برسی کے موقع پر لکھا گیا مضمون ہے۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ ادبی قدروں میں نکھار اور جدید ادب میں ان کی روایات کی ملاوٹ اسی وقت ممکن ہے جب لوگ صحیح طور سے ان کے ادب کو پرکھ سکیں۔ میر انیسؔ کی شاعری کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سانحہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کو ہمیشہ مذہبی متن میں دیکھا گیا۔ ان کے کلام کو محرم کی مجلسوں تک محدود کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ خوانوں کے علاوہ ساری دنیا انھیں بھلا چکی ہوتی اگر علامہ شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر انھیں از سرِ نو زندہ نہ کیا ہوتا۔ ممتاز حسین طنز کے انداز میں کہتے ہیں کہ انیس کو کئی دفعہ مارا گیا۔ اوّل تو لکھنؤ کی فضا نے مارا جس نے شعر کو وجہِ گریہ بنا لیا۔ دوسری دفعہ انھیں ان لوگوں کے خلوص اور حسنِ عقیدت نے مارا جنھوں نے انیس کی شاعری کو صرف شعر میں مقید کر دیا۔

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ممتاز حسین کا خیال ہے کہ میر انیسؔ اردو ادب کے فردوسی ہوتے اگر وہ واقعاتِ کربلا کو اس کے تاریخی مواد کے ساتھ ایک رزمیہ حکایت میں تبدیل کر سکتے۔ انھوں نے یہ کام نہیں کیا اس لیے ان کا وہ مقام نہیں ہے جو فردوسی یا ہومر کا ہے۔ [۲۴]

ممتاز حسین کے بقول ان کے دوستوں کی خواہش تھی کہ وجدان سے متعلق کوئی ایسا مضمون لکھا جائے جس میں فلسفے کی موشگافیوں سے بچتے ہوئے اس کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی حقیقت مجسم طریقے سے نظر آ جائے۔ چنانچہ مضمون ''وجدان'' اسی خیال کے تحت لکھا گیا۔ وجدان کے متعلق ممتاز حسین کا خیال ہے کہ یہ انسان کی وہ طاقت ہے جو ہر شخص کا مقدر نہیں ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے بڑی مشق و ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ دیومالائی کردار شیو کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر اسے یہ قوت تپسیا کے

ذریعہ حاصل ہوئی تو مشہور فلسفی افلاطون کو محبت کے اظہار کے راستے نصیب ہوئی۔ انسان کو یہ قوت کائنات کی ماہیئت پر غور کرنے اور اس غور وفکر میں مادی علوم میں اپنے حواس خمسہ اور عقل وفکر کو معطل کر کے کہکشاں کی وادیوں کو دھیان میں لانے یعنی خوب غور وفکر سے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ قوت خالصتاً گیان کی مدد سے پیدا ہوتی ہے اور جب یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے ساتھ بڑے گم نام، غیر معروف اور غیر متعارف جذبات اور احساسات کو لاتی ہے۔ وجدان اصل میں اس کیفیت کو کہتے ہیں جب انسان وجد میں آتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ جب انسان اپنے قابو اور ہوش وحواس میں نہیں رہتا ہے۔ اس سلسلے میں شاعری سے متعلق ممتاز حسین نے بہت دلچسپ بات کہی ہے کہ شاعری ہوش وخرد پر شب خون مارنے کا نام ہے نہ کہ اپنے آپ کو ہوش وخرد میں لانے کا۔ انھوں نے افلاطون کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ''جو شخص اپنے کو قابو میں رکھ سکے وہ شاعری کے دروازے پر ناحق سر ٹکراتا ہے۔۲۵؎

مضمون ''ناول اور افسانہ'' میں ممتاز حسین نے بحث اس بات سے شروع کی ہے کسی ناول یا افسانہ کو معیار پر اترنے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ تکنیک کے بندھے ٹکے اصول کے مطابق ہو۔ ان کا خیال ہے کہ بہت سے ناول اور افسانے ایسے ہوتے ہیں جو تکنیک اور معیار کے لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں مگر انھیں ادب میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اس لیے سب سے پہلے یہ طے ہونا چاہیے کہ ادب کیا ہے۔ کیوں کہ ناول ہو یا افسانہ وہ ادب ہی کی ایک صنف ہے۔ ناول کا سب سے بڑا فن یہ ہے کہ اس میں فن کار پوشیدہ رہے اور کہیں بھی نظر نہ آئے اور یہ کام فن کار اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ زندہ کردار تخلیق کرے۔ ناول میں قصہ ہمیشہ گھڑنا چاہیے کیوں کہ ناول کا محرک حقیقت کی تخلیق ہے نہ کہ کسی آدمی کی زندگی کا سچا واقعہ۔ ناول کے برعکس افسانے یا کہانی کا کینوس مختصر ہوتا ہے۔ اس میں ڈراما اتنے منطقی اور تفصیلی انداز میں نہیں ہوتا جیسا کہ ناول میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہانی کے اختتام میں لازماً اچانک پن، کچھ کایا پلٹ ضرور ہوتی ہے۔۲۶؎

''غزل یا شاعری'' اس مجموعے کا آخری مضمون ہے۔ مضمون کے آغاز میں ہی ممتاز حسین نے واضح کر دیا ہے کہ ابتداءً غزل بہ حیثیت صنف کے اپنا کوئی مقام نہیں رکھتی کیوں کہ عرب وعجم دونوں جگہوں پر قصیدہ میں ہی غزل کہنے کا رواج تھا۔ جب غزل قصیدہ سے پھوٹ کر نکلی تو اس وجہ سے منفرد ہوئی کہ اس صنف میں بادشاہ کی مدح کے بجائے معشوق سے گفتگو ہونے لگی۔ صوفیانہ رنگ اختیار کرنے سے قبل غزل

عشقیہ ہی رہی۔غزل کا بیش تر سرمایہ عشقیہ ہی ہے۔

''غزل یا شاعری'' میں اردو شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ممتاز حسین کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک عجیب معاملہ ہے کہ میں، ایک جگہ جہاں غزل پوری زندگی پر محیط نظر آتی ہے، اسے شاعری کے نام سے یاد کرتا ہوں اور جہاں وہ زندگی کی وسعتوں سے کنارہ کش ہوکر صرف محبت کی باتوں اور گھاتوں کے حدود میں آجاتی ہے، اسے غزل کہتا ہوں نہ کہ شاعری۔ممتاز حسین کو غزل کی اس زبان سے جس میں نہ کوئی رمز ہو اور نہ کنایہ، سیدھی سادی بات ہو، دل چسپی نہیں ہے۔ممتاز حسین کا خیال ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فارسی زبان میں بڑے پائے کی فلسفیانہ غزلیں کہی گئی ہیں وہ سخت دھوکے میں ہیں۔فارسی زبان میں فلسفیانہ شاعری مثنویوں میں کہی گئی ہے نہ کہ غزلوں میں۔وہ شاعری سعدیؔ، رومیؔ، عطارؔ، سنائیؔ اور جامیؔ کی مثنویوں میں ہے نہ کہ حافظ کی غزلوں میں۔حافظ کی غزلوں میں سماجی تنقید تو ہے لیکن فلسفیانہ شاعری نہیں ہے۔اگر ہے تو بہت خال خال۔۲۷

حالی نے جس وقت شاعری شروع کی ان کے سامنے ویسے غزل گو شعرا تھے جو فرضی عشق یا بازاری عشق کی باتیں کرتے تھے۔ان کا عشق خواہ جھوٹا ہو یا سچا فلسفۂ عشق سے منقطع ہو چکا تھا۔ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا کیوں کہ اب عشق بازی کوئی ثقافتی یا تہذیبی عمل نہیں رہ گیا تھا بلکہ ہوس پرستی میں تبدیل ہو گیا تھا۔اسی شاعرانہ ماحول میں آزادؔ، حالیؔ اور اسماعیلؔ میرٹھی نے نئی شاعری کی بنیاد ڈالی اور شاعری کو زندگی کے نئے رشتوں اور مغرب کے نئے خیالات سے ہم آہنگ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

ادبی مسائل:

ممتاز حسین کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ فروری ۱۹۵۵ء میں مکتبہ اردو لاہور سے منظر عام پر آیا۔ اس میں انھوں نے ''یہ انسان خود اپنی تخلیق ہے''، ''زبان اور شعر کا رشتہ''، ''تخیل کی دنیا اور حقیقت''، ''آرٹ میں حسن کا تعین''، ''جمالیاتی حظ اور افادیت''، ''ادب اور پراپا گنڈہ''، ''اسلوب''، ''تکنیک''، ''ترقی پسند ادب'' اور ''عوامی ادب'' جیسے عنوانات کے تحت مضامین لکھے ہیں۔اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں تنقیدی عمل کے دوران اچھائی اور برائی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھی گئی ہے۔

عام طور پر ادب اور تنقید میں جانب داری کو اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن ممتاز حسین اسے معیوب نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کے بقول سماجی علوم کے میدان میں جانب داری برتی جا سکتی ہے اور غیر جانب دار رہنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کتاب کی تخلیق کا محرک وہ مسئلہ تھا کہ ادب کے رومانوی تصورات سے ہٹ کر حقیقت نگاری کس طرح کی جا سکتی ہے اور اپنی تخلیقات میں انکشاف حقیقت کے ذریعہ کس طرح حسن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ میڈیم کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ مظہر کی انفرادیت اور عالم گیریت کو زیر بحث لاتے ہوئے انھوں نے بڑی دل چسپ بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ زندگی پر اسرار نہیں بلکہ قابل فہم ہے اور اس کی حرکت کے خارجی قوانین ہیں تو یقیناً ادب کا مظہر بھی قابل فہم ہے اور اس کے ارتقاء کا ایک مخصوص قانون ہے۔ دونوں اپنی جدلیات کے طریقے میں انفرادی حیثیت سے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس سے ان دونوں کی جدلیات کی عالم گیریت پر حرف نہیں آتا۔ کوئی بھی علم اس وقت معما بن جاتا ہے جب وہ مختلف مظاہر کے انفرادی طریق حرکت کو نظر انداز کر کے صرف ان کی وحدت پر زور دیتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ خیال یک طرفہ اور بے جان ہو جاتا ہے جو صرف کسی مظہر کی انفرادیت کو نگاہ میں رکھتا ہے اور مظاہر کی عالم گیریت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان غلطیوں سے حتی الامکان بچا جا سکے۔

اس کتاب کے پہلے باب ''یہ انسان خود اپنی تخلیق ہے'' میں ممتاز حسین نے انسان کی تخلیق کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا ہے۔ انسان کی ہستی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ انسان بذات خود ایک لامحدود کائنات ہے اس کی وسعتیں گذشتہ لاکھوں سال سے لے کر آئندہ کی لامحدود صدیوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے نمایاں کارناموں میں گذشتہ ہزاروں سال کی تہذیبیں، علم و ہنر، صنعت و کاریگری اور دور حاضر کی ایجادات ہی نہیں بلکہ اس کی اپنی تخلیق بھی ہے جو ان تمام تخلیقات میں سب سے زیادہ حسین اور لافانی ہے۔ ۲۸

انسانی زندگی میں گناہ و ثواب، سزا و جزا، آلام و مصائب کا تصور بہت پرانا ہے۔ ممتاز حسین کہتے ہیں کہ مغربی ادیبوں میں یہ تصور نشاۃ ثانیہ کے دور میں پروان چڑھا جب کہ مشرق میں اور بالخصوص اسلامی ممالک میں یہ تصور یونانی فلسفہ کے زیر اثر بہت پہلے آ چکا تھا۔ اس کی ابتدا حلاّج کے فلسفے سے

ہوئی اور اس کو تقویت ابن العربی کے فلسفے اور بو علی سینا کی طبیعیات سے ملی۔ دورِ حاضر میں انسانی تخیل اور تمناؤں کو بے پناہ ترقی حاصل ہوئی ہے۔ آج انسان کے بازوؤں نے ان زنجیروں کو توڑ ڈالا ہے جو انھیں جکڑے ہوئی تھیں۔ آج اس کی بینائی کو اتنی قوت حاصل ہے کہ وہ لاکھوں میل کی دوری پر واقع ستاروں کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔

''زبان اور شعر کا رشتہ'' والے باب میں ممتاز حسین سامراجی ممالک کے بہت سے ناقدین کی شاعری اور زبان کے مخصوص استعمال کے تصور کو گرفت میں لاتے ہوئے بحث کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے برعکس ترقی پسند مفکرین کا یہ خیال ہے کہ شعر شعور کے اظہار کا ایک طریقہ کار ہے لیکن اس کا اظہار شعور کے دوسرے مظاہر سے اپنی صورت میں مختلف ہے۔ اس کی ایک مخصوص صورت ہے اور اس مخصوص صورت کا تعلق زبان کے ایک مخصوص استعمال سے بھی ہوسکتا ہے۲۹۔ اس کے بعد وہ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہیں کہ آخر یہ بات بحث کا موضوع کیوں بنی کہ شاعری صرف زبان کے ایک مخصوص استعمال کا نام ہے۔ ممتاز حسین آگے کہتے ہیں کہ زبان ہو یا شعور یہ دونوں ہی سماجی زندگی کی پیداوار ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اوّل و آخر نہیں ہے کیوں کہ ایک کی پہچان دوسرے کے بغیر مشکل ہے۔ زبان اور شعور لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں اس ضرورت سے پیدا ہوئیں کہ دوسروں کے ساتھ تبادلہ خیال کیا جائے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم شاعری کو صرف زبان کے ایک مخصوص استعمال کا نام دیں اور اسے شعور کی ترجمانی سے آزاد سمجھیں کیوں کہ شاعری بھی شعور ہی کا ایک ذریعہ اظہار ہے۔

''تخیّل کی دنیا اور حقیقت'' والے باب میں ممتاز حسین کہتے ہیں کہ حسّیہ تصویروں کے ذریعہ سوچنے کا نام ہی شاعرانہ تخیل ہے۔ انھیں اس بات کا افسوس ہے کہ اردو فن نقد میں شاعرانہ تخیل کے صحیح مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ وہ حسّیہ تصویروں کے ذریعہ ابھرے نقوش کو جو ادراک اور جذبات کے ملے جلے سانچے کو بیدار کرتا ہے انگریزی زبان کے لفظ Imagination اور اردو زبان کے بالعموم قوت متخیلہ کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ یہ لفظ انگریزی زبان کے لفظ Image سے بنا ہے جس کے معنی ذہنی تصویر کے ہیں۔ یہ شاعرانہ تخیل جس کے بغیر نہ صرف شاعری بلکہ کسی بھی قسم کے آرٹ کو ذہن میں لایا نہیں جا سکتا۔ یہ اساطیری ادب کے دور سے شاعری میں کارفرما رہی ہے۔ ممتاز حسین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آرٹ

اور حقیقت کے رشتے کو متعین کرتے وقت ہمیں نہ صرف سماجی رشتوں کو ہی ذہن میں رکھنا چاہیے بلکہ اس رشتے کو بھی جو انسان اور فطرت کے درمیان ہوتا ہے جس کا اظہار اگر ایک طرف سماج کے بنیادی طریق پیداوار کی تکنیکی سطح سے ہوتا ہے تو دوسری طرف شعور کے مختلف مظاہر کی سطح سے جس کا اظہار حقیقت کو سمجھنے اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں ہوتا ہے۔[۳۰]

''آرٹ میں حسن کا تعین'' والے باب میں ممتاز حسین آرٹ کی تعریف، حسن کی تعریف اور اس کے تعین کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزی زبان میں آرٹ کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے زمرے میں موسیقی، بت تراشی، مصوری، شاعری اور ادبیات کی تمام صنفیں آتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا ذریعہ اظہار (تکنیک) اور قوت متخیلہ کا عمل الگ ہے۔لیکن اس سے اس بات پر فرق نہیں پڑتا کیوں کہ جمالیات کے قوانین سب میں مشترک ہیں۔ پھر اس کے بعد حسن کے بارے میں توہمات اور غلط فہمیوں کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس موضوع پر ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے بہت کم توجہ دی ہے۔ موضوع پر بالتفصیل بحث کرنے کے لیے وہ آرٹ اور نقد آرٹ کی پوری تاریخ پر روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جس کے لیے وقت، مطالعہ اور سہولت سب کچھ درکار ہے۔ انھوں نے اپنی بحث میں یہ بھی کہا ہے کہ آرٹ کے حسن اور فطرت کے حسن کو ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی بحث کو منضبط کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جمال ایک داخلی رشتے کے باوجود خارجی شے ہے۔ اس کی خارجیت اس بات میں مضمر ہے کہ جمالیاتی جذبے کے ذریعہ جس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی مطابقت خارجی حقیقت سے ہونی چاہیے۔[۳۱]

''جمالیاتی حظ اور افادیت'' والے باب میں ممتاز حسین کہتے ہیں کہ احساس جمالیات یا جمالیاتی حظ حاصل کرنے کی صلاحیت فطرت کا عطیہ نہیں بلکہ خالصتاً انسانی تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی تخلیق اسی طرح ہوئی جس طرح انسان نے اپنی قوت مدرکہ، قوت ارادی، عقل اور انسانی جذبات کو جنم دیا۔ آگے وہ سوال قائم کرتے ہیں کہ جمالیاتی حظ کیا ہے؟ جمالیاتی حظ کا تعلق کس چیز سے ہے؟ کسی بھی تخلیق کی افادیت یا اس کی صورت سے یا دونوں ہی سے؟ آگے وہ کہتے ہیں کہ جمالیاتی حظ کا تعلق صرف ذہنی تخلیق ہی سے نہیں بلکہ مادی تخلیق سے بھی ہے[۳۲]۔ اپنے دعوے کی صداقت میں وہ موٹر کار، شعر و نغمہ سے لے کر غذا کا حسن

اوراس کی غذائیت تک کی مثال پیش کرتے ہیں اوراس پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔ادبی تخلیق کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ ادبی تخلیق خواہ کتنی ہی سادہ اور آسان کیوں نہ ہواس کے جمال کا احساس اسے ہوتا ہے جسے ادبی تعلیم بھی ملی ہو۔شاعری کے جنم لینے کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ اس وقت تک جنم نہیں لے سکتی جب تک شعور رگ وپے میں سرایت نہ کر جائے۔ادب میں جمالیاتی حظ کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ اس وقت تک بیدار نہیں ہوسکتا جب تک صداقت کا ادراک کرنے کے بعد محسوس کیا جا سکے۔

''ادب اور پروپیگنڈا'' والے باب میں وہ بات یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ دنیا کا سارا ادب پروپیگنڈا ہے لیکن ہر پروپیگنڈا ادب نہیں۔اس خیال کی وضاحت کے لیے وہ اس پر لمبی گفتگو کرتے ہیں جس میں یہ نکتہ بھی زیر بحث آتا ہے کہ ادب کن معنوں میں پروپیگنڈا ہے اور کن معنوں میں وہ پروپیگنڈے سے آزاد ہے ۳۳۔ بعد ازاں وہ کہتے ہیں کہ لفظ پروپیگنڈا خواہ مخواہ معیوب ہو گیا کیوں کہ کچھ لوگوں نے پروپیگنڈے کو صرف تبلیغ واشاعت کے معنی میں تصور کیا ہے۔اگر ایسا ہے تو ادب بھی ایک قسم کا پروپیگنڈا ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ بھی تبلیغ واشاعت کا کام لیا جاتا رہا ہے اور ہنوز لیا جا رہا ہے خواہ وہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر۔دنیا کا ہر ادب کسی نہ کسی نظریہ حیات کی کسی نہ کسی قدر کی تبلیغ ہے۔اس بحث میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ادب اور پروپیگنڈے کا امتیاز صرف مواد کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ اس کی صورت یا فارم کی بنیاد پر بھی کرنا چاہیے۔ایک دستاویزی ناول اپنے تاریخی مواد میں بے داغ ہوسکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ناول کے فنی معیار پر بھی پورا اترے۔

''اسلوب'' سے متعلق بحث کے آغاز میں انھوں نے گیہوں کے دانے کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ گیہوں کے ایک بیج سے کئی بیج نکلتے ہیں اوراس سے لاکھوں بیج تیار ہوتے ہیں۔ان کو خوردبین کی مدد سے دیکھا جائے تو کوئی بھی ایک دانہ دوسرے دانے کی طرح بالکل یکساں نہیں ہوتا۔ان میں سے ہر ایک کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ نباتات کی دنیا والا یہ اصول حیوانات اور انسان کی زندگی پر بھی لاگو ہوتا ہے۔لیکن اس انفرادیت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی جنس میں دوسری اکائیوں کے ساتھ مشترکہ قدریں نہیں رکھتے نہ صرف اپنے جوہر میں بلکہ اپنی صورت میں بھی۔۳۴

ذہنی تخلیق ہمیشہ ہی سے انفرادی اسلوب کی حامل رہی ہے لیکن اس کی انفرادیت ایسی نہیں رہی ہے

کہ ہم ایک ہی عہد کے فن کاروں کی تخلیقات میں کوئی قدرِ مشترک دریافت نہ کرسکیں ۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب کی ایک ہم عصرانہ خصوصیت بھی ہوتی ہے اور وہ خصوصیت مواد اور اس کے اظہار دونوں پر حاوی ہوتی ہے ۔ انفرادی تنوع مختلف زبانوں کے ادیبوں کے درمیان بھی ہوسکتا ہے اور ایک ہی زبان میں لکھنے والوں کے درمیان بھی ۔ مثال کے طور پر مارؔلو اور شیکسپیئرؔ ہم عصر شعرا تھے لیکن دونوں کا اسلوب مختلف ہے ۔

''تکنیک'' سے متعلق ممتاز حسین کہتے ہیں کہ فنون لطیفہ ہوں یا شعر و ادب ان میں سے کوئی بھی نہ تو اضطراری تخلیق ہے اور نہ ہی جبلّی بلکہ ایک شعوری تخلیق جو کچھ قوانین کی پابند ہوتی ہے ۔ یہ قوانین حسن کی صورت و معنی کی باہمی کش مکش یا اندرونی تضاد کی بنا پر ارتقا پذیر ہوتے ہیں ۔ فنون لطیفہ یا ادب کی تخلیق کا دائرہ اس سے آگے نہیں ہے کہ ہم خارجی صداقت کو محسوس اور پر جذبہ بنا کر پیش کریں ۔ یہ تکنیک مادی تخلیقات کی تکنیک سے علاحدہ اپنا مقام رکھتی ہے ۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ مادی تخلیقات کی ٹیکنکل سطح اور سائنس کا اثر خواہ وہ بالواسطہ ہی کیوں نہ ہو ذہنی تخلیق کی تکنیک پر ضرور ہوتا ہے ۔ چاہے وہ مصوری کا معاملہ ہو یا موسیقی کا ۔ یہ گزشتہ تین صدیوں میں یورپ کی صنعتی اور سائنسی ترقی سے ضرور متاثر ہوا ۔ اگر صرف ناول نگاری کی بات کریں تو کہا جا سکتا ہے کہ حکایت وضع کرنے کی جو تکنیک سرمایہ دارانہ نظام کی ناول نگاری میں ابھری ہے وہ گذشتہ دور کی حکایتوں میں نہیں ہے ۔ سرمایہ دارانہ دور کا رجحان کسی پرانے قصے یا حکایت کو پیش کرنے کا نہیں بلکہ خود سے حکایتیں وضع کرنے کا رہا ہے ۔ اسی سے ادب کی ہم عصریت کا عنصر زیادہ واضح ہوا ہے ۔ ۳۵

''ترقی پسند ادب'' کے تحت ممتاز حسین نے ان امور سے بحث کی ہے جن کا تعلق ترقی پسند ادب کی شناخت اور بہتر تخلیقات کی نشاندہی کرنے سے ہے ۔ انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ بدلتے وقت کے ساتھ ادیبوں کی سوچ پرکھ کا انداز بھی بدل گیا ۔ شبلی کی کسوٹی بدل گئی اور حالی کا شعور بہت ترقی کر چکا ہے ۔ ممتاز حسین کہتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کو جنم دینے میں یورپ اور سوویت یونین سے لائے ہوئے شعور کو بہت زیادہ دخل رہا ہے ۔ ابتداءً اس تحریک پر ایک گہرا رومانوی اثر تھا یعنی وہ انیسویں صدی کی فطرت نگاری اور احیائی میلانات کی رومانیت کا تھا لیکن یہ رومانوی رجحان دوسری جنگ عظیم کے چھڑتے ہی کمزور پڑ گیا اور جوں جوں لڑائی کے بھیانک اثرات ہماری زندگی پر پڑتے گئے ہم حقیقت نگاری کی

طرف قدم اٹھاتے گئے۔۵۱ءاور۵۲ءکا زمانہ دھند لکے سے نئی روشنی میں حقیقت کو سمجھنے، ادبی مظہر کو جانچنے اور ترقی پسند تحریک کو تشکیل دینے کا زمانہ تھا۔اس زمانے میں فارم پر خاص طور سے زور دیا گیا۔۳۶

''عوامی ادب'' کے موضوع کے تحت ممتاز حسین نے اردو زبان کے عوامی ادب سے متعلق بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عوامی ادب خواص یا حکمراں طبقہ کے ادب سے اسی طرح ممتاز ہے جس طرح عوام، خواص یا حکمراں طبقہ سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اس موقع پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ زبان خواص اور عوام کے درمیان مشترک ہوتی ہے۔ خواص اپنے مخصوص کلچر کی وجہ سے کچھ ایسے فقرے اور محاورے استعمال کرتے ہیں جو ان کے مخصوص کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ممتاز حسین نے عوامی ادب کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ عوامی ادب کو''جن گیت'' یا''لوک کتھا'' کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے۔ فوک لٹریچر اس دور کا عوامی ادب ہے جب بولیاں زبان کی حیثیت سے ترقی نہیں کر پائی تھیں۔ مثال کے طور پر جس زمانے میں حکمراں طبقے کی زبان عوام کی زبان سے علاحدہ سنسکرت یا فارسی تھی، تو عوام اپنے ادب کی تخلیق بولیوں میں کرتے تھے۔ اب چند بولیوں نے زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے، انھوں نے اپنا علاقہ قائم کر لیا ہے، اس لیے عوامی ادب کی تخلیق کا رجحان بھی بدل گیا ہے۔ اب عوامی ادب ان علاقوں میں بالعموم عوامی زبان میں تخلیق کیا جاتا ہے نہ کہ اس علاقے کی مختلف بولیوں میں۔ اپنی اہمیت کے باوجود اس کی اتنی افادیت نہیں ہوتی کہ اسے اس ادب پر فوقیت دی جائے جو عوامی زبان میں تخلیق ہوتا ہے۔۳۷

انتخاب غالب:

ممتاز حسین کی یہ کتاب مارچ ۱۹۵۷ء میں جاوید پریس لاہور سے منظرِ عام پر آئی۔ ایک سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب نہایت دل چسپ اور اہم ہے۔ غالب کی غزلیات، نوحہ، مرثیہ، قصائد، رباعیات کے انتخاب کے علاوہ اس میں ۵۶ صفحات پر مشتمل ممتاز حسین کا بسیط مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ مقدمہ غالب سے گفتگو کے انداز میں دل چسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ مقدمے میں ممتاز حسین نے غالب کے خاندانی حالات، ان کی شاعری کے اسلوب، شاعری پر اثر انداز ہونے والے واقعات، غالب کی

شاعرانہ عظمت، جدید طرز فکر کی طرف ان کے رجحان اور ہم عصروں کے مقابلے میں ان کی ترقی پسندی کا ذکر کیا ہے۔

ممتاز حسین نے مقدمے کے آغاز میں ہی بتایا ہے کہ غالب کے کلام کا انتخاب دوسرے لوگوں نے بھی کیا ہے مگر غالب کے صحیح مقام کے تعین میں ناکام رہے ہیں۔ وہ خود بھی اس بات کے دعویدار نہیں ہیں کہ غالب کے کلام کے انتخاب میں وہ کما حقہ کھرے اتریں گے۔ بہر حال یہ کوشش اس لیے کی جارہی ہے کہ دورِ حاضر کی نسل سے غالب کا تعارف نئے انداز سے کرائیں تاکہ نئی نسل کو اس سے فائدہ پہنچ سکے۔[۳۸]

غالب کے دادا قوقان بیگ محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے۔ پہلے لاہور میں نواب معین الملک بہادر کے یہاں ملازم ہوئے[۳۹]۔ نواب کے انتقال کے بعد وہ دلی چلے آئے اور شاہ عالم ثانی کے دربار میں پچاس سوار کے ساتھ ملازم ہوئے۔ تنخواہ کی شکل میں ان کو پرگنہ پہاسو دیا گیا۔ دادا کے انتقال کے بعد جو سیاسی ابتری پھیلی تو اس علاقے پر قبضہ ختم ہو گیا۔ والد مرزا عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ چلے گئے اور آصف الدولہ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد حیدرآباد چلے گئے اور نواب نظام علی کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔ وہاں خانہ جنگی چھڑنے کے بعد الور چلے آئے۔ یہاں راؤ بختاور سنگھ کے یہاں ملازمت شروع کی۔ یہیں ۱۸۰۲ء میں کسی لڑائی میں کام آئے۔ ان کی والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ وہ آگرے کے مشہور رئیس غلام حسین کی بیٹی تھیں۔ یہیں دسمبر ۱۷۹۷ء میں غالب کی پیدائش ہوئی۔ غالب کی ایک بہن تھیں چھوٹی خانم جو عمر میں ان سے بڑی تھیں۔ ان کا ایک بھائی بھی تھا، یوسف حسین خاں، جو عمر میں ان سے دو سال چھوٹا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا نصراللہ بیگ نے ان کی پرورش و پرداخت کی۔ وہ لارڈ لیک کے ایک دستے کے رسالدار تھے۔ چچا کی شادی نواب احمد بخش خاں والیِ لوہارو کی بہن سے ہوئی تھی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ تھی۔ غالب ابھی نو برس کے ہی تھے کہ ان کے چچا باغیوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ یہ واقعہ ۱۸۰۶ء کا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد وہ رسالہ توڑ دیا گیا اور وہ مواضعات واپس لے لیے گئے جو رسالے کی پرداخت کے لیے انگریزوں سے ملے تھے۔ ان کے پس ماندگان کو گزر اوقات کے لیے دس ہزار روپے سالانہ بطور پنشن دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن ان کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ سے زیادہ رقم نہیں ملتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود غالب کا بچپن اور عنفوان شباب کا

زمانہ آرام سے کٹا کیوں کہ ان کی نانیہال خوش حال تھی۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی نواب احمد بخش کی بھتیجی امراؤ بیگم کے ہمراہ ہوئی۔ اس کے بعد وہ دلی چلے آئے اور یہیں رہنے لگے۔

غالب نے ابتدائی تعلیم آگرہ میں ہی حاصل کی۔ آگرہ اس وقت علوم شرقیہ کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہ جو مشہور ہے کہ انھوں نے نظیرا کبرآبادی سے تعلیم حاصل کی، درست نہیں ہے۔ انھوں نے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم سے حاصل کی۔ ان کے استاد کو بیدلؔ، اسیرؔ اور شوکتؔ کے کلام بہت پسند تھے۔ قدیم فارسی انھوں نے ملا عبدالصمد سے سیکھی تھی جو مذہب اسلام قبول کرنے سے پہلے آتش پرست تھے۔ اسی سے انھوں نے زرتشتیوں کے مذہب اور ایران کی تاریخ کی واقفیت حاصل کی۔ ۴۰

شاعری میں ان کا کوئی استاد نہیں تھا۔ ایرانی دساتیر سے واقفیت کی وجہ سے انھوں نے ''دستنبو'' قدیم فارسی کے طرز پر لکھی اور ''مہر نیم روز'' میں عربی الفاظ سے پرہیز کیا۔ ایام جوانی میں انھیں رنگ رلیوں سے پرہیز نہیں تھا۔ زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے شراب اور شعر و نغمے سے مسرت حاصل کی۔ وہ کلمہ گو ہونے کے ساتھ ساتھ، رسالت، معراج اور امامت کے قائل رہتے ہوئے توحید مطلق کے ہی نہیں بلکہ وحدت الوجود کے بھی قائل تھے۔ ان کی یہ عجمی فطرت ماوراء النہر کے علماء کی خشک مغربی سوچ سے میل نہیں کھاتی تھی۔ وہ سمرقندی حنفی سنی مذہب کو ترک کر کے عجم کی شیعیت کی طرف مائل ہو گئے۔ صوفیوں کی طرح انھوں نے خود کو ہر قسم کے دینی اور ملی تعصب سے پاک رکھا۔ ان کی نظر میں ہندو، مسلم، عیسائی، زرتشتی، سنی، شیعہ سب برابر تھے۔

مرزا غالب کے خسر الٰہی بخش المتخلص بہ معروفؔ دلی ہی میں رہتے تھے۔ ان کے توسط سے غالب کی ملاقات جید عالم مولوی فضل حق خیرآبادی سے ہوئی۔ ان کی صحبت نے مرزا غالب کی طبیعت کے لاابالی پن کو لگام دیا۔ جس وقت وہ دلی میں آئے انھوں نے وہاں انگریزوں کے سیاسی اقتدار کو دیکھا اور اکبر شاہ ثانی کی بے بسی بھی دیکھی۔ انھوں نے مسلمانوں کی معاشی بدحالی کا بھی مشاہدہ کیا۔ وہ ۱۸۵۷ء میں انقلاب کے عینی شاہد تھے۔ اس انقلاب میں وہ اور ان کا خاندان بھی بہت زیادہ متاثر ہوا۔ ۴۱

غالب کی ذہنی تربیت میں حکیم محمود خاں، مفتی صدرالدین آزردہؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کے اثرات بہت زیادہ مرتب ہوئے لیکن انھوں نے ذاتی عقائد میں ان سے بہت کم اکتساب کیا ہے۔ ۴۲

غالب کی آزاد خیالی میں دہلی کالج کی پھیلائی ہوئی آزاد خیالی کو زیادہ دخل رہا ہے۔ غالب کا دماغ ایک ایسی تحریک کا جزو بن گیا تھا جس میں مغربی اور مشرقی تہذیب کی آمیزش تھی۔ انھیں علم معقولات سے بہت زیادہ دل چسپی تھی، وہ دوسروں کو بھی مشورہ دیا کرتے تھے کہ اگر آدمی بننا چاہتے ہو تو فلسفہ اور منطق پڑھو۴۳۔ ان کی آزاد خیالی، ان کا تشکک زمانے کی روش سے ہٹ کر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سر سید نے ابوالفضل کی آئین اکبری کے مصحح نسخہ پر ان سے تقریظ لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ان کا ردعمل اس قسم کا تھا کہ انگلستان کے آئین اور جمہوریت کو کم وقیع ثابت کرنا مناسب قدم نہیں ہے۔ وہ انگلستان کے آئین اور ایجادات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ چنانچہ اپنی تقریظ میں انھوں نے ان ایجادات کی بہت تعریف کی ہے اور سر سید کو مشورہ دیا کہ ''مردہ پروردن مبارک کار نیست۔''

۱۸۵۷ء کی بغاوت یا انقلاب سے جہاں بالعموم مسلمانوں کی زندگی متاثر ہوئی وہیں غالب پر بہت زیادہ ستم ٹوٹا۔ قلعہ سے تعلق رکھنے اور بہادر شاہ ظفر کا سکہ لکھنے کے جرم میں انھیں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی مصیبتوں کے ردعمل میں انھوں نے قلعہ معلیٰ کو ''قلعہ نا مبارک'' بھی لکھا ہے۔۴۴

غالب کا مسلک انسان دوستی کا تھا۔ وہ تمام تعصّبات کو مٹا کر ایسی انجمن کی تعمیر کے خواہش مند تھے جس میں جنگ وجدال کا طریقہ جائز نہ تھا۔ ان حالات میں وہ بیک وقت ترقی پسند اور رجعت پسند دونوں سمجھے جا سکتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں زہد و اتقا، خوف عقبیٰ اور حور و قصور نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں ایمان وعمل کے تضاد کو دخل نہیں ہے۔ وہ فلسفہ میں وحدت الوجود کے قائل تھے۔

غالب پچیس سال کی عمر تک صائب، ظہوری، شوکت اور اسیرؔ کی زمین میں غزل لکھتے رہے جس میں مضمون آفرینی اور حسن تعلیل کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ غالب اپنے ابتدائی دور کے کلام کو کم مایۂ معنی ومطلب اور بہ اعتبار صورت موزونیٔ طبع کی کارستانی سمجھتے تھے۔ بعد میں وہ عرفیؔ اور نظیریؔ کے انداز کی طرف مائل ہوئے۔ اس وقت غالب کی شاعری کا ایک دور بیت گیا تھا۔ اب وہ اسد اللہ سے غالب بن چکے تھے اور یہ غالب نئی شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔

باغ و بہار مع مقدمہ وفرہنگ:

ممتاز حسین کی یہ کتاب ۱۹۵۸ء میں اردو ٹرسٹ کراچی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ تحقیقی اور تنقیدی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس میں باغ و بہار کے مآخذ، میر امن کے ترجمے کی نوعیت و اہمیت اور دلی کی معاشرت کی جھلکیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ باغ و بہار کے مآخذ سے متعلق بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس وقت اردو نثر میں قصہ چہار درویش کے تین ترجمے پائے جاتے ہیں۔ سب سے قدیم ترجمہ میر حسین عطا خاں تحسین کا ہے جسے رنگینیٔ عبارت کی وجہ سے انھوں نے نوطرز مرصع کا نام دیا۔ آزاد کے بقول یہ ترجمہ ۱۷۹۸ء میں کیا گیا۔ بیشتر لوگوں نے یہی تاریخ نقل کی ہے لیکن گیان چند جین نے اپنے تحقیقی مقالے ''اردو نثر کی داستانیں'' میں اس کا سن تالیف ۱۷۷۵ء سے ۱۷۸۱ء کے درمیان بتایا ہے۔[۴۵]

دوسرا ترجمہ میر امن کا ہے جو باغ و بہار کے تاریخی نام سے مشہور ہوا۔ اس میں اس کا سنہ تالیف ۱۸۰۲ء بتایا گیا ہے۔ تیسرا ترجمہ میر محمد عوض زریںؔ کا ہے۔ میر امن کا نسخہ کلکتہ سے ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کے سرورق پر جلی حروف میں یہ عبارت درج ہے ''باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امن دہلی والے کا۔ مآخذ اس کا ''نوطرز مرصع'' کہ وہ ترجمہ کیا ہوا ہے میر حسین عطا خاں کا، فارسی قصۂ چہار درویش سے''۔ اس لیے اس میں شبہے کی کم گنجائش ہے کہ اس کا مآخذ نوطرز مرصع نہیں ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں کے درمیان کچھ اشتباہ بھی پایا جاتا ہے کہ صحیح معنی میں اس کا مآخذ کون سا ہے؟۔ اسی لیے مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تحقیق میں کہا ہے کہ میر امن نے اپنی تالیف کا ذکر کرتے ہوئے نوطرزِ مرصع کا ذکر نہیں کیا۔ محمود شیرانی نے اپنی تحقیق میں مذکورہ بالا عبارت نقل کرتے ہوئے کہا کہ مولوی عبدالحق کا الزام درست نہیں ہے۔ انھوں نے اس روایت کو بھی غلط ثابت کیا ہے کہ قصہ چہار درویش کی وجہ تصنیف میں امیر خسرو دہلوی کا کسی تقریب میں یہ کہنا کہ حضرت نظام الدین اولیا جوان کے پیر تھے، ان کی طبیعت ماند ہوئی، تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ کہتے تھے اور تیمار داری میں حاضر رہتے تھے۔

اس کتاب میں ممتاز حسین اس نکتے کو بھی اٹھاتے ہیں کہ ابتداءً اردو نثر کی تاریخ لکھنے والوں میں

میر امن کا نام تھا اور امن تخلص تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ اس نام اور تخلص کا پتہ انھیں کہاں سے چلا۔ جب کہ خود ان کی اپنی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا نام امن اور تخلص لطف تھا۔ میر امن کا خاندان بقول ان کے منصب دار قدیمی اور خانہ زاد موروثی میں شمار کیا جاتا تھا اور یہ لقب ان کے خاندان کا پادشاہی دفتر میں درج تھا۔

میر امن کے ترجمے کی نوعیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ممتاز حسین کہتے ہیں کہ ان کا ترجمہ نقل بھی ہے اور اصل بھی۔ نقل اس طرح ہے کہ انھوں نے نوطرز مرصع میں پائے جانے والے قصہ چہار درویش کے خدوخال میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے اور اصل اس معنی میں ہے کہ یہ کسی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہے، اور نہ ہی کسی ترجمہ کی اصلاح شدہ صورت ہے بلکہ اس کا اپنا آزادانہ وجود ہے۔ میر امن نے نوطرز مرصع کے مطالب کو ذہن میں رکھ کر اسے اپنے محاورے اور ہندوستانی گفتگو میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اس سے قصے میں ایک نئی جان آ گئی ہے۔ اس کتاب میں مختلف کرداروں سے میر امن نے جو گفتگو کرائی ہے اس لیے یہ کتاب طبع زاد سی معلوم ہوتی ہے۔ اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے جان گل کرسٹ نے ان کی خدمت میں یہ خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ''اس میں کلاسیکی پاکیزگی ایسی ہے کہ اس پر بڑی حد تک طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔''

باغ بہار کو اردو کے نثری ادب میں نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے۔ اردو نثر کو لفاظی، عبارت آرائی، قافیہ اور وزن کی پابندی سے نجات دلانے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ باغ و بہار کی نثر بہت سادہ ہے۔ نثر کی اس سادگی نے اردو دنیا اور اس کے اہل قلم کو یہ راستہ دکھایا ہے کہ سادگی کا حسن آرائش و زیبائش سے زیادہ جاذب نظر ہوتا ہے۔

داستان خواہ کہیں کی ہو وہ اپنے عہد کی معاشرت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ باغ و بہار کی مختلف حکایتیں عہد مغلیہ کی رنگینیوں سے آراستہ ہے۔ اس میں اس دلی کی افسردہ اور سلگتی ہوئی شام کی رنگینی ہے جو احمد شاہ ابدالی کی غارت گری سے کچھ پہلے کی تھی۔ اس میں محمد شاہ رنگیلے کے عہد کے دربار کی جھلک ملتی ہے جس میں راگ ورنگ کے شوقینوں، داستان گویوں، فقیروں اور درویشوں کا ہجوم ملتا ہے۔ خود بادشاہ محفل ناؤ نوش میں مست خاندان تیموریہ کے جاہ وجلال کو بھلا بیٹھا۔ ایک زوال آمادہ دور میں بادشاہ کے

دربار میں رقص وسرود، عیش ونشاط کی محفلوں کا گرم ہونا، شحنہ اور محتسبوں کا خاموش تماشائی ہونا، خواجہ سراؤں کا زور ہونا، یہ سب باتیں اس میں ملتی ہیں۔ اس میں بیان کیے گئے رسم ورواج ٹھیٹھ ہندوستانی ہیں۔ مثلاً بھائی کے آنے پر کالے ٹیکے اور ماش کا صدقہ دینا، رخصتی کے وقت ماتھے پر ٹیکہ لگانا وغیرہ۔ ۴۶

ادب اور شعور:

ممتاز حسین کی یہ کتاب ایجوکیشنل پریس کراچی سے نومبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ دراصل گذشتہ چھ، سات سال کے دوران مختلف رسائل میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں مختلف عنوانات کے تحت کل ۲۲ مضامین شامل ہیں۔ یہ عناوین ہیں۔ ''نثر معلیٰ''، ''رسالہ درمعرفت استعارہ''، ''ہمارا کلچر اور ادب (۵۷ء سے پہلے اور ۵۷ء کے بعد)''، ''ہماری تہذیبی جدوجہد''، ''قومی زندگی میں علاقائی کلچر کی اہمیت''، ''تنقید کے چند بنیادی اصول''، ''فن اور فطرت (فکر اقبال کے آئینے میں)''، ''ادب اور سائنس''، ''ادب اور شخصیت''، ''اسٹائل''، ''ناول نگار منشی پریم چند''، ''حسرت کی غزل گوئی''، ''فیض کی شاعری'' جس کے تحت دو ذیلی عناوین ہیں ''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ''، ''راشد کی شاعری کا کیریکٹر''، ''مجاز کی موت پر''، ''منٹو کی یاد میں'' یزید (سعادت حسن منٹو) ''شذرات'' کے تحت چار عناوین ''غالب ایک تہذیبی قوت''، ''حالی اردو کا پہلا نقاد؟''، ''کردار نگاری''، ''قومیت کے معمار-ادیب''۔ آئندہ سطور میں مختصراً ان مضامین کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

''نثر معلیٰ'' کے تحت پروفیسر ممتاز حسین نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زبان کی تکمیل اور ترقی کے مسئلے کو زبان کے فطری ارتقائی رجحانات اور تمدنی ضروریات سے علاحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اردو زبان کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہم آزاد کے مقابلے میں خوب صورت نثر کس طرح لکھیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنی زبان کو کس طرح اتنا فروغ دیں کہ وہ ہماری تمدنی ضروریات کو پورا کر سکے اور دنیا کی مہذب ترین زبانوں کے دوش بدوش چلنے کے قابل ہو سکے۔ ۴۷

مضمون ''رسالہ درمعرفت استعارہ'' میں ممتاز حسین نے کہا ہے کہ انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کرنے کے لیے فلسفیوں نے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ مثلاً ارسطو نے اسے تین نام دیے ہیں —— سماجی

حیوان، سیاسی عاقل، اور ناطق انسان ۴۸؎۔ انسان کا تصور نہ تو اس کی عقل سے جدا کر کے ذہن میں لایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی نطق سے۔ اور نہ ہی عقل اور نطق کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے کیوں کہ زبان تمام تر تجریدی طریقہ کار (ABSTRACTION) کا نتیجہ ہے۔ اس میں انسان کی قوت متخیلہ کو شامل کیا جانا لازمی ہے۔ افلاطون حواس خمسہ کو ارضی اور عقل یا قوائے ذہنی کو سماوی تصور کرتا تھا۔ پورا مضمون ان ہی نکات کے اردگرد گھومتا ہے۔ ان ہی نکات کے تحت مختلف شعراء کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

''ہمارا کلچر اور ادب'' تاریخی نقطہ نظر سے بہت اہم مضمون ہے۔ اس میں پروفیسر ممتاز حسین نے مشرق اور مغرب کے ذہنی تصادم کا ایک خاکہ پیش کیا ہے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے تھا اور جو ۱۸۵۷ء کے بعد ایک سمجھوتہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں ذہنی تبدیلی کی رفتار بہت سست رہی ہے۔ اس زمانہ کے بہت سے مسائل آج بھی متنازعہ فیہ ہیں اور یہ خصوصیت پورے مغربی ایشیا کی ہے۔ ہماری جس قسم کی ذہنی تعلیم و تربیت قرونِ وسطیٰ میں ہوئی تھی اس سے دور حاضر کا دماغ متصادم رہا ہے۔ ہم نے یورپ کے نشاۃ ثانیہ کو بہت تاخیر سے قبول کیا حالاں کہ وہ ہمارے اکابرین کی ہی مرہون منت تھی۔ جن علماء نے انقلابی خیالات پیش کیے اور جن کے کارناموں سے مستفیض ہو کر یورپ ''تاریک دور'' سے نکلنے میں کام یاب رہا، انھیں ہمارے علمائے کبار نے ملحد گردانا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بارے میں انھوں نے بڑے نکتے کی بات کہی ہے کہ ۵۷ء کی بغاوت، اگر ایک طرف آزادی اور غلامی کی لڑائی تھی تو دوسری طرف مغرب اور مشرق کے دو مخالف ذہنوں کی بھی لڑائی تھی۔ مغربی ذہن متحرک اور تغیر پسند تھا۔ مشرقی ذہن بندھے ٹکے نظریات کا حامل تھا۔ ''آئین نو سے ڈرنے اور طرز کہن پر اڑنے'' کی اس روش کی ہندوستانیوں کو بھاری قیمت چکانی پڑی۔ آگے چل کر تعلیم کے میدان میں بھی یہی ہوا۔ بعد ازاں انھوں نے غالب کی روشن خیالی کو سراہا ہے۔ سرسید کے افکار کے کچھ پہلوؤں کو گرفت میں لاتے ہوئے انھوں نے سرسید کے افکار جدید کی تعریف کی ہے۔ ۴۹؎

مقالہ ''ہماری تہذیبی جدوجہد'' ۱۹۵۹ء میں پاکستان رائٹرس کنونشن کی تاسیس کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ اس میں انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ انسان کی عظمت میں اس کا اعتماد ہی اس کے کلچر کا سنگ بنیاد ہے۔ اسی اعتماد سے اس کی تہذیبی کوششیں حقیقی اور بامعنی ہوتی ہیں ورنہ وہ مایا اور چھایا بن کر رہ

جاتی ہیں۔انسان کے اس کلچر کی ابتدااس وقت سے ہوتی ہے جب سے اس نے اپنے کوفطرت کے جبر سے آزاد کرنا شروع کیا اوراپنی تخلیقات کے سلسلے کا آغاز کیا ۵۰۔اس ضمن میں ممتاز حسین نے اقبالؔ کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اسی سلسلۂ تخلیقات میں وہ اپنی انسانی فطرت کا بھی خالق بنا جس کا دائرہ چند اخلاقی اقدار تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی نفسیات کی پوری پر مایگی پر حاوی ہے۔عشق ومحبت کی فسوں سازیاں، وفاشعاریاں، خلق ومروت کی دل گرمیاں، دماغ رنگ وبو، جنون جستجو اورآشوب آگہی، یہ سب اس کی اپنی تخلیقات ہیں۔

مضمون ''قومی زندگی میں علاقائی کلچر کی اہمیت' اپریل ۱۹۶۱ء میں بزم ثقافت ملتان کے مذاکرے میں پڑھا گیا تھا۔ممتاز حسین نے اس مضمون میں قومی زندگی میں کلچر کی اہمیت اور مقامی کلچر میں قومیت کے پہلو پر غور کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ (مغربی) پاکستان کے مختلف علاقوں اور لسانی قوموں کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔اس کے جواب میں انھوں نے پہلے کلچر اور سیولیزیشن کے مفاہیم کو متعین کرنا ضروری سمجھا۔ان کا خیال ہے کہ انسان نے کلچر کو جنم دیا کیوں کہ وہ خود بین، خود آرا ہی نہیں بلکہ خودگر وخلاق، صناع اور طباع بھی ہے۔سیولیزشن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ اسی کا عطیہ ہے جسے ذہنی اوزار کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔مضمون میں علاقائی زبان اور کلچر کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔۵۱

مضمون ''تنقید کے چند بنیادی مسائل'' پہلے فن کار دہلی، کے شمارہ نمبر۳،۴ میں شائع ہوا تھا۔یہاں پر مضمون نگار نے اس کے پہلے حصے کو حذف کر دیا ہے۔ممتاز حسین نے تنقید کے بنیادی تصور'ادب زندگی کا آئینہ ہے' پر بحث کرتے ہوئے تنقید کے دوسرے پہلوؤں کو بھی زیر بحث لایا ہے۔انھوں نے کہا ہے کہ ادب زندگی کا مجہول آئینہ نہیں ہے کیوں کہ زندگی کو منعکس کرتے وقت شاعر یافن کار اپنے نقطہ نگاہ، اپنی قوت ارادی کے میلانات اوراپنے عمل وحرکت کے پیغامات سے زندگی کو بدلنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔شاعر یافن کار، اقدار اس وقت تخلیق کرتا ہے جب کہ وہ خارجی حقیقت کے بارے میں اپنے ذہنی رجحانات اورقوت ارادی کے میلانات کا اظہار کرتا ہے خواہ وہ رجحان خارج کے مقابلے میں جذبۂ سپردگی ہی کیوں

نہ ہو۔ ادبی تنقید کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ ادبی تنقید اصل میں ادب کی تنقید ہے لیکن چوں کہ ادب بذات خود زندگی کی تنقید ہے، ادب کے پس منظر میں، اس لیے ادبی تنقید لامحالہ زندگی کی تنقید بن جاتی ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے نکات اس مضمون میں زیر بحث آئے ہیں۔ ''فن اور فطرت (فکر اقبال کے آئینے میں)''، میں ممتاز حسین نے اقبال کے اس شعر

فطرت کی غلامی سے کر آزاد، ہنر کو
صیّاد ہیں مردانِ ہنرمند کے نخچیر

کو نقل کرتے ہوئے اپنی بات شروع کی ہے۔ کہتے ہیں کہ فطرت ان ہی کے سامنے سربسجود ہوتی ہے جو فطرت کے قوانین، اس کی ماہیئت اور ہیئت سے واقفیت پیدا کرتے ہیں۔ ممتاز حسین حالی کے افکار کو بھی زیر بحث لاتے ہیں اور سرسید کے خیالات پر بھی اپنی رائے دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اقبال کے یہاں سرسید کی وحدت الوجودیت اور حالی کی متوازنیت دونوں ہی کے اثرات ملتے ہیں۔۵۲؎

مضمون ''ادب اور سائنس''، میں ممتاز حسین نے انسانوں کی کلاسیکی غلامی کے دور سے لے کر سرمایہ دارانہ نظام کی جدید غلامی تک کے طویل سفر کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پورے عہد میں انسان نے جو ترقیاں کی ہیں، تو اس میں فطرت کو مسخر کرنے، مشین اور آلہ جات کو ڈھالنے، پیداواری قوتوں کو فروغ دینے اور پیداوار کی تکنیک میں انقلابی تبدیلیاں لانے میں اس نے ایک بہت بڑی قیمت اپنی انسانیت اور روحانیت کو ضائع کر کے چکائی ہے۔ انسانی تہذیب کے ابتدائی دور میں سائنس اور ادب ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھے۔ لیکن جوں جوں انسانی معاشرہ طبقاتی سماج میں تبدیل ہوکر پرتضاد بنتا گیا تو روح و جسم اور دل و دماغ کی دوری بڑھتی گئی۔ سائنس کی مدد سے انسانی شخصیت کو فروغ دینے کے بجائے، انسانی شخصیت کی نفی کی جانے لگی۔ بغور دیکھا جائے تو سائنس اور ادب ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ دونوں مل کر ہی انسان کی تخلیقی قوت کی مکمل نمائندگی کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک کو دوسرے کی ضد قرار دینا یا ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا انسانی حقیقت کو نہ سمجھنے کے برابر ہے۔ یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ یہ صدی صرف سائنس کی ہے، انسانیت اور ادب کی نہیں ہے۔ انسانیت کی تعمیر میں دور حاضر کے عالمی ادب کو ایک بڑا مقام حاصل ہے۔۵۳؎

ممتاز حسین نے ۱۹۵۷ء میں کراچی یونیورسٹی میں ''ادب اور شخصیت'' کے موضوع پر منعقد ایک سیمنار میں تقریر کی تھی۔ مضمون ''ادب اور شخصیت'' اسی کی یادگار ہے۔ اس موضوع کے انھوں نے دو متضاد پہلو بتائے ہیں ایک یہ کہ ادب یا فن شخصیت کا اظہار ہے اور دوسرا یہ کہ ادب یا فن شخصیت سے گریز ہے۔ آخرالذکر نقطۂ نظر کو سب سے پہلے ٹی ایس ایلیٹ نے ۱۹۲۱ء کے آس پاس متعارف کرایا۔ شخصیت سے متعلق ہربرٹ ریڈ کا کہنا ہے کہ کیریکٹر یا کردار شخصیت کی ضد ہوتا ہے۔ کیریکٹر ایک ٹھوس اور اٹل شے ہے۔ وہ ایک آئیڈیل اپنے سامنے رکھتا ہے جس کے لیے وہ اپنے جذبات کا پیہم خون کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے کو حالات کے مطابق بدلتا نہیں بلکہ اڑا رہتا ہے۵۴۔ دورِ حاضر میں جب کہ تعین اقدار سے زیادہ بقائے حیات کا مسئلہ اہم ہے فلسفہ حیات کی مسابقت جس کا ایک ذریعہ آرٹ اور ادب بھی ہے، کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ادب زندگی کی قوت میں اضافہ کرتا ہے، وہ ہمارے جذبات اور احساسات کو پاکیزہ تر بناتا ہے۔ انسان کی قوت ارادی کو تقویت پہنچاتا ہے اور آدمی کو انسانیت کے زیور سے آراستہ کرتا ہے۔

مضمون ''اسٹائل'' پہلے ۱۹۵۹ء میں ماہِ نو کراچی میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ممتاز حسین نے کہا ہے کہ اسٹائل کا اردو میں چاہے جو ترجمہ کرلیا جائے لیکن مفہوم کی ادائیگی کے لیے لفظ ''اسٹائل'' ہی زیب دیتا ہے۔ اس کا تعلق حسن ادا سے ہے نہ کہ ادائے محض سے یا انفرادیت محض سے۔ اسٹائل انفرادیت کا مترادف نہیں ہے ہر چند کہ اس میں انفرادیت موجود ہوتی ہے۔ اسٹائل کا ایک معیار ہوتا ہے جو مذاق سخن کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔ بہترین اسٹائل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ انسان اپنی اسٹائل سے بے خبر اور اپنی شخصیت سے باخبر ہوتا ہے۔۵۵

''ناول نگار منشی پریم چند'' ممتاز حسین کا ایک پرمغز مضمون ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ چیخوف کی طرح منشی پریم چند کو بھی کلچر کے حصول میں بڑی جدوجہد کرنا پڑی کیوں کہ وہ بھی ایک بہت معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں انسانی جہت نمایاں ہے۔ اسی وجہ سے ممتاز حسین انھیں ترقی پسند ناول نگار سمجھتے ہیں۔ پریم چند کے یہاں مراجعت کا تصور نہیں ملتا۔ وہ انسانیت اور فلاح و بہبود کے علم بردار ہیں۔ منشی پریم چند ایک عظیم ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول میں آرٹ اور زندگی کا امتزاج ملتا ہے۔ اندازِ بیان سادہ و سہل ہے اس کے ساتھ ان کے یہاں غضب کی برجستگی بھی ہے۔ ان

کے آرٹ میں کسی قسم کی کوئی آرائش نہیں ہے اور نہ ان کے اسٹائل میں کوئی شعوری تراش وخراش ہے۔ پریم چند کے کردار سطحی نہیں ہیں۔ ان میں گہرائی موجود ہے لیکن وہ گہرائی انسانی ضمیر اور جذبات کی ہے نہ کہ انتشار ذہنی، نراجیت اور جنسی الجھاؤ کی۔۵۶؎

''حسرت کی غزل گوئی میں'' ممتاز حسین نے حسرت کی سیاسی زندگی اور ان کی غزل گوئی میں ربط ڈھونڈتے ہوئے حسرت کے رنگ تغزل کو روایت اور درایت کے پس منظر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ حسرت اپنے عقائد میں قدامت پسند تھے تو سیاست میں شدت پسند تھے۔ وہ اصلاحی معاشرت کی ضرورت سے باخبر تھے لیکن سائنس اور معقولات کی طرف سے کچھ بے نیاز سے تھے۔ ان کے لیے حصول آزادی، تکمیل اختلاف کا ایک ذریعہ تھا نہ کہ چشم کشائی ذہن آدم کی ایک تمہید۔ حسرت نے اپنی غزل گوئی میں مومنؔ کا طرز اپنایا لیکن صرف اس حد تک ان کی رنگین نگاریاں لیں اور اس سے اصل رنگ قائم کر کے اس میں کچھ جرأت کی شوخی ملائی تو کچھ مصحفیؔ کے احساس رنگ و بو کی ہوائیاں چھڑکیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے شیرینیٔ نسیمؔ اور آفرینی میرؔ کی چاشنی بھی ملائی۔ اس پر لطف منظر کے ساتھ ان کی شاعری آگے بڑھتی ہے۔۵۷؎

''فیض کی شاعری'' ممتاز حسین کا بہت ہی دل چسپ اور پر مغز مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے بطور خاص فیض کے مجموعۂ کلام ''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ'' کی نظموں پر گفتگو کی ہے۔ ممتاز حسین کہتے ہیں کہ فیضؔ کی شاعری میں زیادہ نازک مقام حسن کو حاصل تھا۔ ان کی شاعری میں کچھ دوسرے موضوعات بھی ملتے ہیں جن کے تحت ان کی سیاسی نظمیں آتی ہیں۔ فیض کی شاعری میں یہ دونوں رجحانات آپس میں کچھ اس طرح ملے جلے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۵۸؎۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فیضؔ نے غریبوں کی حمایت، زیردستوں کے مصائب اور دکھ درد کے معنی اسی عشق سے سیکھے ہیں جن میں آسودگی جسم سے زیادہ لذت ہوش وگوش ہے۔ فیض کی غزلوں کا پیکر فلسفیانہ خیالات کا حامل نہیں ہے۔ فیض کی شاعری لطافت غم سے بے نیاز نہیں ہے۔ ہر گام پر ہر قدم پر غم ہے مگر محرومیٔ جاوید یا نا امیدی کی صورت میں نہیں بلکہ گردش رنگ طرب کے ایک پہلو یا ناکامی کی صورت میں۔ فیض کی شاعری میں دل آرام رجائیت اس کے دیدۂ تر سے جھانکتی ہے اور شب ہجر کی مانگ ستاروں سے بھر دیتی ہے۔ یہ اس کے سیاسی یا اجتماعی شعور کی غماز ہے۔ اس میں نہ کوئی واہمہ ہے نہ فریب خوردگی آرزو ہے بلکہ اس میں تکرار سحر یقین

کی آواز ہے جس کی بنیاد مشرق کے انقلابات نے چنی ہیں۔ تبھی تو اس کا دعویٰ ہے:

گل کرو ماہتاب تو جانیں

''راشد کی شاعری کا کیریکٹر'' ممتاز حسین کا ایک مختصر مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے راشد کی شاعری کے دو پہلوؤں یعنی راشد کی شاعری بنیادی طور پر سیاسی ہے یا جنسی پر غور وخوض کیا ہے۔ یہ مضمون اسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش ہے۔ ۵۹

''مجاز کی موت پر'' ممتاز حسین کا ایک مختصر مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مجاز کی شاعری بھی جدید شاعری کے رجحان سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ وہ بھی فریب رنگ و بو کھاتا رہا ہے۔ لیکن مجاز کی ہوش مندی اس میں تھی کہ وہ اسے فریب سمجھ کر کھاتا رہا ۶۰۔ مجاز کی لیرک کے بیک وقت رومانوی اور انقلابی ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس میں دورِ حاضر کی وہ آگہی موجود تھی جو فریب رنگ و بو کو سمجھتی ہے۔ اسی شعور نے اسے اپنے عہد کے رومانوی شعرا سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کا جذبہ عشق ایک جذبہ انقلابی ہے اور اس کی فریب خوردگی حقیقت آشنا ہے۔ مجاز کی کوئی بھی غزل یا نظم عشق ومحبت کی واردات سے متعلق ایسی نہیں ہے جس میں اس کا نیا انقلابی شعور موجود نہ ہو۔

سعادت حسن منٹو اپنے افسانوں کی وجہ سے متنازعہ رہے ہیں۔ ان پر فحش نگاری کا الزام بھی عاید کیا جاتا ہے۔ ممتاز حسین نے ''منٹو کی یاد میں'' لکھ کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے اس کے افسانوں کے تلخ اور ترش ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ ہم لوگوں سے زیادہ حسّاس اور ذہین واقع ہوا تھا۔ اس کا ردّعمل اور اس کی گرفت یہ دونوں ہی ہم لوگوں سے زیادہ تیز اور چست تھی۔ منٹو ایک بڑا فن کار تھا اور یہ بڑائی اس کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں کم پائی جاتی ہے خواہ وہ اردو میں لکھتے ہوں یا ہندی میں۔ ۶۱

''یزید'' منٹو کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے متعلق ممتاز حسین رقم طراز ہیں: ''میں نے منٹو کے مجموعہ ''یزید'' کا انتخاب اس غرض سے کیا ہے کہ اس میں چند کہانیاں ایک ایسے موضوع سے متعلق ہیں جن کا دائرۂ عمل کافی وسیع ہے۔ وہ موضوع قیام پاکستان یا تقسیم کا نفسیاتی ردعمل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان کے سیاسی اور اقتصادی مسائل تقسیم کے نفسیاتی ردعمل سے زیادہ اہم ہیں۔ تاہم اس نفسیاتی ردعمل کو بھی ایک اچھا خاصا اہم موضوع قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۶۲

''غالب —ایک تہذیبی قوت'' میں ممتاز حسین نے بتایا کہ غالب ایک آفاقی شاعر ہیں۔ وہ پوری انسانیت کے ترجمان ہیں۔ غالب کی وسیع النظری اور نفسیاتی ژرف بینی دونوں ہی لائق تحسین ہیں اور ان کے بقائے دوام کی ضامن ہیں۔ ان کے کلام کو جاننے کے لیے اس کی تاریخی اہمیت کو جاننا بھی نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہماری تحسین کو تحسین ناشناس بن کر رہ جانے کا خطرہ ہے۔ ہماری روشن خیالی اور ہمارے جدید ادب دونوں ہی کا آغاز غالب ہی کی نثر و نظم سے ہوتا ہے۔[۶۳]

''حالی اردو کا پہلا نقاد؟'' میں ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ حالی کے زمانے سے پہلے ہماری ادبی تنقید بنیادی حیثیت سے مذاقِ سخن کی تنقید تک محدود تھی یا پھر خالصتاً فنی تنقید تھی۔ میر تقی میرؔ ان دونوں کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، ہر چند کہ ان کی عصبیتیں بھی غضب کی تھیں۔ اسی طرح میر حسنؔ، غالبؔ اور شیفتہؔ کو بھی ان چیزوں میں بڑا ادرک تھا۔ حالی ان سے بہت مستفیض رہے ہیں۔ حالی کی تنقید اور ان کی نظمیں اس عبوری دور کی ہیں جب ہمارے مصلحین قوم، سر سید اور ان کے رفقا ہمیں ترقی کا ایک نیا راستہ دکھلا رہے تھے۔ منقولات کو معقولات کی کسوٹیوں پر پرکھ رہے تھے۔ یہ شرف حالی ہی کو پہنچتا ہے کہ انھوں نے ہی سب سے پہلے ہمارے مسلمات شاعری کی تنقید کی اور انھوں نے ہی سب سے پہلے ہمارے تنقیدی ادب میں ادب اور سوسائٹی کے رشتے کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔[۶۴]

''کردار نگاری'' میں ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ یوں تو افسانہ نگاروں کے درمیان یہ احساس عام ہے کہ کہانی بغیر کردار کے نہیں چل پاتی ہے مگر بہت کم لوگوں پر واضح ہے کہ کردار کے کیا معنی ہیں۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے انفرادیت اور کیرکٹر کے فرق کو سمجھنے پر بھی زور دیا ہے کیوں کہ بہت سے افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں افراد یا منفی کیریکٹر تو پیش کر پاتے ہیں لیکن کیرکٹر پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک ایسی کہانی کا حوالہ دیا ہے جسے عام طور پر کیرکٹر اسٹوری کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کہانی ہے ''کالو بھنگی''۔ ممتاز حسین کے بقول کالو بھنگی میں بھنگیوں کی دوسری قدروں کے مشترک ہونے کے باوجود اسے ایک کردار کا بھی حامل بتایا نہیں جا سکتا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ثبوت اور دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ مختلف پہلوؤں سے سمجھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ کیرکٹر فرد ہی ہوتا ہے اس لیے اس میں اس کی انفرادیت پائی جاتی ہے لیکن ہر فرد باوجود اپنی انفرادیت کے کیرکٹر نہیں ہوا کرتا۔[۶۵]

''قومیت کے معمار — ادیب'' میں ممتاز حسین نے ادیب کی قومی اور بین الاقوامی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ان کے بقول ادیب قومیت کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے، اپنی قوم کے انفرادی خدوخال کو ابھارتا ہے، اس کی روحانی اور مادی ترقی کی منزلوں کا تعین کرتا ہے، اسے ایک نصب العین دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ بہ یک وقت پوری انسانیت کا بھی ترجمان ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی قوم کی انفرادیت ہی کو ابھارتا ہے بلکہ سارے عالم کے اقوام کی مشترکہ خصوصیات کو بھی ابھارتا ہے۔ ۶۶

نئے تنقیدی گوشے:

ممتاز حسین کی یہ کتاب یونین پرنٹنگ پریس دلی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ دوسو پینسٹھ صفحات پر مشتمل یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں تین مضامین ''سائنس اور اخلاقی نظام''، ''رجعت پسند ادب کیا ہے''، اور ''صورت و معنی'' شامل ہیں۔ حصہ دوئم چار مضامین ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق''، ''تنقید اور اپنی تنقید''، ''اپنی تنقید'' اور ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق (ایک ڈیموگاگی کا تجزیہ) پر مشتمل ہے۔ حصہ سوئم میں چار مضامین ''افلاطون کا نظریۂ جمالیات''، ''ارسطو کا نظریۂ جمالیات''، ''فلوطینس کا نظریۂ جمالیات'' اور ''سینٹ اگسٹائن کا نظریۂ جمالیات'' شامل ہیں۔ حصہ چہارم میں ''ہمارے افسانوی ادب کے چند رجحانات''، ''حالی کا نقطۂ نظر'' اور ''انسان اور حیوان'' کے عناوین کے تحت تین مضامین شامل ہیں۔ آئندہ سطور میں اس کتاب کے مختلف ابواب کا مختصراً جائزہ پیش کیا جائے گا۔

''سائنس اور اخلاقی نظام'' میں ممتاز حسین نے اس نکتے پر روشنی ڈالی ہے کہ سائنس پر یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ یہ معاشرے کی تنظیم کے لیے کوئی حل پیش نہیں کرتی ہے مگر یہ الزام درست نہیں کیوں کہ سائنس کی پیغمبرانہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اخلاقیات کی درستگی کا بھی کام کرے۔ سائنس تو ایک بے جان سی شے ہے۔ اس کو ٹھیک سے کام میں لانے کی ذمہ داری انسانوں کی ہے۔ سائنس کی تو بے شمار برکتیں ہیں لیکن سرمایہ دار طبقے نے سائنس کو انسانی معاشرے کی بہبودی کے لیے استعمال نہیں کیا۔ ۶۷

مضمون ''رجعت پسند ادب کیا ہے'' میں بحث کا آغاز کرتے ہوئے ممتاز حسین نے پہلے تو ترقی پسندی اور رجعت پسندی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''وہ قومیں جو شے کی تعمیر میں حصہ لیتی ہیں

انہیں ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو قومیں پرانے اقدار کو سینے سے لگائے رہتی ہیں، نئے کو بڑھنے سے روکتی ہیں اور نئے اور پرانے کا حل ماضی میں ڈھونڈتی ہیں انہیں ہم رجعت پسند کہتے ہیں۔ ادب میں رجعت پسندی کے رجحان کو انھوں نے ٹھیک نہیں مانا ہے۔ ماضی کی طرف لوٹنے کا مطلب ہے کہ مستقبل کی تعمیر سے ہچکنا۔ پورے مضمون میں انھوں نے رجعت پسندی کے اسباب وعلل، اس کے اثرات پر غور کیا ہے۔ انھوں نے فلابیر، آسکر وائلڈ، ملارمی، پال ویلری، ڈی ایچ لارنس وغیرہ کے افکار سے بحث کرتے ہوئے نشاۃ ثانیہ کے ادب کی تعریف کی ہے۔ ممتاز حسین ایسی انقلاب پسندی کے بھی مخالف ہیں اور اس کو رجعت پسندی سمجھتے ہیں جو ماضی کو بلاتفریق مٹانا چاہتی ہو، جو انقلاب برائے انقلاب کی مدعی ہو۔ ۶۸

''صورت ومعنی میں'' ممتاز حسین کا خیال ہے کہ ادب میں صورت اور معنی کے آپسی رشتے کو سائنسی طور پر دریافت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ سب سے پہلے اس پر عینیت پسند اسکول نے روشنی ڈالی ہے۔ جدلیاتی اسکول کے وجود میں آنے کے بعد ہی اس پر اچھی طرح سے روشنی پڑی ہے۔ عینیت پسند اسکول خیال اور مادے کے باہمی رشتوں کو اس طرح سمجھتا ہے کہ خیال مادے کو حرکت میں لاتا ہے۔ اسی منطق کے تحت ارسطو نے صورت ہی کو فن کا محرک بتایا ہے۔ جدید سائنسی اور سماجی معلومات نے سماجی زندگی اور مادّے کے بارے میں نئی تحقیقات کی ہیں۔ دنیا کی تمام چیزیں مادی ہیں۔ انسانی ذہن مادے کی پیداوار ہے اور انسانی خیال مادی حقائق کا ایک عکس ہے جو مادے پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ سماجی زندگی میں مادے اور خیال کے اس جدلیاتی عمل کو ہم انسانی عمل ہی کے ذریعے محسوس کرتے ہیں۔ جس طرح خیال اور مادے، سماجی شعور اور زندگی کا باہمی عمل جدلیاتی ہے یعنی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح صورت ومعنی کا عمل بھی جدلیاتی ہے لیکن ہر صورت میں جس طرح مادہ مقدم ہے خیال پر اور زندگی مقدم ہے سماجی شعور پر اسی طرح معنی مقدم ہے صورت پر۔

کسی بھی قوم کے لیے ماضی کا ادب اس کا بیش بہا سرمایہ ہوتا ہے۔ اس ادب کی پہچان نہایت ضروری ہے۔ فکری تحریکیں ادب پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ان کا مطالعہ مع ان کی منطق کے بہت ضروری ہے۔ فکری تحقیقیں اس لیے بھی ضروری ہیں کہ وہ ایک مخصوص عہد کے نقطۂ نگاہ اور ادراک حقیقت

کا پتہ دیتی ہیں۔ ادب خارجی حقیقت کا آئینہ ہے۔ ادب ادراک حقیقت میں مدد بھی کرتا ہے۔ ان ہی معنوں میں ادب ہمارے جسمانی، ذہنی اور جذباتی زندگی کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی مدد سے کسی زمانے کی تاریخ پورے سماج کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے جو حقیقت میں نئے اور پرانے کی جنگ کی تاریخ ہوتی ہے۔ ماضی کی صحت مند روایات ہمارے مستقبل کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ماضی کی صحت مند روایات کو حقارت سے دیکھنے کا جذبہ دراصل تاریخ کو مٹانے کا جذبہ ہے اور تاریخ کو وہی مٹاتا ہے جس میں کچھ احساس کمتری ہوتا ہے۔ ان ہی نکات کو ممتاز حسین نے اپنے مضمون ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق'' میں زیر بحث لایا ہے ان کے مطابق سماجی ارتقا کے قوانین کے میکانکی پر اور بھونڈے طور پر اطلاق سے نہ صرف ادب کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ انقلابی قوتیں بھی کم زور ہو جاتی ہیں۔[۶۹]

''تنقید اور اپنی تنقید'' دراصل ممتاز حسین کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے محمد مہدی (بمبئی) کے یکم دسمبر ۱۹۴۹ء کو ''محاذ'' میں شائع شدہ مضمون کے جواب میں لکھا ہے۔ محمد مہدی نے ممتاز حسین کے ''مضمون ادب عالیہ سے متعلق'' پر کچھ اعتراضات درج کیے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''معمولی سمجھ بوجھ کا انسان تو یہی سمجھ نہیں پاتا ہے کہ موصوف کا مضمون ادب عالیہ سے متعلق ہے یا صوفی شعراء سے متعلق یا تصوف کی موشگافیوں سے ادب کو پرکھنے کے طریقے سے متعلق''۔ ممتاز حسین نے ان کی اس کوشش کو سراہا ہے۔ اسی پس منظر میں مضمون کے شروع میں ہی انھوں نے کہا ہے ادب میں تنقید کے بلند معیار کو قائم کرنے اور جمالیات کو سائنس کے درجے تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ دوسروں کی اور خود اپنی تنقید کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تاریخ، فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔[۷۰]

اپنی تنقید'' بہت مختصر مضمون ہے۔ اس میں بقول خود انھوں نے بالکل غیر جانب دار ہو کر اپنے مضمون کی تنقید کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے مضمون پر محمد مہدی صاحب کا اعتراض صحیح نہیں ہے۔

''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق (ایک ڈیموگاگی کا تجزیہ)'' ممتاز حسین کا طویل اور پر مغز مضمون ہے۔ یہ مضمون بھی دراصل ان کے مضمون پر تنقید اور اعتراض کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ ممتاز حسین خود کہتے ہیں: ''نقوش کے آزادی نمبر میں میرا ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق''۔ اس مضمون پر مختلف دوستوں نے اظہار رائے کیا ہے۔ میں ان سب کی قدر کرتا ہوں لیکن

چوں کہ میں غلط نظریے کی قدر نہیں کرسکتا اس لیے اس مضمون سے متعلق جو دو مضامین ''محاذ'' کے پرچے میں چھپے ہیں ان پر اظہار رائے کرنا میں نے ضروری سمجھا۔ ایک مضمون تو محمد مہدی کا تھا اور دوسرا مضمون مجروح سلطان پوری کا۔ ان دونوں مضامین کی نوعیت قدرے مختلف ہے، گو بہت سی غلطیاں دونوں میں مشترک ہیں۔ محمد مہدی کے مضمون میں جو خامیاں ہیں وہ ولگر سوشیالوجی، اقتصادیت پرستی اور غیر تاریخی مادیت کی ہیں۔ چنانچہ اس مضمون میں میں نے ایک مضمون ''اپنی تنقید'' کے عنوان سے شاہراہ کے سالنامے میں برائے اشاعت بھیجا۔ مجروح سلطان پوری کا مضمون اس وقت دیکھنے میں آیا جب کہ میں وہ مضمون بھیج چکا تھا۔ اس لیے ایک دوسرے مضمون کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ عوام کو بہکانے والی تقریر کے خطرے اور اقتصادیت پرستی Economicism کے نظریے سے لوگوں کو آگاہ کیا جا سکے۔''۱؎

''افلاطون کا نظریہ جمالیات'' ممتاز حسین کا مختصر مضمون ہے۔ اس میں ممتاز حسین نے افلاطون کے نظریۂ جمالیات کو سقراط اور ہپ پی ایس کے درمیان مکالمے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ افلاطون نے خدا کو خالق دائم اور غیر متحرک بتایا بلکہ کائنات کو حقیقت کا عکس بتا کر کائنات کو بے معنی کر دیا۔ اس نے نہ صرف دنیا کو بے اعتبار ثابت کیا بلکہ انسانی حواس کو بھی بے اعتبار بتایا۔ ممتاز حسین نے اس کا سبب یہ بتایا کہ افلاطون چوں کہ روحانی فلسفے کا شکار تھا اس لیے وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ مادی اشیا بھی حسین ہیں اس لیے وہ آگے چل کر حسن کو وجود باری اور وجود اعتباری میں تقسیم کرتا ہے۔۲؎

ارسطو کا نظریہ جمالیات: ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے استاد کے نظریے سے اختلاف بھی کیا ہے۔ افلاطون نے شعر کو ماورائی حقیقت کی نقل بتایا ہے اور اس کو جانچنے کا معیار ماورائے حقیقت کو ٹھہرایا ہے۔ لیکن ارسطو افلاطون کے اس خیال سے متفق نہیں ہے۔ اس کے خیال میں نقل اتارنا بذات خود ایک تفریحی جذبہ ہے۔ افلاطون کے اس خیال کا کہ المیہ میں سفلی جذبات کی بھی تصویر موجود ہوتی ہے، اس لیے یہ ادب کے درجے سے گری ہوئی چیز ہے، کا جواب ارسطو نے یوں دیا ہے کہ بدصورت چیزوں کی تصویر کشی بھی حسین چیز ہے اور المیہ میں جو جذبات برانگیختہ نہ کیے جائیں وہ سینے میں دفن رہتے ہیں اور انسان زیادہ جذباتی رہتا ہے بصورت دیگر انسان کم جذباتی ہوتا ہے۔۳؎

فلوطینس کا نظریہ جمالیات: فلوطینس تیسری صدی عیسوی کا تھا۔ اس کی پیدائش مصر میں ہوئی اور اس

نے اسکندریہ کی یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ وہ ایران کے زرتشتی فلسفے سے بھی متاثر تھا۔ اس کا فلسفہ بہت پیچیدہ ہے۔ اس کے فلسفہ میں یونان کے تمام الٰہیاتی اور مادی فلسفے کا نچوڑ ہے۔ کائنات کی تخلیق کے بارے میں اس کا یہ نظریہ ہے کہ کائنات توسیع وحدت کا نام ہے۔فلوطینس کا خیال ہے کہ کسی بھی شے میں حسن دریافت کرنے کی ایک مخصوص صلاحیت ہوتی ہے جو خالص روحانی ہےاور یہ کام روح اس لیے کرتی ہے کہ وہ حسن کو مادے سے الگ کرکے دیکھ لیتی ہے۔۴ے

سینٹ آگسٹائن کا نظریہ جمالیات: قرون وسطیٰ میں یورپ کے تاریک دور کی ظلمت اس وقت ختم ہوئی جب یونانی علوم کا احیاء ہوا۔ اس دور میں اگر فلسفہ پر افلاطون کا اثر تھا تو ادب اور جمالیات پر نوافلاطونی نظریہ کا یا سینٹ آگسٹائن کا نظریہ مستند مانا جاتا تھا۔ سینٹ آگسٹائن ادب کو حقیقت کے اظہار میں ایک پردہ تصور کرتا ہے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ اصل حقیقت یعنی روحانی حقیقت کی مصوری میں ادب رموز اور تمثیل کے ذریعہ ہی رہ نمائی کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریک صدیوں کے ادب کی نوعیت ذومعنی قسم کی تھی۔ ایک مجازی معنی لیے جاتے دوسرے حقیقی۔ مسیحی ملکوں میں تیرہویں صدی تک سینٹ اگسٹائن کا اثر بہت قوی رہا اور یہ اثر اس وقت تک زائل نہیں ہوا جب تک کہ اطالیہ کے بڑھتے ہوئے تاجر طبقے نے علم وادب کو فروغ نہیں دیا۔۵ے

''ہمارے افسانوی ادب کے چند رجحانات'' میں ممتاز حسین نے اردو ادب میں رائج رجحانات اور بطور خاص ترقی پسند تحریک کا ذکر کیا ہے۔ بقول ممتاز حسین اردو کے نئے افسانوی ادب کی ابتدا ترقی پسند تحریک کے جلو میں ہوئی۔ اس مضمون میں انھوں نے ان بنیادی رجحانات کو پیش کیا ہے جن کے گرد ہمارا افسانوی ادب گھومتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بیدی اور کرشن چندر کے فن کا موازنہ کیا ہے۔ بعد ازاں انھوں نے عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور قرۃ العین حیدر کے فن کا جائزہ لیا ہے۔۶ے

مضمون ''حالی کا نقطہ نظر'' کا آغاز ممتاز حسین نے حالی کی ایک مختصر غزل کے ساتھ کی ہے۔ ممتاز حسین کا خیال ہے کہ حالی نے اپنی شاعری میں ان باتوں سے بھی پرہیز نہ کی جس کو کہنے سے لوگ اب تک خوف زدہ تھے۔ انھوں نے مغرب سے اٹھنے والی اس آواز پر لبیک کہا جس میں اس عقیدے کو کہ انسان کا وجود کسی ازلی گناہ کا مرہون منت ہے اور اس کی صفات حقیقی نہیں بلکہ خالق کی صفات سے

مستعار ہیں باطل قرار دیا۔ ایشیا کا نظام مغرب کی روشنی سے بھرپور طور پر مستفید ہونے کا اہل نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ حالی کو بھی فقیہوں کا خوف تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں اقرار ''وجود آدم'' کے گناہ کا اعتراف نہ رہا۔

مسلمان نہ ہم کاش حالی کو کہتے   ہوئے بات کہہ کر گنہگار واعظ

''انسان اور حیوان'' میں ممتاز حسین نے سرمایہ دارانہ نظام کے اس انحطاط کے آخری درجے کا ذکر کیا ہے جہاں پہنچ کر اگر وہ ایک طرف ایٹم بم اور جراثیمی ہتھیار کے ذریعے پوری انسانیت کو تباہ و برباد کرنے کی دھمکی دے رہا ہے تو دوسری طرف نسل انسانی کو اشرف المخلوقات کے درجے سے گرا کر حیوانیت کے مقام پر پہنچا رہا ہے۔ یہ دونوں چیزیں فسطائیت کے مظاہر ہیں کیوں کہ انسانوں کو تباہ کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انھیں حیوان نہ بنایا جائے اور پھر ان حیوانوں کی ایک ایسی پلٹن تیار کی جائے جو سفاکی اور بربریت میں درندوں پر بھی سبقت نہ لے جائیں۔ انھوں نے بورژوا مفکرین کے خیالات کو گرفت میں لاتے ہوئے ان کی سخت تنقید کی ہے۔ ان کے بقول بورژوا مفکرین انسان کی حیوانی خصوصیات مثلاً جہل، ظلم، جنگ جوئی کی خصلت کو ازلی اور ابدی بتاتے ہیں۔ وہ انسان کی عقل اور شعور اور تہذیبی خصوصیات کو عارضی بتاتے ہیں۔ اسی چیز کی بنیاد پر وہ انسان کی فطرت کو ناقابل تغیر بتاتے ہیں۔ انسانی عقل و شعور، آرٹ، کلچر اور سائنس کی مخالفت کرتے ہیں۔ ۷۷

غالب: ایک مطالعہ

زیر نظر تصنیف غالب کی صد سالہ برسی پر انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے انجمن پریس کراچی سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ''حرف آغاز''، ''تاریخ کی رزم گاہ میں غالب کا موقف''، ''غالب کا ردعمل''، ''غالب کا آئینہ فن''، ''احساس طرب اور طنز'' اور احساس غم'' کے عناوین کے تحت کل چھے ابواب ہیں۔

''حرف آغاز'' میں غالب کی سوویں برسی کے موقع پر ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ممتاز حسین رقم طراز ہیں: ''جو آگ کہ غالب اپنی نوائے شررفشاں سے اس خاکداں کو دے گیا وہ

امتدادِ زمانہ سے مدھم پڑنے کے بجائے روز بہ روز زیادہ شعلہ فگن ہوتی جارہی ہے۔ یوں تو ممتاز حسین میرؔ کے بھی مداح ہیں لیکن وہ میرؔ کے یہاں غالب جیسی خوبیاں نہیں پاتے۔ کہتے ہیں: ''یوں تو میرؔ سا معجز نگار بھی شعلہ فشاں گذرا ہے۔ اس کا پنجہ زرنگار پنجۂ خورشید میں ہر صبح ہے۔ لیکن اس کا داغِ دل شبنم گریہ سے اس قدر خنک تاب ہے کہ وہ روکش ماہتاب تو ہے، خورشید کا اس پر گماں نہیں۔ میرؔ اور غالبؔ کا یہی بنیادی فرق ہے۔ میر طلسم ماہ کا اسیر، غالب اقلیم خورشید کا سفیر، ایک اس شش جہت میں حیرت زدہ بصورت تصویر، دوسرا سرگرم جستجو، دل مت گنوا، خبر نہ سہی سیر ہی سہی، ایک گرفتار طلسم شوق، غوطہ زن سراب الفت، دوسرا آتش زیر پا، بیرون حلقہ سلاسل، سرگرم جولاں......''۸ے

غالب کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ممتاز حسین کہتے ہیں کہ ہر وہ خیال جو ہمارے شعر وادب، قوت وتوانائی کا حامل ہے، ہر وہ نکتہ ادا جو سحر کاری فن سے عبارت ہے اس کا ایک رشتہ غالب کی فکر اور فن سے ضرور ہے۔ غالب ہی کے شعر سے ایک نئی جمالیات نے ہمارے ادب کی دنیا میں جنم لیا ہے۔ غالب کا عہد تقلید کے برخلاف تنقید کا تھا۔

غالب نے غم زمانہ کے ساتھ ساتھ حیات وکائنات کے فلسفے کو بھی غزل میں برتا۔ غالب نے ایک نئے محاورے میں گفتگو کی۔ انھوں نے فارسی محاروں کو چھوڑ کر اردو ہی میں تجربے کرنے شروع کیے۔ شعرا کی عام روش تشابہات سے ہٹ کر غالب نے متجانس اشیا کے درمیان عدم مشابہت سے شعری اثر پیدا کرنے کی روش قائم کی:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　　جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

اور کہیں کہیں تو انھوں نے ایک ہی شعر میں مشابہت اور عدم مشابہت دونوں ہی سے اثر پیدا کیا ہے:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے　　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

غالب کے اس طرزِ فکر سے اٹھارہویں صدی کی شعری روایت نابلد تھی۔ ہمارے شعرا دعوے اور دلیل سے تو باخبر تھے، تضاد اور طباق کی صنعت سے بھی کام لیتے لیکن منافات کے استعمال سے جس سے ایک پیراڈاکس کی کیفیت پیدا ہوتی ہے شعری اثر پیدا کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ غالب کو اس فن میں

مہارت حاصل تھی۔

غالبؔ کی نظم ونثر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں انھوں نے اپنی نثر کو فلابیر کی طرح شعر کا آہنگ دیا ہے وہاں انھوں نے اپنے شعر کو نثر کا بھی آہنگ دیا ہے۔نثر کے آہنگ سے مراد ہے الفاظ کی نثر سی ترتیب۔غزلوں کے مقطع کے چند اشعار دیکھیے:

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالبؔ کو نہ جانے شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی!!

غالب کی شاعری میں سہل ممتنع کے اشعار ملتے ہیں اس کا دعویٰ انھوں نے اپنے خط میں کیا ہے۔ حالیؔ نے ان کے سہل ممتنع کو ان کی سادگی پر محمول کیا۔غالب کے اسلوب پر لکھتے ہوئے حسن سادگی یعنی تقطر خیال اور جامعیت پر بھی دھیان دینا ضروری ہے۔غالب کے یہاں آئیڈیلزم بھی ہے جسے انقلابی رومانیت یا رومانی بغاوت کا نام دیا جاتا ہے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود غالب کے فن کا طریق عمل رومانی شعرا کے طریق عمل اور ان کے طرز بیان سے مختلف ہے۔ان کے یہاں افراط تخیل کے بجائے تقطر خیال ہے۔ان کا ایک لفظ ایک جملے کے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔اس میں جامعیت اختصار و اجمال ہے نہ کہ طول کلام، تکرار اور تضیع الفاظ۔۷۹

''تاریخ کی رزم گاہ سے غالب کا موقف'' اس کتاب کا پہلا باب ہے۔اس میں ممتاز حسین نے غالب کی پیدائش کے وقت دلی اور اطراف دلی کے سیاسی انتشار کا ذکر کیا ہے۔اسی انتشار اور بحران کے زمانے میں دسمبر ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں غالب کی ولادت ہوئی۔انگریزوں کی قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔ انھوں نے ہندوستانی لشکر کی مدد سے ہی ہندوستان کو فتح کیا۔اس سیاسی افلاس کے نتیجے میں شعراء انگریزوں کی مختاری سے لرزاں ہوکر یا تو مقدر کا المیہ لکھ رہے تھے یا لکھنؤ کے نواب کے دربار میں انگریز ریذیڈنٹ کے زیر سایہ ریختی کی دھوم مچا رہے تھے جس میں آپا دھاپی، دھما چوکڑی، مسخرگی، شہدا پن اور عیاشی کے چونچلوں کی بہار تھی۔ٹھیک اسی وقت یورپ میں گوئٹے اپنے مشہور عالم ڈرامے ''فاؤسٹ'' کا پہلا حصہ لکھ رہا تھا جس میں حقیقت کے اظہار پر زور دیا گیا تھا۔۸۰

انگریزی اقتدار کے نتیجے میں ہندوستانی سیاست، سماج اور معیشت میں تخریب کا عمل جاری تھا۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر تخریب کا عمل کرب اور ابتلا کا ہوتا ہے خواہ تخریب معاشرہ کے اندرونی عمل سے وجود میں آتی ہو یا کوئی بیرونی طاقت اس عمل کو انجام دے۔ فرق بس اتنا ہے کہ جب یہ عمل کسی معاشرہ کے اندر اس کے اپنے لوگوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے تو اول وہ تخریبی عمل زیادہ متشدد نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ وہ اسی وقت تک وجود ہی میں نہیں آتا ہے جب تک کہ تعمیری قوت پرانے نظام کے بطن سے جنم نہیں لیتی۔

برصغیر ہند کی معاشرت کا سنگ بنیاد ہزاروں سال سے خود کفیل دیہی نظام تھا۔ انگریزی حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے یہ نظام درہم برہم ہو گیا۔ انگریزوں نے اپنی عمل داری کے پہلے دور سے لے کر (۱۸۱۳-۱۷۶۵ء) دوسرے دور (۱۸۵۷-۱۸۱۳ء) تک جو تبدیلیاں ہندوستانی معاشرت میں پیدا کیں وہ ان کے پست محرکات اور ذلیل عزائم کے تحت تھیں۔ ان کا مقصد برصغیر کی دولت سمیٹنا اور ولایت کے صنعتی مال کی کھپت کے لیے برصغیر کو ایک نوآبادیاتی بازار میں تبدیل کرنا تھا۔ لیکن اس کے جو نتائج نکلے وہ اس کے مقاصد سے ہم آہنگ نہ تھے۔ وہ نتائج برصغیر کی سیاسی وحدت کے استحکام اور اس کی صنعتی ترقی دونوں کے حق میں مفید ثابت ہوئے۔ انگریزوں نے دیہی نظام کو سرمایے کی اقتصادیات کے نفاذ اور بھاپ کی طاقت سے چلنے والی مشینوں سے تباہ و برباد کیا۔ اس سے عوام کو یقیناً مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن نیا نظام اپنے ساتھ جو تبدیلیاں لایا اس کے اثرات ہندوستانیوں پر مثبت بھی ثابت ہوئے۔

نیا سیاسی نظام اپنے ساتھ سیاسی وحدت لے کر آیا۔ اس نظام میں آمد و رفت کے ذرائع میں ترقی آئی۔ نظام حکمرانی چست درست ہوا۔ اس نے ٹھگی، ڈکیتی کی فضا کو ختم کر دیا۔ ہندوستان اور یورپ کے درمیان براہِ راست تعلقات قائم ہوئے۔ بھاپ کے انجن سے چلنے والے کارخانے قائم ہوئے۔ دخانی کشتیاں گنگا میں تیرنے لگیں۔ بھاپ کے انجن کا کاغذ کا کارخانہ ۱۸۲۰ء میں قائم ہوا اور گنگا میں اسٹیمر ۱۸۲۸ء میں چلنا شروع ہوا۔

اسی زمانے میں انگریزی تعلیم کے لیے ۱۸۱۶ء میں ایک کالج بنارس میں اور ۱۸۱۷ء میں ایک کالج کلکتے میں قائم ہوا۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ خیالات کی ترویج و اشاعت اور تنقید کا نیا ذریعہ یعنی اخبار بھی لوگوں کے ہاتھ آیا۔ اس سے ہر قسم کے خیالات کی تبلیغ و اشاعت ہونے لگی۔ جس زمانے میں غالب کا قیام

کلکتے میں رہا (فروری ۱۸۲۸ء تا نومبر ۱۸۲۹ء) اس وقت رام موہن رائے کی تحریک پورے شباب پر تھی۔ انھوں نے ہندو مذہب کو بت پرستی اور اوہام پرستی سے پاک کر کے ۱۸۲۸ء میں ایک نیا فرقہ ''برہموسبھا'' قائم کیا جس کی بنیاد نہ صرف ویدانتی فلسفہ پر تھی بلکہ عالم گیر انسانیت پر بھی تھی۔ اس ادارے نے عیسائی مشنری کو بھی اپنے خیالات سے متاثر کیا۔

انگریزوں نے ہندوستان کو بہت سے ایسے تصورات سے آشنا کیا جن کے عمل پزیر ہونے سے ہندوستانی سماج میں بڑی تبدیلی آئی۔ آزاد عدلیہ کا قیام اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی ۸۱۔ اس نے قانون کی نظر میں ہر شخص کو مساوی قرار دیا۔ ۱۸۳۴ء کے بعد انگلستان میں متوسط طبقہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد لارڈ میکالے نے ایک کمیشن قائم کر کے انضباط قوانین کے سلسلے میں کام کیا جس سے یکسانیت کا تصور عام ہوا۔ عدم یکسانیت کو ختم کرنے کے لیے شخصی آزادی کو بھی وسعت دینے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں دختر کشی اور غلامی کی رسومات کو ختم کیا گیا۔ تبدیلی مذہب کے بعد بھی کسی بھی شخص کے لیے جائداد میں وراثت کے حق کو محفوظ کیا گیا۔ انگریزوں سے قبل قتل ایک شخصی جرم تھا نہ کہ عوامی۔ انگریزوں نے قتل کو عوامی جرم قرار دیا۔ اب کوئی بھی خوں بہا ارادتاً قتل کو دھو نہیں سکتا تھا۔ سزا کے طور پر انسانی اعضاء کو تکلیف پہنچانے، آگ میں ڈالنے، دیوار میں چننے، ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلے جانے کو موقوف کر دیا گیا۔ عقد بیوگان ہندوستانی سماج کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ انگریزوں نے عورتوں کو اس سماجی ظلم سے انصاف دلایا۔

کتاب کے دوسرے باب ''غالب کا ردعمل'' میں ممتاز حسین نے انگریزی عمل داری میں بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کے پیش نظر غالب کے ردعمل سے واقفیت کرائی ہے۔ غالب آئین نو سے ڈرنے اور طرز کہن پر اڑنے والے نہیں تھے۔ انھوں نے نئے حالات کا استقبال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے جب ان سے اپنی تصحیح شدہ کتاب ''آئین اکبری'' پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے اپنی تقریظ میں انگریزوں کی قانون پسندی اور ان کے دانش مندانہ اقدامات کی داد دی ہے۔ انھوں نے انگریزوں کی ہنر مندیوں کے کرشمے کی تعریف کی ہے۔ اس میں انھوں نے کہیں بھی خوشامد یا مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ سرسید کے کام کو انھوں نے قطعاً نہیں سراہا بلکہ ''مردہ پروردن مبارک کار نیست'' کہہ کر ان پر مردہ پرستی کا الزام بھی لگایا۔ عظمت شب کے دباؤ کے باوجود شاعری میں ان کی نظر مستقبل پر رہتی

ہے۔ وہ غم کو خوشی اور خوشی کو غم سے جدا تصور نہیں کرتے۔

ہر گونہ حسرت کہ زایام می کشم   دُرد تہ پیالۂ امید بودہ است

مغرب سے روشن خیالی کی جو ہوا آئی اس کا بنگال کے ہندوؤں نے کھلے دل سے استقبال کیا۔ رام موہن رائے کی قیادت میں انھوں نے اس کا پُر زور خیر مقدم کیا۔ مسلمانوں میں کھلے دل سے اس کا استقبال کرنے والوں میں غالب پہلے شخص تھے۔ اولین دور میں وہ مجرد خیالات کی دنیا میں اسیر تھے جو انھیں وراثتاً فارسی شاعری سے ملے تھے۔ وہ خیالی مضامین کو نظم کیا کرتے تھے۔ ان کے اپنے مشاہدات اور محسوسات کو کم دخل تھا۔ یہ کمزوری سفر کلکتہ کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں انھوں نے کلکتے میں ولایت کی برکتوں کو قریب سے دیکھا تھا جہاں گیس کی روشنی سے منور شہر نئی عمارتوں سے مزین تھا۔ وہیں انھوں نے دخانی کشتیاں بھی دیکھیں۔ اس سفر سے ان کے خیالات میں جو تبدیلی آئی ہے اس کا اظہار انھوں نے اپنی متعدد غزلوں میں کیا ہے[۸۲]۔ مثال کے لیے یہ اشعار:

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند   شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

رفتم کہ کہنگی زتماشا بر افگنم   در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

اور یہ شعر تو خاص اہمیت کا حامل ہے۔

دلم درکعبہ از تنگی گرفت آوارۂ خواہم   کہ با من وسعت بت خانہ ہائے ہندوچیں گوید

مغرب کے علوم وفنون اور خرد کے اس نئے ظہور نے غالب کی تخئیل کو ایک نئی وسعت دی، نئی بلندی اور پرواز بخشی۔

''غالب کا آئینۂ فن'' میں ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ غالب نے مشرقی علوم کا کھلے دل سے استقبال کیا اور اس پر بھروسہ کیا۔ انھوں نے برصغیر میں اس سماجی انقلاب کو قبول کیا جو پوری انسانیت کے لیے ضروری تھا۔ غالب کے فکر سے ہمارے نئے خیالات کا رشتہ ملتا ہے۔ غالب کا فن شعر صیقل آئینہ ہے نہ کہ مصوری یا نقالی۔

یک الفت بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں اپنا

حالاں کہ غالب کی طبیعت میں تصوف بھی ہے اور وہ ان مسائل پر گفتگو بھی کرتے ہیں لیکن بنیادی حیثیت سے وہ اپنی شخصیت اور شاعری دونوں میں ایک شاعر یا مابعد الطبعیاتی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری

میں انبساط تعقل ہے۔ وہ صوفیوں کے تصور شعر کے خلاف بھی نظر آتے ہیں۔ صوفی حقیقت کو مجسم صورت میں دیکھنے کا مدعی ہوتا ہے اس لیے وجدان پر زور دیتا ہے۔ غالب بھی کبھی کبھی وجدان کو استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن وہ اس کا ادعا نہیں کرتے کہ انھوں نے ہستیٔ مطلق کے رخ زیبا کو دیکھا ہے۔ ان کے یہاں ادراک ہے نہ کہ مشاہدہ۔[۸۳]

غالب اپنی صلاحیت کے انکشاف سے فن کی طرف آئے اور اس شدت کے ساتھ آئے گویا فن نے ان پر رہزنی کی۔ فن انھیں اپنی دنیا میں لے گیا۔ وہ اسد اللہ خاں رہنے کے بجائے قلمرو فن کے شہری ہو گئے۔ ان کی شخصیت مقتضائے فن کی تابع ہو گئی۔ اس میں کش مکش بھی رہی لیکن آخر کار فن ان پر رہزنی کر کے رہا۔ اس نے انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ غالب اس قسم کی شاعری میں ایک لیریکل شاعر ہیں جہاں شاعر اپنی خواہشات، آرزوؤں، تمناؤں، دکھ، درد اور خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح کی شاعری میں شخصی عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کے یہاں بھی وہ شخصی عنصر موجود ہے۔ غالب کا فن رومانی شعراء کے فن سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ وہ شخصیت کو فن پر غالب نہیں آنے دیتے۔ ان کا فن غیر شخصی ہے جو فن کی اصلی ماہیت ہے، اس سے قریب تر ہے۔

''احساسِ طرب اور طنز'' والے باب میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب نے طنز و مزاح یا کومک سنس کو اپنی شاعری میں کس طرح برتا ہے۔ طنز میں جس کا مذاق اڑایا جاتا ہے، خواہ وہ شخص کوئی بھی ہو، اسے ذکاوت کے معاملے میں شکست دی جاتی ہے۔ اس کو اسی کے اپنے دعوے اور دلیل سے زیر کیا جاتا ہے نہ کہ لپاڈگی سے جو شخص طنز کا کام انجام دیتا ہے وہ اپنے کو یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا ہے۔ وہ اپنے کو پستی میں لے جاتا ہے تاکہ متقابل اور بڑھ چڑھ کر سامنے آئے۔ اپنے جہل کا مظاہرہ اپنی علمیت سے کرے۔ اب غالب کا یہ شعر دیکھیے:

میں نے کہا کہ بزم یار چاہیے غیر سے تہی   سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یہاں غالب خود اپنا مذاق اڑا رہے ہیں۔ خود کو پستی میں لے گئے ہیں۔

ہابس کا خیال ہے کہ قہقہہ برتری کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور طنزیۂ شاعر اس احساس سے بھی

ہنستا ہے۔ غالب کے طنز کا ایک مخصوص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ہی فطرت کو طنز کا ہدف بناتے ہیں:

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

ارسطو اپنی کتاب اخلاقیات میں طنز کرنے والوں کو سقراط کا نام دیتا ہے جو اپنے کو پستی میں لے جاتے ہیں اور اپنے کو خوبیوں سے معرا بتاتے ہیں جس طرح کہ شیخی خورے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ ارسطو راست گفتار کو اس طنز والے آدمی پر جو اپنی خوبیوں کی تکسیر کرتا ہے، ترجیح دیتا ہے لیکن وہ اس کی قدر ضرور پہچانتا ہے۔ غالب انھیں معنوں میں ہمارے ادب کے سقراط ہیں۔۸۴؎

غالب کے طنز و مزاح میں مختلف طرح کی باتیں ہیں۔ غالب کے مزاح میں دل لگی کی بھی باتیں ہیں خواہ وہ عرض متاع ہنر کی ناقدری ہی کے ردعمل میں کیوں نہ ہو۔ وہ محبوب سے ٹھٹھول کرتے ہیں، پھبتی کستے ہیں، چھیڑ خوانی کرتے ہیں، شرارت کی باتیں کرتے ہیں، جسمانی اشاروں کی زبان استعمال کرتے ہیں۔

غالب اپنے فن میں حقیقت نگار اور منطقی ہیں۔ اپنے حصول مقصد میں مبالغے اور ناممکنات سے کام نہیں لیتے ہیں اور نہ تہی مغزی سے لفظوں سے کھیلتے ہیں۔ ان کا ذہن ہمیشہ مہمل کی منطقیت تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس سفاکی اور دراکی کے باوجود ان کا طنز انسانیت آشنا بھی ہوتا ہے۔ وہ اسے بیگانگی اور مایوسی کے کسی ایسے غار میں نہیں ڈھکیلتے ہیں جہاں برآمد ہونے کے امکانات ہی نہ ہوں۔

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب　　کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

باب ''احساس غم'' میں ممتاز حسین نے غالب کے یہاں احساس غم کے پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ احساس طرب اور طنز کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری میں قوت غم بھی ملتی ہے۔ ان کی فارسی کی غزلوں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں شادمانی، مسرت وانبساط کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس یہ رنگ ان کی اردو غزلوں میں کم ملتا ہے۔ غالب غم کو اس بنیاد پر قبول کرتے ہیں کہ تخریب و تخلیق کے عمل میں ستم اور غم ناگزیر ہے۔ غم میں تخلیق کا ایک ازلی حصہ ہے۔ غم ہی میں شعور ذات ہے اور انسانی جدوجہد غم ہی کو دور کرنے اور نئے سے نئے غم کو اپنے دل میں جگہ دیتے رہنے کا دوسرا نام ہے۔ خندہ اگر سفاک نہیں، تمام تر بے خبری ہے۔ غم اس کے برعکس عالم خبر ہے اور مائل بہ تخلیق ہے صرف وہی خلق کرتا

ہے جوغم کوشدت سے محسوس کرتا ہے۔

غمے کز ازل در سرشت منست بود دوزخ اما بہشت منست

بدیں جادہ کاندیشہ پیمودہ است غم خضر راہ سخن بودہ است

غالب کا یہ تخلیق غم جو اس کے فن کا رہ نما ہے بے شک دانش کے ساتھ ہے ع بدانش غم آموز گار منست ۔یہ غم ان کے اس غم سے بالکل مختلف ہے جسے غم روزگار کہتے ہیں ۔اسکی سطح بہت بلند ہے۔ یہ پردہ کشائے رازِ ہستی ہے۔اس میں چیلنج بھی ہے اور کرب سپردگی بھی۔ ہر موت زندگی کا ایک زیاں ہے، کیوں کہ زندگی منفرد ہے، کثرت ہے۔۸۵

غالب کے اردو دیوان کا پہلا شعر جوغم آفریدہ ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غالب اس کی تشریح یوں کرتے ہیں ''ہستی اگر مثل تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج وملال و آزار ہے۔'' غالب نے اپنے اس غم کو بڑا اخراج عقیدت پیش کیا ہے جو زخم عشق کا کرشمہ ہے،جس نے اس کے جگر کی چھپی ہوئی آگ کو روشن کر دیا۔۸۶

دراں گنج تارو شب ہولناک چراغ طلب کردم از جان پاک

چراغ کہ باشد ز پروانہ دور چراغ کہ بادا ز ہر خانہ دور

زیزداں غم آمد دل افروز من چراغ شب و اختر روز من

اس غم نے غالب کی صرف تخلیقی قوت ہی کو نہیں ابھارا بلکہ اس کی انسانیت اور دل سوزی کو بھی ''میں جس شہر میں رہوں اس میں کوئی ننگا بھوکا نہ ہو۔ نہ یہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بنوں اور نہ یہ بخشائش کہ دونوں ہاتھوں سے زر ہاتھی پر سے برساتا چلوں۔'' غالب کی اس انسان دوستی میں امرائیت کی شان بے شک ہے لیکن اس کی انسان دوستی کا یہی ایک انداز خسر روانہ نہیں ہے۔ وہ انسان اور انسان کے درمیان ہر قسم کی تقسیم کی مخالف تھے۔

امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری

امیر خسرو سے متعلق ممتاز حسین کی یہ تصنیف مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آئی۔ تحقیق کے لحاظ سے یہ کتاب زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں ممتاز حسین نے امیر خسرو سے متعلق نئی باتیں دریافت کی ہیں۔ اس کتاب میں کل چھے ابواب ہیں۔ پہلے باب میں امیر خسرو کے والد کے نام اور اصل وطن کے تعین سے بحث کی گئی ہے۔ ممتاز حسین کہتے ہیں کہ خود امیر خسرو نے اپنے پہلے دیوان ''تحفتہ الصغر'' کے دیباچے میں اپنے والد کا نام لاچین بتایا ہے اور تیسرے دیوان ''غرۃ الکمال'' میں خسرو نے انہیں پدرم سیف الدین شمسی اور پھر بعد میں سیفی کے نام سے یاد کیا ہے۔ انھوں نے اپنے والد کے نام کے سلسلے میں کہیں بھی محمود کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے دورِ حاضر کے مصنفین کے ذریعہ لاچین لفظ کو نظر انداز کر دینے اور سیف الدین کے بجائے سیف الدین محمود استعمال کرنے پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ امیر خسرو کے والد ترکی النسل تھے اور ان کی والدہ ایک نومسلم راجپوت عماد الملک کی بیٹی تھیں۔

دوسرے باب میں ممتاز حسین نے خسرو کے نانا عماد الملک راوت عارضِ سپاہ کے بارے میں مختلف دلائل سے بتایا ہے کہ وہ اصلاً راجپوت تھے۔ چوں کہ خسرو نے انھیں ''رائے'' کے بھی لقب سے یاد کیا ہے لہٰذا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ یا تو راجپوتوں کے کسی حکمراں خاندان سے تعلق رکھتے تھے یا اسیر ہونے سے پہلے خود کسی علاقہ کے راجا یا سردار تھے۔[۸۷]

تیسرے باب میں ممتاز حسین نے یہ بتایا ہے کہ خسرو کی جائے پیدائش پٹیالی نہیں بلکہ دہلی تھی۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے ریاض الشعرا مخطوطہ نیشنل میوزیم کراچی کا حوالہ دیا ہے جو خسرو کی جائے پیدائش دہلی بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عباس اقبال مصنف تاریخ مغول ایران جلد اول کا حوالہ پیش کیا ہے جس میں مصنف نے بتایا ہے کہ خسرو سال ۶۵۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود خسرو کے ایک نعتیہ

قصیدہ میں جائے پیدائش کے طور پر دہلی کا ذکر ہے۔

گرچہ سفا لست از خاک دہلی   بروکار ریحان لطف رضا را

جائے من قبتہ الاسلام   قبلہ خسروان ہفت اقلام(۸۸)

چوتھے باب میں امیر خسرو کی زندگی کا تاریخی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ امیر خسرو ایک ترک ہندوستانی تھے۔ ان کی والدہ ایک راجپوت سردار کی بیٹی تھیں۔ خسرو کے والد امیر شمس الدین ولایت بالا کے ایک ترک تھے۔ ممتاز حسین نے دعویٰ کیا ہے کہ خسرو کی کنیت ابوالحسن لکھی جاتی ہے، جو غلط ہے۔ خسرو کا خطاب شاہی یمین الدین لکھا جاتا ہے لیکن اس کی بھی کوئی تصدیق نہ تو خسرو کے بیان سے ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے کسی معاصر کے بیان سے۔ ان کے ایک چھوٹے بھائی کا نام عزالدین شاہ بتایا جاتا ہے، اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ خسرو چار شہزادوں اور چھے سلاطین کے دربار سے وابستہ رہے۔ ۸۹

پانچویں باب میں امیر خسرو کی ہندوی شاعری کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ خسرو کا مولد دہلی تھا۔ دہلی کے آس پاس میں بولی جانے والی زبان خسرو کی مادری زبان تھی۔ خسرو کی نانیہال، دادھیال میں ہندوی کا چلن تھا اور قرب و جوار کا ماحول ہندوی بولنے والوں کا تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں اور عوام کے ساتھ ہندوی میں گفتگو کرتے ہوں گے۔ ان ہی حقائق کے پیش نظر خسرو نے خود کو ترک ہندوستانیم کہا ہے:

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جو آب   شکر، مصری ندارم کز عرب گویم سخن

انھوں نے اپنی مادری زبان ہندی یا ہندوی بتایا ہے۔

ہست خطا و مغل و ترک و عرب   درسخن ہندیٔ مادوختہ لب

چھٹے باب میں خسرو کی فارسی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خسرو کے فارسی کلام کا بڑا حصہ چاہے وہ تاریخی اہمیت کی حامل مثنویوں کی صورت میں ہو یا ملوک و امرا کے قصائد کی صورت میں، تاریخ کے طالب علموں کے لیے بہت اہم ہیں۔ خسرو کا یہ کلام مورخین کے لیے حوالے کی چیز بن گئی ہے۔ خسرو کے قصائد کا ایک بڑا حصہ تصوف، سر الٰہ اور موعظت و حکمت کے مضامین سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے قصائد کی ماہیت امرا و ملوک کے قصائد سے مختلف ہے اور ان کا معیار بھی بلند ہے۔ امیر خسرو کا ایک قصیدہ

بحرالابرار ہے جو نظام الدین اولیا کی مدح اور مضامین تصوف سے تعلق رکھتا ہے۔اس قصیدے میں شکوہ الفاظ، علوئے مضامین، تراکیب اور بندش کی چستی اور نغمگی وغیرہ بہ یک وقت ملتی ہے۔خسرو کو مقبولیت اور شہرت ان کی غزل گوئی سے حاصل ہوئی اور یہ مقبولیت اتنی بڑھی کہ دوسرے اصناف سخن میں ان کی مقبولیت سے سبقت لے گئی۔۹۰

نقد حرف

تین سو تین صفحات پر مشتمل ممتاز حسین کے اس تنقیدی مضامین کے مجموعے کا پہلا ہندستانی اڈیشن ۱۹۸۵ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے اشاعت پذیر ہوا۔اس میں ''غالب ایک آفاقی شاعر''، ''جوش فکر و فن کے آئینے میں''، ''مرزا یاس یگانہ کی شاعری''، ''شاعر فراق گورکھپوری''، ''فیض کی شاعری''، ''ادب، روایت، جدت اور جدیدیت''، ''ادب ایک اسلوب اختلاف رائے کا''، ''ادیب اور آزادیٔ رائے''، ''معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ''، ''شاعری اور شخصیت''، ''طرز تحریر اور نفسیات''، ''تصوف اور شاعری''، ''آزاد نظم کا موجودہ تجربہ''، ''جدید اور جدید تر شاعری''، ''لفظ ستار کی سرگزشت''، ''قومی بیداری میں اکبر کا حصہ''، ''اقبال کا تصور جہاد''، ''فانی کے کلام پر ایک نظر''، ''اختر حسین رائے پوری اور گرد راہ''، ''خدیجہ کا فن''، ''ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت''، ''داستانوں کی ماہیت''، ''باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوانات کے تحت کل ۲۳ مضامین شامل ہیں۔

۱۹۷۲ء میں ممتاز حسین نے اپنے مضامین کا ایک مجموعہ نقد حرف کے نام سے مرتب کیا تھا اور جلد ہی اس کو شائع کرانا چاہتے تھے مگر ان ہی دنوں وہ امیر خسرو دہلوی کے سوانحی حالات اور ان کی تصانیف سے متعلق تحقیقی کام میں مصروف ہو گئے اور وہ کتاب ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ زیر نظر کتاب کی اشاعت کا جب مرحلہ آیا تو اس وقت کا ادبی منظر نامہ بدل چکا تھا چنانچہ اس میں بعض دوسرے مضامین بھی شامل کر دیے گئے۔البتہ نام وہی پرانا رکھا۔۹۱

مضمون ''غالب ایک آفاقی شاعر'' پہلے ایک بین الاقوامی سمینار میں پڑھا گیا تھا۔ بعد ازاں اس کو اس کتاب میں شامل کیا گیا۔غالب کے بارے میں ممتاز حسین کا خیال ہے کہ جس طرح ہر بڑے اور یجنل

شاعر کو زندگی کو دیکھنے، پرکھنے اور اپنے تجربات میں معنویت پیدا کرنے کے لیے ایک عالمی نقطہ نگاہ اختیار کرنا پڑتا ہے (یہ عالمی نقطہ نگاہ ایک شخص کی آئیڈیالوجی کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے، جس سے وہ اپنے عہد کی آئیڈیالوجی کو پرکھتا ہے) اسی طرح مرزا غالب کا شمار بھی انھیں بڑے شعراء کی صف میں کرنا چاہیے کیوں کہ انھوں نے جہاں ایک طرف بے کرانی کا ایک نیا تصور پیش کیا ہے، وہیں زندگی کے بارے میں اتنے سوال اٹھائے ہیں کہ ان کی مدد سے ایک نئے تصور حیات کی بھی تشکیل کی جا سکتی ہے۔[92]

''جوش فکر و فن کے آئینے میں'' جوش کے فکر و فن سے متعلق ممتاز حسین کا فکر انگیز مضمون ہے۔ یہ مضمون ان کی فلسفیانہ باریک بینی کی بہترین مثال ہے۔ جوش کو عام طور پر شراب و شباب کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں شاعر انقلاب کا بھی خطاب دیا گیا ہے۔ لیکن جوش کی شاعری میں باقاعدہ فکری عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ممتاز حسین نے جوش کے فکر و فن کا گہرائی سے مطالعہ کر کے ان کی شاعری میں فلسفہ کے اثرات کا سراغ لگایا ہے اور ان کے اشعار کے حوالے سے اپنے خیالات کو بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوش کی شاعری میں فلسفیانہ افکار بالخصوص رباعی میں ملتے ہیں۔ ان کی رباعیاں اختصار اور جامعیت، ذکاوت اور ارتکاز فکر کی بہترین مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام رباعی گو شعرا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔[93]

''مرزا یاس یگانہ کی شاعری'' میں ممتاز حسین نے یگانہ کے اچھوتے، تیکھے اور چونکانے والے انداز کا ذکر کیا ہے۔ ان کے لہجے میں ایسی تمکنت اور ایسا وقار تھا جو آتش کی یاد دلاتا تھا مگر آتش سے بڑھ کر تھا۔ یگانہ کے عہد کی شاعری پر رومانی فضا چھائی ہوئی تھی۔ یگانہ نے مکمل زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ انھوں نے شاعری اکتساب خیال سے نہیں بلکہ اپنے تجربات سے کی ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع اخلاق انسانی ہے اور اس نسبت سے ان کے یہاں نیک و بد کے مابعد الطبیعاتی ماخذ، جبر و قدر، سزا و جزا کے مسائل بھی ہیں۔ یگانہ میر کی طرح وحدت الوجودی شاعر ہیں۔ وہ اپنے سے باہر خدا کو ڈھونڈنے کے قائل نہیں۔ حق پرستی کے معاملے میں یگانہ راہ اعتدال کو پسند کرتے ہیں۔[94]

مضمون ''شاعر فراق گورکھپوری'' ۱۹۸۴ء میں الٰہ آباد میں فراق سمینار میں پڑھا گیا تھا۔ اسے بعد میں اس کتاب میں اشاعت کے لیے شامل کیا گیا۔ فراق نئی آواز اور نئے لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی

غزل میں جدید حسیت کے عناصر نمایاں ہیں۔ فراق ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دانش ور بھی ہیں۔ وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں یقین رکھتے تھے۔ پروفیسر ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ ''فراق کی فکر میں نسبتاً فلسفیانہ گہرائی زیادہ ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں جس طرح انسانی عظمت اور جہد مسلسل کے نغمے ملتے ہیں وہ آج ہمارے شعور کا حصہ بن چکے ہیں۔'' فراق گورکھپوری کو اپنی شاعری کے سوز وگداز کی کیفیت پر فخر ہے اور یہ سوز وگداز ان کو میر کی دین ہے۔ ان کی شاعری معاصر زندگی اور ان کے پیچیدہ جذبات کی ترجمان ہے۔ ۹۵

''فیض کی شاعری'' میں ممتاز حسین فیض کے مجموعی کلام پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ترقی پسند شاعروں میں فیض کا نام معتبر اور اہم ہے۔ دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح فیض نے غزل کے حسن تغزل کو اپنی نظموں میں راہ دی ہے۔ فیض کی غزلوں میں وحدت تاثر کے باعث نظموں کا رنگ ہے۔ اور ان کی نظموں میں حسن تغزل کے راہ پانے اور نامیاتی اٹھان کی وجہ سے غزلوں کا مزہ ملتا ہے۔ ممتاز حسین کا خیال ہے کہ فیض کی شاعری دکھ کی ہے نہ کہ سیاسی اقدام کی۔ ان کی تکنیک مظلوم کو کسی عدالت میں پیش کر کے اس کی وکالت کرنے کی نہیں ہے بلکہ خود ہی فریادی بن جانے کی ہے۔ فیض نے مجاز کے مجموعہ کلام پر مقدمہ لکھتے ہوئے مجاز کو انقلاب کا مطرب قرار دیا تھا۔ یہ خطاب خود فیض پر بہ حسن تمام صادق آتا ہے۔ ۹۶

''ادب، روایت، جدت اور جدیدیت'' میں ممتاز حسین ان عنوانات کو زیر بحث لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جدت، روایت کا ایک تکوینی حصہ ہے۔ کوئی بھی روایت ایسی نہیں ہے جس میں بے شمار جدتوں کا اضافہ نہ ہوا ہو اور جو ان کے امتزاج سے وجود میں نہ آئی ہو۔ اس کے برعکس جدیدیت ایک کلٹ (CULT) ہے اور اس کے پیچھے ایک فلسفہ ہے۔ اس کو انھوں نے معرض بحث میں لایا ہے۔ روایت سے بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ہر فن اور ہر ہنر کی ایک روایت ہوتی ہے اور جب کسی معاشرے میں یا کسی فن یا ہنر کی روایت نہیں ہوتی ہے اور فن یا ہنر بقائے حیات اور تکمیل حیات کے لیے ضروری ہوتا ہے تو اسے دوسرے معاشروں سے قرض لیتے ہی اور اپنے معاشرے کی نفسی کیفیت یا GENIUS کے مطابق اس کو پروان چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۹۷

''ادب اسلوب اختلاف رائے'' یہ موضوع تھا ایک بین الاقوامی تنظیم کے گیارہویں اجلاس کا، جو ۱۹۶۹ء میں اسلام آباد میں منعقد ہوا تھا۔ ذریعہ اظہار کے لیے انگریزی زبان کو اختیار کیا گیا تھا۔ اس لیے اولاً یہ مضمون انگریزی میں لکھا گیا۔ اس کو بعد میں اردو میں منتقل کیا گیا۔ چونکہ مندوبین میں اکثریت یورپی ممالک کے ادیبوں کی تھی اس لیے حوالے کے لیے اس کا ادبی پس منظر بھی یورپی ادب کو رکھا گیا۔ اس میں ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ ادبی شعور زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس سے زندگی کی کوئی شے بھی خارج نہیں ہے۔ ادب جہاں انسان اور انسان کے رشتوں کو پیش کرتا ہے، وہ انسان اور اشیا اور انسان اور کائنات کے رشتوں کو بھی پیش کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ادب صرف ماضی اور حال کا نہیں بلکہ مستقبل کا بھی ہوتا ہے۔[۹۸]

''ادیب اور آزادئ رائے'' میں آزادئ رائے جیسے اہم نکتے کی وضاحت کی گئی ہے۔ آزادئ رائے انسانی زندگی میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ آزادئ رائے خواہ وہ کسی ادیب کی ہو یا عام آدمی کی، انسان کی اس آزادی کا ایک داخلی پہلو ہے جو اپنے کو تہذیب وتمدن کی مختلف برکتوں کی صورت میں ظاہر کرتی رہتی ہے۔ آزادئ رائے ہر فرد بشر کا حق ہے لیکن یہ ادیبوں کے لیے اور بھی ضروری ہے کیوں کہ وہ عام انسانوں سے زیادہ حسّاس، ذی شعور، دانا اور بینا ہوتا ہے۔ لیکن یہ اس بات سے مشروط ہے کہ وہ آدمی پہلے ہو اور ادیب بعد میں اور اس کا ادب تادیبی نہ ہو بلکہ غم گسار ہو۔[۹۹]

''معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ'' ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۱ء میں اکیڈمی آف لیٹرز، اسلام آباد کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں ممتاز حسین نے معاشرے کی تعمیر اور تشکیل نو میں ادب کی اہمیت کو ناگزیر بتایا ہے۔ شاعری ہو یا ادب کی کوئی اور صنف اس کا تعلق انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانے کے عمل سے ہے۔ آدمی کا جوہر اس کے معاشرے میں کھلتا ہے۔ وہ خود کو دوسروں کے آئینے میں اور دوسروں کو خود کے آئینے میں دیکھتا ہے اور ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ شعر و ادب کا ایک گہرا رشتہ اخلاق سے ہے مگر اس اخلاق سے ہے جو تخلیقی قوت کا حامل ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کے شاعر شیلی کا خیال ہے کہ شاعری ایک معتبر راہ نما، رفیق اور پیرو کار کا کردار ادا کرتی ہے۔ تخلیقی ادب کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک آزاد شخصیت کی خود متحرک تخلیق ہوتی ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ

خصوص سے عموم کی طرف اور محسوس سے معقول کی طرف سفر کرتی ہے۔ ۱۰۰؎

''شاعری اور شخصیت'' ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے شعری نظریات کی تنقید ہے۔ ایلیٹ کے نزدیک کسی شاعر کا بہترین اور منفرد کارنامہ یہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے پیچھے کوئی روشن حظ چھوڑا ہے، کوئی نئی شمع روشن کی ہے یا کوئی آواز بہ صورت شعلہ بلند کی ہے..... بلکہ یہ ہے کہ اس نے اپنے کو اسلاف کے کارناموں پر قربان کیا ہے۔ اس نے اپنے شعور اور معبود کا بلیدان ماضی کو دیا ہے۔ ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ شاعری نفی شخصیت سے عبارت ہے۔ ممتاز حسین کہتے ہیں شاعری نہ تو شخصیت سے گریز ہے اور نہ شخصیت کی نفی ہے۔ ۱۰۱؎

''طرز تحریر اور نفسیات'' میں ممتاز حسین نے اس نکتے پر بات کی ہے کہ طرز تحریر یا اسلوب کس حد تک فن کار یا شاعر کی شخصیت کا غماز ہوتا ہے۔ اسلوب کا مطالعہ اکثر جماعتی نفسیات، سماجیات اور علم الانسان کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ جب کسی اسلوب کا ذکر ہوتا ہے تو اس کا مطالعہ کسی ایک شاعر کی نفسیات سے نہیں بلکہ اس دور کے عمومی، سماجی اور تہذیبی عوامل ہی کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ شخصیت کا بھی اپنا اسلوب ہوتا ہے جو اس کے پورے رویے کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہاں پر ممتاز حسین نے ایک مثال کے ذریعہ اس کو سمجھایا ہے۔ کہتے ہیں: اگر فن پارے میں شخصیت کی چھاپ نہ ہوتی تو شاید اسداللہ خاں اسد کو اپنا تخلص بدلنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی　　میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

کسی گمنام میر امانی اسدؔ کے اس شعر سے برہم ہو کر غالب نے اپنا تخلص ہی بدل لیا۔ ۱۰۲؎

مضمون ''تصوف اور شاعری'' خواجہ فرید ملتانی کے سالانہ عرس کے موقع پر ۱۹۶۰ء کی دہائی میں کبھی پڑھا گیا تھا۔ اس میں تصوف اور شاعری کے باہمی رشتے پر بحث کی گئی ہے۔ شاعری کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ کوئی اکتسابی شے نہیں بلکہ یہ ایک عطیہ فطرت ہے۔ اسی طرح صوفی اپنے جذبہ عشق کو بھی اکتسابی نہیں بلکہ فطری بتاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک کہ صوفی کو شاعر کا آہنگ اور تخیل اور شاعر کو صوفی کا عشق نہ ملے، نہ تو صوفی مکمل ہے نہ شاعر۔ صوفی حقیقت کو چشم باطن سے دیکھتا ہے اور شاعر اس کو چشم تخیل سے دیکھتا ہے۔ جب صوفی شاعر، یا شاعر صوفی ہو جاتا ہے تو یہ دونوں نگاہیں ایک ہی نقطے میں سمٹ آتی ہیں۔ ۱۰۳؎

''آزاد نظم کا موجودہ تجربہ'' میں ممتاز حسین نے اردو شاعری میں آزاد نظم کے تجربے کو کوئی انوکھا واقعہ نہیں بتایا ہے بلکہ اسے نئی نسل کی تلون مزاجی یا غرابت پسندی کا نتیجہ قرار نہیں دیا ہے بلکہ اس کو ایک منطقی نتیجہ مانا ہے۔ شاعری کا سرچشمہ آہنگ اور ہارمونی نہیں ہے جس سے وزن پیدا ہو بلکہ تخیل ہے۔ اس کا سرا انگلستان میں ورڈز ورتھ کے یہاں ملتا ہے۔ ہندوستان میں اسی خیال کو مولانا حالی نے دوہرایا۔ قافیہ سے آزادی نے ہمارے یہاں غیر مقفیٰ نظموں کو جنم دیا۔ آگے چل کر دوسری آزادی یہ نظر آئی کہ قدیم نظموں کی ہیئت کو ترک کر کے مغربی نظموں کی ہیئت اپنائی گئی۔ قافیے کا التزام بدل دیا گیا۔ بلینک ورس میں مصرعے نہیں بلکہ سطریں، بند نہیں بلکہ ٹکڑے ہوتے ہیں۔ یورپ سے جس آزاد نظم کی ابتدا لافورگ اور پال ورلین نے کی تھی اس کا مقصد نظم اور نثر کے فرق کو مٹانے کا نہ تھا بلکہ پرانے اوزان کے قید و بند سے آزادی حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ نغمگی پیدا کرنے یا شاعری کو موسیقیت سے قریب ترلانے کا تھا۔[۱۰۴]

مضمون ''جدید اور جدید تر شاعری'' اصلاً انگریزی میں لکھا گیا تھا اور پاکستان کے ''ڈان'' اخبار میں شائع ہوا تھا۔ افتخار جالب نے اسے کسی سے ترجمہ کرا کے اپنی مرتب کردہ کتاب ''جدید اردو شاعری'' میں شامل کیا۔ ترجمہ ناقص ہونے کی وجہ سے ممتاز حسین کو پسند نہیں آیا۔ انھوں نے خود اس کا ترجمہ کر کے اسے صحیح صورت میں پیش کیا۔ ممتاز جدید شاعری کو مستحسن مانتے ہیں۔ وہ نئے شعرا سے اس لیے خوش ہیں کہ وہ ماضی کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتے ہیں، حال سے نبرد آزما ہیں۔ اپنی بیگانگیٔ ذات کو بے نقاب کر کے بالواسطہ موجودہ نظام کو بے نقاب کر رہے ہیں۔ ان معنوں میں وہ شعرا کو حقیقت نگار بھی کہتے ہیں۔[۱۰۵]

''ستار کی سرگزشت'' ممتاز حسین کا تحقیقی مضمون ہے۔ لفظ ''ستار'' دو الفاظ ''سہ'' اور ''تار'' سے مرکب ہے۔ اگر ستار میں واقعتاً صرف تین ہی تار ہوتے ہیں تو اس لسانی تشریح کو قبول کرنے میں کم دشواری ہوتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ اولاً اس میں صرف تین ہی تار ہوتے تھے تو اس کے تاریخی شواہد مہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر اس بات کو بھی مدنظر رکھا جانا چاہیے کہ دونوں الفاظ ''سہ'' اور ''تار'' فارسی زبان کے ہیں اور اگر ستارہ واقعتاً ان ہی دو لفظوں سے مرکب ہے تو پھر قدیم فارسی میں اس کا تلفظ اور املا ستارہ کیوں ہے اور ستار کیوں نہیں۔ انھوں نے لاطینی، یونانی الفاظ کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ اصل لفظ ستارہ ہے۔[۱۰۶]

''قومی بیداری میں اکبر کا حصہ'' ریڈیو پاکستان کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔اس مضمون میں ممتاز حسین نے اکبرالہ آبادی کے کلام کی عظمت اوران کی شاعرانہ خوبیوں کو بیان کیا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری سے زمانے کا رخ موڑنے کی کوشش کی اورانگریزی تمدن کا جوسیلاب آرہا تھااس کوروکنے کی جدوجہد کی۔اکبر کی جدوجہد مسلمانوں کوطوفان مغرب میں غرق ہونے سے بچانے اورانھیں اس خودی سے آشنا کرنے کی تھی جس کی تفسیر علامہ اقبال نے کی تھی۔علامہ اقبال کے ابتدائی دور کی شاعری پراکبر کی شاعری کا گہرا اثر تھااوراقبال کا شاہین کا تصورتو اکبر ہی کا عطیہ تھا۔اکبر کا خیال تھا کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کوترقی کی پٹی پڑھائی ہے، ایسا انھوں نے شیطان کی سازش سے کیا ہے۔اکبرکوتبدیلی سے اتنا بغض نہیں تھا جتنا مغرب کی اندھی تقلید سے جس نے ہمارے معاشرے میں ایک مضحک صورت حال پیدا کردی تھی۔۱۰۷

''اقبال کا تصوراجتہاد'' ریڈیو پاکستان کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ممتاز حسین بتاتے ہیں کہ اقبال کے خطبات جوان کے اسلامی فکر کا نچوڑ پیش کرتے ہیں اپنی اسپرٹ میں معقولاتی ہیں اوران کے اس اجتہادی بیان کی اسپرٹ کے حامل ہیں کہ اسلام کا ظہورعقل استقرائی کا ظہور ہے۔اقبال کے نزدیک اسلام ایک مثبت سائنس ہے یعنی مشاہدہ فطرت، مطالعہ فطرت اور تجربی علوم یعنی خواص کے مطالعہ سے عوام تک پہنچنے کی دعوت دیتا ہے۔اقبال نے اپنے چھٹے خطبے میں اجتہاد کے موضوع کو زیر بحث لایا ہے۔اجتہاد کے معاملے میں وہ آزادیٔ مطلق کی بات کرتے ہیں۔عرف عام کے تصوراجتہاداوراقبال کے تصوراجتہاد میں فرق ہے۔وہ اسلام کے تمام مذہبی خیالات کی تشکیل جدید، مغربی علوم وفنون اوراپنے ضمیر کی روشنی میں کرنا چاہتے تھے۔وہ اسے فقہ تک محدودرکھنا نہیں چاہتے تھے۔۱۰۸

''فانی کے کلام پرایک نظر'' میں فانی اوراقبال کے کلام کا موازنہ کرتے ہوئے کلام فانی کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔فانی اوراقبال دونوں ہم عصر شاعر تھے۔اقبال کے یہاں اختیار پرزور ہے اور فانی کے یہاں جبر پر۔

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتاہم کیا کریں

اگر فانی کی اس فکر کا مقابلہ اقبال کی فکر سے کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فکراقبال کا تعلق

ہماری اس تہذیبی جدوجہد سے تھا جو ہمارے عقائد، خیالات اور اقدار میں زبردست تبدیلی لانے کی تھی اور فانی کی فکر اس دور کی ایک صدائے بازگشت تھی جب کہ ہم دشت میں کھو گئے تھے۔ انکار خودی یا بے خودی میں فانی اتنی دور جا پڑے کہ پھر اقرار خودی کی طرف لوٹ نہ سکے یا اس پر زور نہ دے سکے۔ ان کی نظر ہوالحق پر ہی رہی، اناالحق کا کوئی نعرہ ان کی زبان پر نہ تھا۔ فانی کے یہاں ایک طرز ادا ہی نہیں بلکہ وجدانیت کے بہت گوہر آبدار بھی ہیں اور جب وہ ذرا تجریدی انداز سے ہٹ کر کچھ مجاز کا پہلو لے کر گفتگو کرتے ہیں تو بڑی عاشقانہ غزلیں کہتے ہیں۔ فانی کے اس دور کی غزلوں کو سامنے رکھیں جن میں جذبات کا ٹھہراؤ، فکر میں توازن و سنجیدگی اور گفتگو کا انداز مہذب ہے تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ انھوں نے غالب کے فکری اسلوب شاعری سے ایک شاخ اپنے طرز کی بھی تراشی ہے۔ فانی کے اسلوب میں جامعیت، اختصاریت اور اشاریت بھی ملتی ہے۔ اگر فانی کے یہاں یکسانیت مضمون کے بجائے تنوع اور رنگارنگی ہوتی تو ان کا اسلوب اور بھی دل کش ہوتا۔۱۰۹

''اختر حسین رائے پوری اور گرد راہ'' میں ممتاز حسین نے اختر کے فن کی کھل کر تعریف کی ہے۔ ان کو غالب اور اختر حسین رائے پوری کے درمیان کچھ مماثلت بھی دکھائی دیتی ہے مثلاً غالب کے جوانی کے ایام میں جو تیز روی، گرمیٔ رفتار ملتی ہے وہی عناصر اختر کے گرد راہ میں بھی ملتے ہیں۔ جس طرح کلکتے کے قیام سے غالب کی فکر میں وسعت پیدا ہوئی، اختر حسین کی بھی ذہنی تربیت سو سال کے فاصلے سے عروس البلاد کلکتے میں ہوئی۔ اختر حسین ایک انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کلکتے میں انقلابیوں کے خیالات نے انھیں بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس زمانے کی زندگی کو انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''گرد راہ'' میں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس زمانے کا کلکتہ نہ صرف ٹیگور کا کلکتہ تھا بلکہ سبھاش چندر بوس اور قاضی نذرالاسلام کا کلکتہ بھی تھا۔ اسی کلکتے میں قاضی نذرالاسلام کا بدروہی بھی نظر آتا ہے۔ اختر حسین نے نذرالاسلام کی نظم بدروہی کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک مضمون ''ادب اور زندگی'' لکھا۔ ان کا یہ مضمون اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا مضمون تھا۔ اس مضمون سے ترقی پسند تنقید کی ابتدا ہوئی۔ اختر حسین نے اردو ادب کو تنقید، افسانے اور مضمون کی صورت میں ایک سرمایہ دیا ہے اور یہ اردو ادب کا ناقابل فراموش سرمایہ ہے۔۱۱۰

''خدیجہ کا فن'' میں ممتاز حسین نے خدیجہ مستور کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ خدیجہ کے فن پر اظہار رائے کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: خدیجہ میں جو یہ حوصلہ تھا اپنے مقدر ساز ماحول کو بدلنے کا وہ ان کے فن کا طرۂ امتیاز تھا لیکن وہ اپنے فن کی اس منزل کی طرف آہستہ آہستہ پہنچی تھیں۔ وہ اپنی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں بالعموم مرد کی بے وفائی اور مرد کے ظلم کو بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ان کے اس بیان میں جا بجا تلخیاں بھی ہیں، لیکن انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ اس کی کچھ جھلکیاں ''آنگن'' میں بھی ملتی ہیں۔۱۱؎

مضمون ''ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت'' کراچی کے ثانوی مدارس کے سالانہ کانفرنس میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ معاشرے کا نظام تعلیم اس کے سماجی اقتصادی ڈھانچے کی نوعیت اور تہذیبی اثرات سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ جاگیردارانہ معاشرے میں گھر، خانقاہ مدرسہ سبھی جگہ اس کا عکس نظر آتا ہے۔ یہاں متعلم کی انفرادی صلاحیتوں کو ابھارا نہیں جاتا بلکہ اپنی شخصیت اور اپنے عقائد کے نقوش پر ڈھالا جاتا ہے۔ معاشرے میں جمود جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے آیا۔ اس نظام نے ڈھائی ہزار سال سے دنیائے انسانیت کو جو نقصان پہنچایا اس کا کفارہ ہنوز ادا نہیں ہوسکا ہے۔۱۲؎

''داستانوں کی ماہیت'' میں ممتاز حسین نے قصہ گوئی کی عادت اور روایت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قصہ گوئی کی عادت دنیا کی ہر تہذیب اور ہر ملک میں پائی جاتی ہے۔ انسان سیاسی حیوان اور حیوان ناطق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قصہ گو بھی ہے۔ گویا قصہ گوئی کے لیے وہ مختار ہی نہیں مجبور بھی ہے۔ وہ اپنی نفسیات کے دفینے اور اپنے مستقبل کے خواب کو ان ہی قصوں کے آئینے میں دیکھتا ہے مختلف قسم کے قصے اس ایک مظہر کی مختلف صورتیں ہیں کہ جن نعمتوں سے ہم محروم ہیں، ہم ان کے حصول کی آرزو اپنے خوابوں کی دنیا میں کرتے ہیں۔ ان میں ساری باتیں عالم ہوش کی ہی ہوتی ہیں، صرف ان کا اعادہ عالم خواب میں ہوتا ہے۔۱۳؎

''باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ'' ممتاز حسین کا تنقیدی و تحقیقی مضمون ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے باغ و بہار کے مآخذ، میر امن کے ترجمے کی نوعیت و اہمیت اور باغ و بہار میں دلی کی معاشرت کی جھلکیوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔۱۴؎

حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ

ممتاز حسین کی یہ تصنیف پہلی بار فروری ۱۹۸۸ء میں سعد پبلکیشنز سے منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کی اشاعت ان کی اس طویل محنت کا نتیجہ ہے جو انھوں نے ۱۹۶۴ء کے آس پاس شروع کی تھی۔ اس وقت انھوں نے شعرنو کے جمالیاتی اصول کے تعین کے تعلق سے کئی مضامین لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی ابتدا حالی کے مقدمہ شعروشاعری کے مطالعے سے کی۔ یہ مقالہ اپنی اصلی شکل میں اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس مقالے کے ایک حصہ کو انھوں نے ''جدید شاعری کے جمالیاتی اصول'' کی شہ سرخی کے ساتھ فنون (لاہور) کے شمارے میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ مقالے کا کچھ اور حصہ ادب لطیف (لاہور) میں بھی شائع ہوا۔ مکمل مقالہ پہلی بار اسی کتاب میں شائع ہوا۔ ممتاز حسین نے ۱۹۷۲ء میں ہی اس کی اشاعت کا ارادہ کیا تھا لیکن بعض حالات کی وجہ سے اس کو اس وقت شائع نہیں کرا سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسی وقت انھوں نے امیر خسرو دہلوی پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس کی وجہ سے ان دنوں ان کو فرصت نہیں مل سکی۔ اس کتاب کی تکمیل کے بعد انھوں نے زیر نظر کتاب کے مسودے پر نظر ثانی کر کے ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع کیا۔ حالی کے مقدمہ شعروشاعری کی اشاعت کے ۹۴ سال کے بعد ممتاز حسین نے اس مقدمے کا ایک نیا مقدمہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حتی الوسع حالی کے مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

مقدمہ شعروشاعری حالی کی وہ عالمانہ تحریر ہے جو ان کے دیوان کے ساتھ پہلی بار ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ نفس شاعری پر یہ ایک طویل مضمون ہے جو دس سال کی محنت شاقہ سے تیار ہوا تھا۔ ٹائٹل پر ''مقدمہ مع دیوان حالی'' لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بھی ہے جو مختصر ہے اور چند صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ مقدمے کا تعلق شاعری مطلق سے ہے اور دیباچے کا تعلق میری جدید شاعری سے ہے۔ حالی کی یہ تحریر ان کی ناقدانہ حیثیت کو متعین کرتی ہے اور پھر یہی تحریر دیوان سے علاحدہ ہو کر ایک آزاد مکتفی تصنیف کی حیثیت کی حامل بن گئی اور رفتہ رفتہ اردو تنقید کی بنیاد بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور نے اسے اردو شاعری کا پہلا منشور قرار دیا ہے۔

شعروادب کے بارے میں مولانا حالی کے خیالات ان کی دوسری کتابوں مثلاً یادگارِ غالب، حیات

سعدی اور حیات جاوید سے بھی معلوم ہوتے ہیں مگر ''مقدمہ'' ان سب سے اہم ہے۔ یہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں شاعری کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں عملی تنقید ہے۔ یہاں غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی اصلاح کے لیے مشورے دیے گئے ہیں۔

ممتاز حسین کی ''حالی کے شعری نظریات'' تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں شاعری اور وزن سے متعلق بحث ہے۔ اس میں انھوں نے بہت ہی تفصیل کے ساتھ شاعری سے متعلق مشرقی و مغربی علماء مثلاً نصیر الدین طوسی، ارسطو، پال وولین اور گولڈ اسمتھ کے نظریہ شعر سے متعلق بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے شاعری کے ڈکشن سے متعلق ورڈ سورتھ، کولرج اور حالی کے نظریات پر بحث کی ہے۔ حالی کا خیال ہے کہ نفس شاعری وزن کا محتاج نہیں۔ وزن اور قافیے کو وہ شعر کے لیے ضروری خیال نہیں کرتے مگر کہتے ہیں کہ شعر میں اس سے حسن پیدا ہوتا ہے۔

دوسرے باب میں شعر اور تخیل سے متعلق ارسطو، کولرج کے تصور حسن کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈیوڈ ہارلے کے نظریات کی بھی جان کاری دی گئی ہے۔ مشرق و مغرب کے سبھی علماء تخیل کی اہمیت کے قائل ہیں۔ شبلی تخیل کو قوت اختراع کا نام دیتے ہیں۔ تخیل کی سب سے مکمل تعریف کولرج نے کی ہے۔ اس کے الفاظ میں یہ وہ قوت ہے جو دو مختلف چیزوں میں یکسانیت اور دو یکساں چیزوں میں اختلاف تلاش کر لیتی ہے۔

تیسرا باب نیچرل شاعری اور اخلاق سے متعلق ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب سے ان مسائل پر اس میں بحث کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس بحث کو صرف حالی کے خیالات تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ دنیا کے تنقیدی ادب سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے خیالات کو ایسے تناظر میں پیش کیا جائے جس سے ہمیں ان کی فروگزاشتوں کے علم کے ساتھ ساتھ ایک نئی جمالیات کی طرف پیش قدمی کا موقع فراہم ہو۔ شاعری کا تعلق اخلاق کے ساتھ کتنا نمایاں اور مضبوط ہے، ان خیالات کا اظہار حالی نے کیا ہے اور شاعری کی عظمت پر عالمانہ روشنی ڈالی ہے۔[۱۱۵]

یگانہ: شخص اور شاعری

پروفیسر ممتاز حسین کی یہ تصنیف لاہور پریس دہلی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ ایک سو اٹھائیس

صفحات پر مشتمل یہ کتاب یاس یگانہ چنگیزی کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ہے۔

شعرائے عہد جدید میں یگانہ چنگیزی ایک معتبر نام ہے۔ ان کا اصل نام مرزا واجد حسین ہے۔ وہ ۱۸۸۳ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ یاس عظیم آبادی کے نام سے شاعری کا آغاز کیا۔ شاد عظیم آبادی سے اصلاح لی۔ شاد نے ان کی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور انھیں اس رتبے کو پہنچا دیا کہ ایک زمانہ ان کا روشناس ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کلکتہ چلے گئے، وہاں بیمار ہوگئے۔ بیماری کی حالت میں ہی لکھنؤ آ گئے۔ یہاں کی آب و ہوا راس آئی۔ یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی کر لی۔ لکھنؤ آنے کے بعد انھوں نے اپنا تخلص یگانہؔ کر لیا۔ مشاعروں میں اپنے کلام کی وجہ سے جلد ہی مشہور ہوگئے۔[۱۶]

یگانہؔ خاندانی اعتبار سے مغل تھے۔ آباء واجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ لیکن یگانہ نے تلوار کے بجائے قلم تھاما۔ چنگیز خاں کے خاندان سے نسبت کی وجہ سے چنگیزیؔ لکھنا شروع کر دیا اور اس نام سے شہرت پائی۔ شعرائے لکھنؤ سے ان کی چشمک ہوگئی۔ دونوں طرف سے خوب حملے ہوئے۔ اس کی لپیٹ میں غالب بھی آ گئے۔ یگانہ نے ان کے کلام میں عیب نکالے اور خود کو ''غالب شکن'' بلکہ ''غالب کا چچا'' کہنے لگے۔[۱۷]

اہل لکھنؤ کو بدلہ لینے کا بہانہ مل گیا۔ انھوں نے یگانہ کی بہت زیادہ درگت بنائی۔ یگانہ لکھنؤ سے حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں سب رجسٹرار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک لاہور میں بھی کام کیا۔ نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہیں ۱۹۵۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

یگانہ صاحب علم اور ذہین شخص تھے۔ ان کے کلام میں قادرالکلامی پائی جاتی ہے۔ یگانہ کا انداز اچھوتا، تیکھا اور رواں ہے۔ ان کا لب ولہجہ منفرد ہے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان رباعیوں میں بھی بلند آہنگی ہے۔ یگانہ نے نشتر یاسؔ، آیات وجدانی، چراغ سخن، غالب شکن ترانہ اور گنجینہ جیسی قابل قدر تصانیف چھوڑی ہیں۔ یگانہ ایک حقیقی شاعر تھے۔ ان کی فکر ان کے اپنے تجربات زندگی کی پروردہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر میں ایسے تضادات بھی ملتے ہیں جو بدلے ہوئے موڈ یا تغیر کیفیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کبھی جبر تو کبھی اختیار کی باتیں کرتے ہیں مگر اس طرح کہ دونوں میں تضاد نہ ہو۔ انھوں نے کہیں کہیں اپنے ہی کو مسترد بھی کیا ہے۔ یگانہ کی مجموعی فکر کا احاطہ کرنے کے بعد ان کے فلسفیانہ اور مذہبی عقائد کے بہت سے واضح خطوط ابھرتے ہیں۔

یگانہ کی شاعری کا موضوع اخلاق انسانی ہے۔اسی نسبت سے ان کے کلام میں نیک و بد کے مابعد الطبیعاتی مآخذ، جبر وقدر، جزاءسزا کے مسائل ملتے ہیں۔ وہ ان ساری باتوں کو انسانی رشتوں یا محسوس رشتوں اور حسن تغزل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کا لہجہ نرم و نازک نہیں بلکہ سخت گیر اور کہیں کہیں جارحانہ بھی ہے۔

یگانہ میر کو اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے۔وہ میرؔ کے فن سے متأثر بھی تھے۔لیکن میر کی شاعری کا دائرہ ان کی شاعری سے خاصا مختلف تھا۔ میر کے کردار کا ایک پہلو یگانہ کے کردار سے میل بھی کھاتا ہے۔ یہ پہلو خودشناسی اور خودداری کا ہے۔

یگانہ بھی میر کی طرح وحدت الوجودی شاعر ہیں۔وہ اپنی ذات کے باہر خدا کو ڈھونڈنے کے قائل نہیں۔وہ اس بات کے بھی قائل نہیں کہ جُزکل سے الگ ہوسکتا ہے۔ یگانہ کا یہ وحدت الوجودی تصور ایک غیر شخصی خدا کا تصور تھا۔ وہ خدا کو احساسات کی دسترس سے ماورا تصور کرتے تھے، خواہ وہ تجلّی کی صورت میں ہو یا وحدت ذات کی صورت میں، وہ اسے مظاہر فطرت اور انسان میں نہ دیکھ پائے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا تصور وحدت الوجود ایک سیل محبت بن کر ان کے دل میں نہ اتر پایا۔

یگانہ کو جبر وقدر کے مسائل سے خاصی دل چسپی ہے۔ان مسائل سے متعلق جو باتیں غالب کے یہاں ہیں ان کی شاعری میں بالکل نہیں ہیں۔حیرت کی بات یہ ہے کہ پھر بھی وہ غالب کے معترض ہیں اور مقابلہ آرائی پر اترتے ہیں اور اس سے ایک قدم آگے غالب شکنی پر کمربستہ ہوجاتے ہیں۔ یگانہ غالب کے اشعار کے مقابلے میں آتش کے اشعار پیش کرتے ہیں۔خود پرستی سے بڑھتے ہوئے وہ خودرائی کے شکار ہوجاتے ہیں۔ یگانہ کے سلسلے میں ان کی خودی اور یکتائیت کی بات اکثر درمیان میں آجاتی ہے اور ان کا یہ شعر بھی نقل کیا جاتا ہے۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا　　خدا بنے تھے یگاؔنہ مگر بنا نہ گیا

یگانہ کی پسند نہ تو اقبال تھے، نہ جوش، نہ اختر شیرانی اور نہ مجاز۔ان کی تمام تر پسندیدگی اکبرالہ آبادی کے کلام اور ان کے جیسے خیالات کے لیے تھی۔ ان کے فلسفہ خودی کا رخ باہر کی جانب نہیں یعنی مستقبل آفرینی کی جانب نہیں بلکہ اندر کی جانب یعنی تنقید نفس اور تنقید ذات کی جانب تھا۔ یگانہ ایک زوال آمادہ

تہذیب کے ناقد تھے۔ وہ میؔر اور آتش کی درویشانہ زندگی، ان کی خودداری اور غیوری کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہیں۔ یگانہ نے اسی مشرقی خودی کو اپنایا جس کا اظہار میؔر کے اس شعر میں ہوا ہے۔

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی کی خواہش　　ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

یگانہ نے بھی اس طرح کے شعر کہے ہیں:

بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں　　کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی

نگاہ یاس سے ثابت ہے سعی لاحاصل　　خدا کا ذکر تو کیا بندۂ خدا نہ ملا

یگانہ کے آرٹ کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ٹھیٹھ اردو کے بھی شاعر تھے۱۱۸۔ ٹھیٹھ اردو کی شاعری کو چمکانے میں ان کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ٹھیٹھ، اردو میں دخیل ہندوی الفاظ کے استعمال سے بنتی ہے۔ اس اردو میں فارسی کی اضافت کے بغیر جذبات سے پر اور پہلو دار اشعار کہنا ذرا مشکل کام ہے۔ میؔر اس ہنر کے ماہر تھے۔ یگانہ کے یہاں بھی اس انداز کے اشعار ملتے ہیں:

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے　　اسی زمیں میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

یگانہ چنگیزی اس مغلیہ تہذیب کے آخری ناقد تھے جو ان کے ہی زمانے میں دم توڑ چکی تھی، لکھنؤ کا ماحول بدل چکا تھا۔ میؔر اور مرزؔا صاحب نہیں رہے تھے۔ تغیر کا ایک سیلاب تھا جو سارے اقدار کو بہائے لے جا رہا تھا۔ اس سیلاب سے مقابلے کی ناکام کوشش اکبؔر بھی کر رہے تھے چنانچہ یگانہ کو یہ کہنا پڑا۔

کون ٹھہرے سمے کے دھار پر　　کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک

اس کا اثر جابجا ان کے آخری دور کے کلام میں نظر آتا ہے جہاں وہ آزادی، سیاسی آزادی اور تقدیر کے بدلے تدبیر کی زور آزمائی وغیرہ جیسے مضامین اپنے اشعار میں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

مارکسی جمالیات

مارکسی جمالیات پہلی بار دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ مارکسی جمالیات پر ممتاز حسین کا مقالہ ان کے آخری دور سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر انھوں نے تقریباً چالیس سال تک غور کیا تھا۔ ترقی پسند تحریک کی ۷۵ ویں سال گرہ کے موقع پر آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے موضوع کو بہتر

طریقے سے سمجھنے کے لیےان کے ایک اور پرانے مقالے کے ساتھ اس کو شایع کیا ہے۔

جمالیات کا فلسفہ اصل میں جمال کا فلسفہ یا علم ہے یعنی حسن اور حسن کاری کے ذرائع کی تلاش اور اس کی نشان دہی۔ جمالیات کے لیے انگریزی مترادف Aesthetics ہے۔ ایک مخصوص شعبہ علم کی حیثیت سے جمالیات کا تصور مغرب میں بھی بہت بعد میں شروع ہوا۔ فلسفہ حسن کے بارے میں جمالیات کا لفظ جرمن اسکالر بام گارٹن نے اپنے ایک مقالے میں استعمال کیا جس میں اس حقیقت کا احساس دلایا کہ فنون لطیفہ میں پایا جانے والا حسن مطالعے کا موضوع ہے۔ جرمنی ہی کے دوسرے مشہور مفکر ہیگل نے اس علم کو مزید جلا بخشی اور اپنی کتاب ''فنون لطیفہ کا مطالعہ'' میں جمالیات کے فلسفے پر نہایت تفصیل سے اور فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی۔ بعد میں خود جرمنی ہی میں اور دوسری جگہوں پر اس پر بحث ومباحثے ہوئے۔ جمالیات سے متعلق جرمنی ہی کے کارل مارکس کے اپنے خیالات ہیں جنھیں ہم مارکسی جمالیات کہہ سکتے ہیں۔ ''مارکسی جمالیات'' (مطالعہ اور امکانات) میں ممتاز حسین نے مارکسی جمالیات پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مارکسی جمالیات کو سمجھنے کے لیے جہاں مارکسی فلسفے کی چند بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے، وہیں ہمیں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ مارکس کا تصور آدمی کیا ہے۔ چنانچہ وہ مارکس کی یہ رائے نقل کرتے ہیں کہ آدمی جب کسی شے کو کوئی شکل دیتا ہے یا کسی قسم کی صورت گری کرتا ہے تو وہ یہ کام قوانین حسن کی متابعت میں انجام دیتا ہے۔ ممتاز حسین مارکس کی رائے پر اپنا تبصرہ اس طرح کرتے ہیں کہ ہمارے بیش تر معیار حسن، حسن فطرت سے قرض لیے گئے ہیں۔ اس لیے فطرت کے حسن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بغور دیکھا جائے تو ممتاز حسین یہاں تشبیہ کی تشریح کر رہے ہیں۔ ان کی یہ رائے بھی مدنظر رہے کہ انسان کے دخل کے بغیر حسن مکمل نہیں۔ یہ صرف اس حد تک محدود نہیں کہ ''تو شب آفریدی، چراغ آفریدم'' بلکہ ہمیں استعارہ کے رموز کی دوبارہ سیر کراتا ہے۔

ممتاز حسین جدلیاتی مادیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مادیت کا عنصر عاملہ جو حقیقت پر اثر انداز ہوتا ہے، عینیت سے ماخوذ ہے۔ ان ہی معنوں میں مارکسی بشریات، مارکسی جمالیات کی بنیاد بنتی ہے۔ انسان ان معنوں میں اپنی تاریخ کا آپ خالق ہے کہ حسّی اور غیر حسّی ادراک کو ترقی دینے کے لیے اس نے فن کے نمونے خلق کیے ہیں۔ موسیقی ومصوری وغیرہ اس کے حسی ادراک کو معروضی بناتے ہیں۔

مارکس اکتسابی ذوق کے حق میں تھا۔ بازاری جنس بننے سے اس صورت میں مفر ہے کہ شعور کو جلا دی جائے۔ مارکس کے نزدیک شعور ایک فعال قوت ہے، حقیقت کا عکس نہیں۔

مارکس کے فلسفے میں انسانی اخلاق کو بہت زیادہ دخل ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ فن کی دنیا میں فن کار اپنی تخلیق میں چھپ کر گفتگو کرے۔ اس سلسلے میں ایک مخصوص لب و لہجے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ مارکس نے ہیگل کے اثرات کو قبول بھی کیا ہے اور رد بھی۔ مارکس ہیگل سے کس قدر متاثر ہے اس کے بارے میں لینن کا یہ خیال ذہن نشین رہنا چاہئے کہ جس نے ہیگل کو نہیں پڑھا ہے وہ مارکس کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ ادب میں اخلاق کے اظہار کے اسلوب میں ہیگل کی کتاب جمالیات بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ مارکسی جمالیات کے برخلاف نہیں ہے۔ [۱۱۹]

ممتاز حسین کی ان تمام کتابوں کے تعارف کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے انھوں نے نظریاتی اور عملی تنقید کے عمدہ نمونے اپنی کئی تصانیف اور مضامین کے ذریعہ پیش کیے۔ امیر خسرو دہلوی سے لے کر غالب، حالی اور یگانہ جیسے شعرا کے امتیازات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ افسانوی اور غیر افسانوی نثر اور اس کے فن کاروں کا بھی شرح وبسط کے ساتھ جائزہ لیا۔ میر امن دہلوی کی مشہور داستان ''باغ و بہار'' پر مبسوط مقدمہ لکھا اور اسے فرہنگ کے ساتھ مرتب کیا۔ اس لحاظ سے ان کی تصانیف، ان کے مضامین اور تحقیقی وتنقیدی خدمات کا دائرہ بے حد متنوع اور وسیع ہے۔

○

حواشی:

ا۔ تاریخ ادب اردو (ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک) جلد دوم، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۷ء، ص:۹۲۶
۲۔ نقد حیات، ممتاز حسین، الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، ۱۹۵۰ء، ص:۴۴
۳۔ محولہ بالا، ص:۵۳
۴۔ محولہ بالا، ص:۵۷
۵۔ محولہ بالا، ص:۷۷
۶۔ محولہ بالا، ص:۱۰۲
۷۔ محولہ بالا، ص:۱۲۶
۸۔ محولہ بالا، ص:۱۴۰
۹۔ محولہ بالا، ص:۱۷۵
۱۰۔ محولہ بالا، ص:۱۸۱
۱۱۔ نئی قدریں، ممتاز حسین، استقلال پریس، لاہور ۱۹۵۳ء ص:۶
۱۲۔ محولہ بالا، ص:۲۹
۱۳۔ محولہ بالا، ص:۳۱
۱۴۔ محولہ بالا، ص:۵۰
۱۵۔ محولہ بالا، ص:۲۷
۱۶۔ محولہ بالا، ص:۸۱
۱۷۔ محولہ بالا، ص:۹۲
۱۸۔ محولہ بالا، ص:۱۱۹
۱۹۔ محولہ بالا، ص:۱۳۵
۲۰۔ محولہ بالا، ص:۱۷۰
۲۱۔ محولہ بالا، ص:۱۷۹
۲۲۔ محولہ بالا، ص:۲۰۸
۲۳۔ محولہ بالا، ص:۲۱۰
۲۴۔ محولہ بالا، ص:۲۲۵
۲۵۔ محولہ بالا، ص:۲۳۰
۲۶۔ محولہ بالا، ص:۲۶۶
۲۷۔ محولہ بالا، ص:۲۷۶
۲۸۔ ادبی مسائل، ممتاز حسین، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص:۱۵
۲۹۔ محولہ بالا، ص:۳۱
۳۰۔ محولہ بالا، ص:۶۵
۳۱۔ محولہ بالا، ص:۷۳

۳۲؎ محولہ بالا،ص:۹۳
۳۳؎ محولہ بالا،ص:۱۱۹
۳۴؎ محولہ بالا،ص:۱۳۶
۳۵؎ محولہ بالا،ص:۱۵۵-۱۵۳
۳۶؎ محولہ بالا،ص:۱۷۸
۳۷؎ محولہ بالا،ص:۱۸۷
۳۸؎ انتخاب غالب مع مقدمہ،ممتاز حسین،اردو اکیڈمی،سندھ کراچی،۱۹۵۷ء،ص:۱۰
۳۹؎ محولہ بالا،ص:۱۱
۴۰؎ محولہ بالا،ص:۱۵
۴۱؎ محولہ بالا،ص:۲۸
۴۲؎ محولہ بالا،ص:۲۳
۴۳؎ محولہ بالا،ص:۲۵
۴۴؎ محولہ بالا،ص:۲۵
۴۵؎ بحوالہ:نقد حرف،ممتاز حسین،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،۱۹۸۵ء،ص:۲۶۱
۴۶؎ محولہ بالا،ص:۳۰۲-۳۰۱
۴۷؎ ادب اور شعور،اردو اکیڈمی،سندھ کراچی،۱۹۶۱ء،ص:۱۹
۴۸؎ محولہ بالا،ص:۶۸
۴۹؎ محولہ بالا،ص:۱۳۵
۵۰؎ محولہ بالا،ص:۱۴۱
۵۱؎ محولہ بالا،ص:۱۵۳
۵۲؎ محولہ بالا،ص:۱۸۹
۵۳؎ محولہ بالا،ص:۲۱۴
۵۴؎ محولہ بالا،ص:۲۲۴
۵۵؎ محولہ بالا،ص:۲۴۰
۵۶؎ محولہ بالا،ص:۲۸۴
۵۷؎ محولہ بالا،ص:۲۹۰
۵۸؎ محولہ بالا،ص:۳۰۳
۵۹؎ محولہ بالا،ص:۳۳۰
۶۰؎ محولہ بالا،ص:۳۴۱
۶۱؎ محولہ بالا،ص:۳۵۴
۶۲؎ محولہ بالا،ص:۳۷۳
۶۳؎ محولہ بالا،ص:۳۸۱
۶۴؎ محولہ بالا،ص:۳۸۸

۶۵ محولہ بالا،ص:۴۰۰-۳۹۵
۶۶ محولہ بالا،ص:۴۰۵
۶۷ نئے تنقیدی گوشے،ممتاز حسین،آزاد کتاب گھر،کلاں محل،دہلی،۱۹۶۴ء،ص:۷
۶۸ محولہ بالا،ص:۳۷
۶۹ محولہ بالا،ص:۶۷
۷۰ محولہ بالا،ص:۸۶
۷۱ محولہ بالا،ص:۱۳۰
۷۲ محولہ بالا،ص:۱۸۴
۷۳ محولہ بالا،ص:۹۹-۱۹۸
۷۴ محولہ بالا،ص:۲۰۸
۷۵ محولہ بالا،ص:۲۱۲
۷۶ محولہ بالا،ص:۲۱۹
۷۷ محولہ بالا،ص:۲۴۸
۷۸ غالب: ایک مطالعہ،ممتاز حسین،انجمن ترقی اردو،کراچی،۱۹۶۹ء،ص:۱۰-۹
۷۹ محولہ بالا،ص:۱۷
۸۰ محولہ بالا،ص:۲۴
۸۱ محولہ بالا،ص:۳۸
۸۲ محولہ بالا،ص:۴۷
۸۳ محولہ بالا،ص:۱۰۵-۱۰۴
۸۴ محولہ بالا،ص:۱۲۲
۸۵ محولہ بالا،ص:۱۵۶-۱۵۵
۸۶ محولہ بالا،ص:۱۶۴
۸۷ امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری،ممتاز حسین،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،دہلی،۱۹۸۲ء،ص:۱۰۴-۷۷
۸۸ محولہ بالا،ص:۱۳۳-۱۰۵
۸۹ محولہ بالا،ص:۱۳۳-۱۰۵
۹۰ محولہ بالا،ص:۴۵۰-۳۷۱
۹۱ نقد حرف،ممتاز حسین،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،دہلی،۱۹۸۵ء،ص:۵
۹۲ محولہ بالا،ص:۷
۹۳ محولہ بالا،ص:۵۰
۹۴ محولہ بالا،ص:۵۴
۹۵ محولہ بالا،ص:۸۱
۹۶ محولہ بالا،ص:۱۰۰
۹۷ محولہ بالا،ص:۱۰۵

۹۸؎ محولہ بالا،ص:۱۱۸

۹۹؎ محولہ بالا،ص:۱۴۱

۱۰۰؎ محولہ بالا،ص:۱۵۱

۱۰۱؎ محولہ بالا،ص:۱۷۲

۱۰۲؎ محولہ بالا،ص:۱۷۸

۱۰۳؎ محولہ بالا،ص:۱۸۲

۱۰۴؎ محولہ بالا،ص:۲۰۰

۱۰۵؎ محولہ بالا،ص:۲۰۶

۱۰۶؎ محولہ بالا،ص:۲۱۰

۱۰۷؎ محولہ بالا،ص:۲۲۱

۱۰۸؎ محولہ بالا،ص:۲۲۴

۱۰۹؎ محولہ بالا،ص:۲۳۲

۱۱۰؎ محولہ بالا،ص:۲۳۸

۱۱۱؎ محولہ بالا،ص:۲۴۰

۱۱۲؎ محولہ بالا،ص:۲۴۵

۱۱۳؎ محولہ بالا،ص:۲۵۳

۱۱۴؎ محولہ بالا،ص:۳۰۳-۲۷۷

۱۱۵؎ حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ، سعد پبلکشنز، کراچی، ۱۹۸۸ء

۱۱۶؎ یگانہ: شخص اور شاعری، ممتاز حسین، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص:۱

۱۱۷؎ تاریخ ادب اردو، نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص:۱۸۲

۱۱۸؎ یگانہ: شخص اور شاعری، ص:۳۶

۱۱۹؎ مارکسی جمالیات (نظام لکچرز)، ممتاز حسین، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۸۹ء

باب سوم

ممتاز حسین کی تنقید نگاری

(الف)

(i) تنقید کا مفہوم

(ii) شعرائے اردو کے تذکروں میں تنقیدی عناصر

(iii) اردو تنقید کے مختلف دبستان

(iv) چند اہم تنقید نگار

(ب) ممتاز حسین اور نظری مباحث

فلسفہ جمال، ادب اور ادیب، مارکسی جمالیات، شعری نظریات

(ج) ممتاز حسین اور عملی تنقید

(i) **کلاسیکی ادب:** امیر خسرو، میر امن، غالب

(ii) **جدید ادب:** سرسید، حالی، یگانہ چنگیزی، اکبرالہ آبادی، جوش، فراق، فیض، فانی اختر حسین رائے پوری، پریم چند، خدیجہ مستور

(الف)

(i) تنقید کا مفہوم:

لفظ 'تنقید' انگریزی لفظ Critisim کا ترجمہ ہے جو یونانی لفظ Krites سے مشتق ہے۔ Krites کے معنی الگ کرنے اور امتیاز کرنے کے ہیں جس کا مترادف Criticus ہے۔ اسی سے لفظ Critique بنا ہے جس کے معنی تنقیدی مضمون، تنقیدی مقالے یا فن تنقید کے ہیں۔ انگریزی کے لفظ Critic کا مترادف نقاد یا تنقید نگار ہے۔ نقاد وہ شخص ہوتا ہے جو بعض معیاروں اور اصولوں یا کسوٹیوں کو بنیاد بنا کر کسی تخلیق کے محاسن و معائب کے تعلق سے رائے زنی کرتا ہے۔ تنقید میں Criterion سے مراد وہ اصول، قوانین یا معیار ہیں جن کی روشنی میں قدر شناسی کی جاتی ہے۔ انگریزی میں لفظ Criticism جس یونانی لفظ Krites سے مشتق ہے اس کے بہت سے معنی ہیں ایک معنی الگ کرنے کے ہیں۔ اردو میں لفظ انتقاد یا مروجہ اصطلاح تنقید کے مصدر 'نقد' کے معنی بھی دانے کو بھوسے سے الگ کرنے یا کھوٹے سکے کو الگ کرنے کے ہیں۔

لغوی اعتبار سے کھرے اور کھوٹے کی پرکھ کا نام تنقید ہے۔ انسان اپنی ضرورت کی چیزوں کو جس جانچ پرکھ سے انتخاب کرتا ہے، اسی کو تنقید کہتے ہیں مثلاً سنار کھرے اور کھوٹے سونا کا اندازہ کسوٹی پر گھس کر کرتا ہے، تاجر اشیاء تجارت کو ہاتھ سے چھو کر اس کے عمدہ اور ناقص ہونے کا پتہ لگاتا ہے، جوہری مختلف انداز سے ہیرے جواہرات کے اصلی ہونے کا اندازہ لگاتا ہے۔

اصطلاحی معنوں میں تنقید ایک تجزیاتی عمل کا نام ہے جس کے تحت کسی فن پارے کی تشریح و توضیح کرنے کے علاوہ اس کی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے۔ کسی غزل، نظم، افسانہ، ڈراما، ناول یا کسی ادبی تخلیق کا مطالعہ کر کے اس کی خوبیوں اور خامیوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرتے ہوئے فن پارے اور

فن کار کے مقام کا تعین کیا جائے تو اس عمل کو تنقید یا ادبی تنقید کہا جاتا ہے۔

آسان لفظوں میں کہا جائے تو کھرے اور کھوٹے کو الگ کرنے کا نام تنقید ہے۔ یعنی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کو تنقید کہتے ہیں۔ اسی طرح اچھے اور برے، بلند اور پست، اندھیرے اور اجالے، زیر اور زبر کو الگ کرنے اور ان کے مقام کا تعین کرنے کو تنقید کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آل احمد سرور نے بڑی جامعیت کے ساتھ کہا ہے:

> ''تنقید کا نام فیصلہ ہے، یہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔
> تنقید وضاحت ہے، تجزیہ ہے، تنقید قدریں متعین کرتی ہے۔ ادب اور
> زندگی کا ایک پیمانہ دیتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے، ادنیٰ اور اعلیٰ،
> جھوٹ اور سچ، پست اور بلند کا مقام قائم کرتی ہے۔''

بغور دیکھا جائے تو تنقید کے ذریعہ مخصوص فن پارہ کے محاسن و معائب کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ تنقید کے ذریعہ کسی فن پارہ کی خوبیوں اور خامیوں کو مناسب دلائل کے ساتھ ثابت کیا جاتا ہے۔ تنقید کے ذریعہ کسی فن پارہ کی وقیع خصوصیات کو اس کی غیر وقیع خصوصیات سے ممیّز کیا جاتا ہے۔ تنقید فن پاروں کی قدر و قیمت کے تعین کا بھی کام کرتی ہے۔ اس میں ترتیب ذوق بہت ضروری ہے۔ تنقید کے عمل میں کسی فن پارہ کی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت اس کا اسی طرح کے دوسرے فن پاروں سے تقابل بھی کیا جاتا ہے۔ جب ایک جیسی دو تخلیقات پیش نظر ہوں تو ان کا موازنہ کر کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاتی ہے۔ تنقیدی عمل میں کسی فن پارہ کے جمالیاتی اقدار کے متعلق فیصلہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فن پارے کی خوب صورتیوں اور جمالیاتی اوصاف کو اجاگر کرنے کا نام تنقید ہے۔ ایک صحت مند تنقید کے لیے ضروری ہے کہ نقاد فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کو ترجیح نہ دے بلکہ غیر جانب داری کے ساتھ اس کے محاسن و معائب کو بیان کرے۔ کسی فن پارہ کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا بھی تنقید ہے۔ اس سے شعر و ادب کے معیار کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ اس کے تحت تخلیق کی ادبی قدر و قیمت طے کی جاتی ہے۔ تنقید کے عمل میں خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہتی ہے۔ تنقیدی عمل کے دوران یہ بات بھی ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ کسی بھی فن پارے کی ترسیل ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ترسیل میں

کسی طرح کی کمی تو نہیں رہ گئی۔تنقیدی عمل میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس خامی کو کیسے دور کیا جائے۔اس طرح فن پارہ کے ترسیل وابلاغ کے پہلو پر نظر رکھنا بھی تنقید کا ایک اہم اصول ہے۔

(ii) شعرائے اردو کے تذکروں میں تنقیدی عناصر

اصطلاح میں تذکرہ ایسی تخلیق کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہو یا مختصر حالات جمع کیے گئے ہوں۔ادب میں شاعروں کے تذکرے لکھنے کا رواج بہت پرانا ہے۔حالاں کہ تذکرہ نگاروں کا بنیادی مقصد شعراء کے کلام اور مختصر حالات زندگی کو محفوظ کرنا ہوتا تھا لیکن اس کی تنقیدی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ تذکرہ نگار شعرا کے کلام پر مختصراً اظہار خیال بھی کرتے تھے۔ان کے اس اظہار خیال اور شعراء کے کلام سے متعلق اصلاحات اور رایوں کی تنقیدی اعتبار سے بہت اہمیت ہے۔ ان کی آراءاور شعراء کے کلام پر ان کی اصلاحات سے ایسی راہیں متعین ہوتی ہیں جن سے اس دور کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور گزشتہ اور موجودہ ادوار کے تنقیدی عناصر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اردو شاعری سے متعلق تذکرہ نویسی کا رواج اٹھارہویں صدی کے وسط سے شروع ہوا۔شروع میں تمام تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے۔عرصہ دراز تک فارسی ہی میں لکھنے کا رواج رہا۔ بعد میں اردو زبان میں تذکرے لکھے گئے۔تمام محققین نے میر کے تذکرے کو اردو شاعری کا پہلا تذکرہ تسلیم کیا ہے۔ میر کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' ۵۲-۱۷۵۱ء میں فارسی زبان میں لکھا گیا۔نکات الشعراء کے بعد شمالی ہند میں بہت سے تذکرے لکھے گئے جس میں فتح علی حسینی گردیزی کا تذکرہ ''تذکرہ ریختہ گویان'' اور قائم چاندپوری کا تذکرہ ''مخزن نکات'' قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد کچھ اور تذکروں کے نام ملتے ہیں مثلاً لچھمی نارائن شفیق کا ''چمنستان شعراء''، وجیہ الدین عشقی کا ''تذکرۂ عشقی''، غلام حسین شورشی کا ''تذکرۂ شورش'' وغیرہ۔ یہ تذکرے کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے خاتمے سے قبل کچھ اور تذکروں کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں قدرت اللہ شوق رام پوری کا ''طبقات الشعراء''، ابوالحسن امیر اللہ الہ آبادی کا ''تذکرۂ سرمست افزا''، مردان علی خاں قبلا کا ''گلشن سخن''، نواب ابراہیم علی خاں خلیل کا ''گلزار ابراہیم'' وغیرہ، مصحفی کا تذکرہ ''تذکرۂ ہندی'' (۹۵-۱۷۹۴ء) اور ''ریاض الفصحا'' اس لیے

اہم ہیں کہ ان سے اٹھارہویں صدی کے اوائل کی دہلوی شاعری اور اس صدی کے اواخر کی لکھنوی شاعری سے متعلق بہت زیادہ تاریخی وتنقیدی مواد فراہم ہوتا ہے۔

انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے تذکرہ ''تذکرہ بے جگر'' از خیراتی لال بے جگر سے اواخر اٹھارہویں صدی اور اوائل انیسویں صدی کے شاعرانہ ماحول اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔تنقیدی اعتبار سے مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ ''گلشن بے خار'' (۱۸۳۴ء) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔انیسویں صدی کے نصف آخر میں سعادت خاں ناصر کا تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا'' سامنے آیا۔اسی دور میں دو اور اہم تذکرے لکھے گئے۔پہلا تذکرہ مرزا قادر بخش صابر کا ''گلستان بے خزاں'' اور دوسرا تذکرہ ''طبقات شعرائے ہند'' ہے۔تاریخی اور تنقیدی لحاظ سے محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' بہت اہمیت کی حامل ہے۔

آب حیات گرچہ اردو شعر وادب کی تاریخ ہے لیکن خود محمد حسین آزاد نے اسے تذکرہ کہا ہے۔یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں منظر عام پر آئی۔آب حیات اردو شاعری کا آخری تذکرہ اور شعر وادب کی پہلی تاریخ کہی جاسکتی ہے۔آب حیات کے بعد سے تاریخ ادب لکھنے کا رواج زیادہ ہوگیا۔بعد کے دور میں تذکرہ نگاری کی روایت کمزور پڑنے لگتی۔

اردو کے مختلف تذکروں میں تنقیدی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔میر کے تذکرہ ''نکات الشعراء'' کے مطالعے کے بعد ہم میر کی تنقیدی بصیرت کے قائل ہوجاتے ہیں۔میر عام روش سے الگ ہٹ کر بے لاگ رائے دیتے ہیں اور تنقید میں مروت کو خلل انداز نہیں ہونے دیتے۔اس تذکرہ کو اردو تنقید کے ابتدائی نقوش کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔اس میں شاعروں کے کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

مصحفی نے اپنے تذکروں میں صاف اور سادہ زبان استعمال کی ہے۔وہ لفظوں کا جال نہیں بچھاتے بلکہ واضح الفاظ میں رائے دیتے ہیں۔ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تذکروں میں نہ صرف اہم شعرا کو ہی موضوع بحث بنایا ہے بلکہ ان کے متعلق جو بھی رائیں پیش کی ہیں وہ جچی تلی اور متوازن ہیں۔اپنے حریفوں سے وہ انتقام نہیں لیتے ہیں بلکہ ان کے کلام پر بھی منصفانہ رائے دیتے ہیں۔اس تذکرہ کو تمام تر تذکروں پر امتیاز حاصل ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا گلشن بے خار (۱۸۳۷ء) اس لیے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اغلاط سے

پاک ہے۔شیفتہ اپنے عہد کے باشعوراور ذمہ دار نقاد ہیں۔تنقید کے میدان میں ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے تذکرہ میں شعراء کے مستند حالات اور عمدہ کلام کا انتخاب کر کے آئندہ کی تنقید کے لیے راہیں ہموار کردی ہیں۔شیفتہ گہری تنقیدی نظر رکھتے ہیں۔انھوں نے میر کی غزلوں کو ان کے قصیدوں سے بہتر مانا ہے اور سودا کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی غزل قصیدے سے کمتر اور قصیدہ غزل سے بہتر ہے۔ مصحفی کے منتخب اشعار کی عمدگی کو انھوں نے سراہا ہے، غالب بھی شیفتہ کی تنقیدی بصیرت کے قائل تھے۔

آب حیات محمد حسین آزاد کی شاہکار تخلیق ہے۔یہ اردو شاعروں کا آخری تذکرہ اور تاریخ ادب کی پہلی کتاب ہے۔اسے جدید اور مکمل تذکرہ کہا جاتا ہے۔اس کتاب میں آزاد نے اردو شاعروں کی منہ بولتی تصویریں پیش کی ہیں اور تفصیلی حالات بیان کیے ہیں۔اس میں تنقیدی عناصر بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔یہ تذکرہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے تنقید کا صحیح معیار قائم ہوتا ہے۔

قائم چاندپوری کے تذکرے میں بھی تنقیدی خوبیاں ہیں۔اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قائم نے شاعری کے ادوار مقرر کیے ہیں۔شعراء کو طبقات میں تقسیم کردیا ہے اور طبقات کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

لچھمی نرائن شفیق کا تذکرہ چمنستان شعرا بھی ایک قابل قدر تذکرہ ہے۔اس میں شاعروں کے کلام کا انتخاب بہت باریک بینی سے کیا گیا ہے اور اس میں تنقیدی نقطہ نظر پایا جاتا ہے۔

تذکرہ شعرائے اردو میر حسن دہلوی کا تذکرہ ہے۔انھوں نے غزل کے علاوہ انتخاب کلام میں قصائد اور مثنوی پر گفتگو کی ہے۔اس میں نکتہ چینی اور انتقام کا رویہ نہیں پایا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ تنقید میں مغربی نظریات کا چلن تذکرہ نگاروں کے دور میں نہیں تھا۔اس کی ابتدا اردو میں ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے ہوئی۔حالی کی یہ کتاب پہلی باضابطہ تنقیدی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔تذکرہ نگاروں کے سامنے جو چیزیں حسن و قبح اور معائب ومحاسن کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کرتی تھیں ان میں ان کا وجدان زبان وعروض کا علم، قدیم اساتذہ کے کلام کا مطالعہ اور جمالیاتی وفنی قدریں بہت ضروری تھیں۔بغور دیکھا جائے تو تذکروں میں تنقید کا سارا نظام ان ہی چار ستونوں پر قائم معلوم ہوتا ہے۔تذکروں میں جو تنقیدی رائیں ملتی ہیں وہ عموماً مختصر اصلاحات یا تاثراتی جملوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر میر کے نکات الشعرا میں ''شاعر پرزور''، ''آب ورنگ باغ نکتہ

دانی''، ''چمن آرائے گلزار معانی'' اور ''شاعر زبردست'' وغیرہ جیسے الفاظ اور اصطلاحات ملتے ہیں۔ یہ اور ان جیسے الفاظ بظاہر سیدھے سادے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے پس پردہ ایک روایت اور ایک پورا تنقیدی نظام وابستہ ہوتا ہے۔ آج تنقید میں جن باتوں کو کئی جملوں اور پیراگراف میں بیان کیا جاتا ہے، تذکرہ نگار انھیں مختصراً پیش کرتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تذکروں میں پائے جانے والے تنقیدی عناصر موجودہ تنقید کے پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

(iii) اردو تنقید کے مختلف دبستان

ادب میں ایک جیسے نظریات مذاق سخن رکھنے والے ادیب اور ان کے تحریر کردہ ادب کو دبستان کہتے ہیں۔ ہمارے ادب میں تنقید کے مختلف دبستان پائے جاتے ہیں اور مختلف فن کاران کے اصولوں اور ضابطوں کو اپنی تخلیقات میں بروئے کار لاتے ہیں۔ اردو ادب میں تنقید کے مختلف دبستان پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے چند اہم دبستانوں کا یہاں پر مختصر تعارف پیش کیا جائے گا۔

مارکسی اور ترقی پسند تنقید

یہ تنقید جرمن مفکر کارل مارکس سے متاثر ہے جو مزدوروں اور کسانوں کے ہمدرد تھے اور ادب میں ان سے ہمدردی کا مطالبہ کرتے تھے۔ اسے اشتراکی تنقید بھی کہتے ہیں۔ مارکسی تنقید نے پہلی بار پوری سماجی زندگی کو موضوع بنایا، اس کے ادھورے حصوں کو نہیں۔ مارکسی تنقید بنیادی طور پر ادب اور زندگی کے باہمی رشتے اور سماجی عمل اور ردعمل کا مطالعہ ہے۔ جدید تنقیدی رجحانات میں مارکسی تنقید کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔ وہ ناقدین جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے مارکسزم کو سیاسی اور اقتصادی حل کے طور پر مانتے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مارکسی نقطۂ نظر کے تحت ادبی اقدار کے تعین کی کوشش کی۔ اردو میں مارکسی تنقید کے علم برداروں میں سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، سردار جعفری، احتشام حسین اور ممتاز حسین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

نفسیاتی تنقید

نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں شاعر یا مصنف کی زندگی کا مطالعہ کرنا نفسیاتی دبستان کے زیر اثر

آتا ہے۔ یہ تنقید ماہر نفسیات فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہے جس نے انسان کے ذہن کو تین حصوں-شعور، تحت الشعور اور لاشعور میں تقسیم کیا۔ وہ تیسرے حصے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ ایک تہہ خانہ ہے جس میں انسان کی وہ سبھی خواہشات چھپی ہیں جو پوری نہیں ہوتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ ادب انسانی نفسیات کا مطالعہ ہے اور کسی فن پارے کے وجود میں آنے کے اسباب کا پتہ لگانے کے لیے فن کار کے ذہن تک رسائی ضروری ہے۔ اس تنقید کے تحت نفسیاتی تجزیہ کے ذریعہ فن کار کے ذہن تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ اردو میں نفسیاتی تنقید کا میدان بہت وسیع نہیں ہے۔ میراجی، ہادی رسوا، ریاض احمد، وزیر آغا، حسن عسکری، ابن فرید اور شبیہ الحسن نفسیاتی دبستان کے اہم نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔

جمالیاتی تنقید

جمالیاتی تنقید ادب میں حسن اور حسن کاری کے اجزا کی تلاش کا نام ہے۔ جمالیات فلسفہ حسن وفن ہے۔ بام گارٹن نے اسے حسن کی ایک اصطلاح کی شکل میں استعمال کیا تھا۔ جمالیاتی تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس دبستان نے تنقید کو روز اول سے ہی متاثر کیا ہے۔ اردو میں جمالیاتی تنقید نے ابتدا سے ہی اپنا قدم جمالیا تھا۔ جمالیاتی نقادوں میں آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری، حسن عسکری، مہدی افادی، محمد حسین آزاد اور شبلی وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔

سائنٹفک تنقید

سائنٹفک تنقید فن پارے میں سائنس جیسی صحت اور غیر جانب داری کی قائل ہے۔ اس تنقید میں جانچ پرکھ کے وقت فن کار سائنسی اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ فن پارے کے ہر حصے اور ہر گوشے پر یکساں دھیان دیا جاتا ہے اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ فن پارے میں کس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس کا مواد کیا ہے۔ سائنٹفک تنقید میں مارکسی خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس تنقید میں زبان پر بھی غور کیا جاتا ہے کہ زبان واضح ہو، علمی ہو اور کلام میں فنی خوبیاں موجود ہوں۔ یہ تنقید نگاری اردو ادب میں مغربی ادب سے آئی اور اردو ادب میں سب سے پہلے سرسید اور حالی کے یہاں سائنٹفک خیالات پائے جاتے ہیں۔ احتشام حسین، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، اسلوب احمد انصاری، مسعود حسین خاں اور محمد حسن وغیرہ اس دبستان کے اہم نقاد مانے جاتے ہیں۔

تاثراتی تنقید

تاثراتی تنقید فن پارے کا تجزیہ کرنے، قاری کے لیے اس کی تفہیم کی سطح کو بلند کرنے یا اس کی تہوں کو کھولنے کی بجائے نقاد کے ذاتی تاثرات پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ یہ تنقید قاری کے تاثرات کو زبان و بیان کے ذریعہ دوبارہ تخلیق کرتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے نقاد اصل فن پارے کے متوازی ایک ایسا متن تخلیق کرتا ہے جو دوبارہ وہی کیفیت یا اس سے ملتی جلتی کیفیت تخلیق کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ اردو کے نمائندہ تاثراتی نقاد میں محمد حسین آزاد، نیاز فتح پوری، مہدی افادی اور فراق گورکھپوری وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

رومانی تنقید

بعض زبانوں میں لکھے جانے والے فرضی اور خیالی قصے کہانیوں کو رومانس کہا گیا۔ مافوق الفطرت کہانیاں بھی رومانس کے ذیل میں آتی ہیں۔ بعد میں حیرت انگیز اور پراسرار مناظر کے بیان پر بھی رومانس کے لفظ کا اطلاق ہوا بالآخر عشق و محبت کی جذباتی واردات، مہم جوئی اور پرشوکت واردات بھی رومانس کے دائرے میں شامل ہو گئے۔ اس نظریے نے سماج کو خود ساختہ اخلاقی اور مذہبی پابندیوں سے مکمل بغاوت کا اعلان کر کے انسان کے فطری تقاضوں پر اصرار کیا۔ ان ہی ادبی تصورات کی روشنی میں مخصوص تنقیدی رویے نے دبستان کی شکل اختیار کی۔ اسی نظام فکر کی روشنی میں ادبی متون کا مطالعہ، ان کی تحسین اور تعیین قدر رومانی تنقید کہلاتی ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری، مہدی افادی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری اس دبستان کے اہم نقاد ہیں۔

(iv) چند اہم تنقید نگار:

گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ تنقید کے ابتدائی نقوش اردو کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے ساتھ مغربی افکار بھی آئے۔ ان افکار نے اردو تنقید و تحقیق پر بھی اثر ڈالا۔ مغربی افکار سے متاثر ہو کر سرسید نے ادب کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اس طرح بزرگ ادیبوں میں سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے شعر اور نثر کی خامیوں اور خوبیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ان کو دور کرنے کی تدبیریں بتائیں۔ سرسید کے خیالات ہمیں ان کے مضامین اور تقریروں میں ملتے ہیں۔ حالی نے ان خیالات کو یکجا کیا۔ ان پر غور وخوض کے بعد ان کو مقدمہ شعر وشاعری کی شکل میں پیش کیا۔ محمد حسین آزاد اور علامہ شبلی نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا بعد ازاں مولوی عبدالحق اور محمود شیرانی نے تنقید وتحقیق کے رخ کو طے کیا۔ تنقید کا کارواں مختلف منازل سے گزرتا ہوا ہمارے عہد تک پہنچتا ہے۔ فن تنقید کو عروج بخشنے والوں میں بہت سے اہل قلم کے نام شامل ہیں۔ سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے، لہٰذا چند اہم شخصیات کے ذکر پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔

الطاف حسین حالی

حالی نے ۱۸۹۳ء میں اپنے مجموعہ نظم کا پیش لفظ ''مقدمہ شعر وشاعری'' لکھ کر اردو میں باضابطہ تنقید کی بنیاد ڈالی۔ اس میں حالی نے یہ رائے دی ہے کہ شاعری محض لطف اندوزی اور وقت گزاری کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس سے زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب اور اخلاق سے شاعری کا گہرا تعلق ہے۔ انھوں نے سادگی، جوش اور اصلیت کو شعر کی خوبی قرار دیا ہے۔

محمد حسین آزاد

اردو کے اولین تنقید نگاروں میں مولوی محمد حسین آزاد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حالی کے مقدمے سے بہت پہلے یعنی ۱۸۶۷ء میں آزاد نے شاعری پر لکچر دیتے ہوئے کئی اہم مسائل کو زیر بحث لایا۔ اس لیے اردو کا اولین ناقد انھیں ہی کہا جانا چاہیے۔ ان کے لکچر کے علاوہ ان کی مشہور کتاب ''آب حیات'' اور ''سخندان فارس'' میں بھی تنقیدی نظریات ملتے ہیں۔ انھوں نے غزل سے بیزاری کا اظہار کیا اور لاہور میں مجلس مشاعرہ کی بنیاد ڈالی، جس میں نظم لکھنے کے لیے موضوع دیا جاتا تھا۔ آزاد کی تنقید کی خامی یہ ہے کہ تنقید میں انھوں نے انصاف اور غیر جانب داری سے کام نہیں لیا اور اپنی ذاتی پسند وناپسند کو اہمیت دی۔

علامہ شبلی نعمانی

شبلی کے تنقیدی نظریات نے اپنے زمانے کے ادبی ذوق کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ شبلی کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جمالیاتی نقاد ہیں۔ ان کے نزدیک شعر وادب میں حسن کاری ہی اصل شے ہے۔ شبلی کے نزدیک شاعری دو چیزوں کا نام ہے، محاکات اور تخیل۔ اگر ان دونوں میں سے ایک چیز بھی پائی جائے

تو شعر وجود میں آتا ہے ورنہ نہیں۔شبلی کے تنقیدی افکار کو سمجھنے کے لیے سب سے اہم تصنیف ''شعرالعجم'' ہے۔اس کا چوتھا حصہ بہت اہم ہے جس میں تنقیدی نظریات پیش کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ ''موازنۂ انیس ودبیر'' اور ''مقالات شبلی'' سے بھی شبلی کے تنقیدی نظریات مترشح ہوتے ہیں۔

مولوی عبدالحق

محقق ہونے کے ساتھ ساتھ عبدالحق نقاد بھی ہیں۔ان کے تنقیدی مضامین بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔اعتدال،توازن اور مکمل غیر جانب داری ان کی تنقیدی خصوصیات میں شامل ہے۔یوں تو ان کی تربیت سرسید کے زیراثر ہوئی لیکن ذہنی طور پر وہ حالی کے قریب نظر آتے ہیں۔حالی کی طرح وہ بھی مغربی تنقید سے دور کی شناسائی رکھتے ہیں۔حالی کی طرح ان کا ذہن بھی مشرقی ہے۔وہ غوروفکر کے بہت زیادہ عادی ہیں۔سوچ سمجھ کر قلم اٹھاتے ہیں اور اپنی رائے دوٹوک انداز میں دیتے ہیں۔

نیاز فتح پوری

افسانوں اور انشائیوں کے علاوہ نیاز فتح پوری نے تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ان کے تنقیدی مضامین نے قارئین کو بہت زیادہ متوجہ کیا۔نیاز شعر وادب کی افادیت کے قائل نہیں بلکہ اسے لطف اندوزی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ان کی تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ان کی نظر ادب کے جمالیاتی کیف سے آگے نہیں بڑھتی۔وہ انداز بیان کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ان کی تنقید نے شعر وادب کا ذوق عام کیا۔ ''انتقادیات''،'مالہ وماعلیہ' ان کی اہم کتابیں ہیں۔

مجنوں گورکھپوری

مجنوں گورکھپوری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔انھوں نے ترجمہ نگاری بھی کی۔انھوں نے تنقید کی دنیا میں بھرپور کام کیا۔انھوں نے اردو تنقید کی بنیاد کو بہت مستحکم کیا۔شروع میں وہ نیاز فتح پوری سے بہت متاثر تھے۔اس لیے ابتداءً ان کی تنقید تاثراتی تھی۔اس کے بعد وہ ترقی پسندوں کے ہم نوا بن گئے۔بہت جلد وہ اس سے بھی بیزار ہوگئے۔وہ ادب میں ڈھنڈورے کو پسند نہیں کرتے تھے۔انھوں نے زور دے کر کہا کہ ادب کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ادب کے تقاضوں کو پورا کرے۔''نقوش وافکار''، ''ادب اور زندگی''،''تنقیدی حاشیے''،''تاریخ جمالیات''،''نکات مجنوں'' وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد دنیائے اردو کا ایک معتبر اور اہم نام ہے۔ اردو تنقید میں وہ بت شکن کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کی تنقید مغربی ادب اور خاص طور سے انگریزی ادب کے اثر سے وجود میں آئی۔ انگلستان میں قیام کے وقت ان کو بہت سے مغربی نقاد سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ وہ اردو ادب کو انگریزی ادب کے ہم پلہ دیکھنے کے شدید خواہش مند تھے۔ کلیم الدین کی تنقید نے اردو ادب کو بہت فائدہ پہنچایا۔ ان کی کاوشوں سے ادب کے سرمائے میں بہت اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ ہمارے لیے باعث افتخار ہے۔

کلیم الدین کی تنقید کی خامی یہ ہے کہ ان کی تنقید یک رخی ہے۔ ان کی تنقید میں جا بہ جا برہمی کا اظہار ملتا ہے۔ وہ ترقی پسند ادب سے اس لیے بیزار نظر آتے ہیں کہ وہاں حسن کاری نہیں پائی جاتی تھی۔ انھوں نے ادب میں آفاقی اقدار پر زور دیا۔ بعد کے دنوں میں ان کے یہاں شدت اور انتہا پسندی کی جگہ اعتدال و توازن آ گیا۔ اپنے تنقیدی کارناموں کے لیے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ''اردو شاعری پر ایک نظر''، ''اردو تنقید پر ایک نظر''، ''عملی تنقید''، ''سخن ہائے گفتنی'' اور ''فن داستان گوئی'' ان کی چند اہم کتابیں ہیں۔

آل احمد سرور

آل احمد سرور اردو کے سربرآوردہ نقاد ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین سے موجودہ نسل کے ادبی ذوق کی بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ اردو تنقید کی گمراہیوں کے وقت آل احمد سرور نے رہبری کے فرائض انجام دیے۔ جس زمانے میں ادب کو مخصوص زاویے سے دیکھنے کا رواج تھا، آل احمد سرور نے اسے مختلف زاویوں سے دیکھنے اور پرکھنے پر زور دیا۔ اپنے مضامین کے ذریعہ انھوں نے شعر و ادب کو سب سے پہلے شعر و ادب کی کسوٹی پر پرکھنے اور ادب میں ادبیت تلاش کرنے کی بات کہی۔

سرور صاحب کے یہاں غیر جانب داری، منصف مزاجی اور وسعت قلبی ملتی ہے۔ وہ کسی نظریے سے بندھے نہیں رہے۔ انھوں نے کبھی آزادی فکر و نظر کا سودا نہیں کیا۔ روسی انقلاب کے نتیجے میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن جب اس ادب میں انتہا پسندی آ گئی تو انھوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وہ ادب میں ذہنی عیاشی اور اشتراکیت کے پرچار کے قائل نہیں تھے۔ سرور صاحب کی تنقید کی خوبی ان کا دل نشیں اسلوب ہے جس میں سادگی اور رعنائی پائی جاتی ہے۔ ''تنقید کیا

ہے"، "ادب اور نظریے"، "نئے اور پرانے چراغ"، "تنقیدی اشارے"، "نظر اور نظریے"، "مسرت سے بصیرت تک" اور "دانش وراقبال" ان کی اہم کتابیں ہیں۔

سید احتشام حسین

احتشام حسین افادی ادب کے قائل اور ترقی پسند ادب کے حامی تھے۔ان کے یہاں شعر وادب کا مقصد زندگی کو سنوارنا اور بہتر بنانا ہے۔احتشام حسین کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ادب کے علاوہ جملہ سماجی علوم پر ان کی گہری نگاہ ہے۔مزاج میں متانت کے ساتھ غور وفکر کی عادت ہے۔بہت غور وفکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں،لیکن فیصلہ پر پہنچنے کے بعد اس پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مارکسزم کے انتخاب کے بعد وہ تادم حیات اس پر قائم رہے۔انھوں نے ایک اٹل عقیدے کے طور پر ساری توجہ اس پر صرف کر دی اور دیگر حقائق کو نظر انداز کر دیا۔سخت سے سخت اعتراضات بھی ان کے پائے استقامت کو ڈگمگا نہیں سکے۔ان پر کٹر پن اور شدت پسندی کے الزامات لگے مگر انھوں نے اسے برداشت کیا اور اپنے موقف پر قائم رہے۔

احتشام حسین اس ادب کو پسند کرتے ہیں جو عوام کی امنگوں کا ترجمان ہو،عوام کے مقاصد کو پورا کرے اور ان کی زندگی کو خوشگوار بنائے۔جو ادب اس کسوٹی پر پورا نہ اترے وہ اسے سرمایہ کاری کا آلۂ کار اور عوامی جدوجہد کے خلاف ایک حربہ قرار دیتے ہیں۔ان کے تنقیدی مضامین صاف ستھرے اور سلجھے ہوتے ہیں۔انداز بیان واضح،سنجیدہ اور مدلل ہے۔انھوں نے خالص علمی نثر کو اپنی تنقید کے لیے اپنایا۔ "تنقیدی جائزے"، "روایت اور بغاوت"، "ادب اور سماج"، "تنقید اور عملی تنقید"، "ذوق ادب اور شعور"، "افکار اور مسائل"، "عکس اور آئینے" اور "اعتبار نظر" ان کی اہم تصانیف ہیں۔

اختر حسین رائے پوری

اختر حسین رائے پوری بھی ترقی پسند تحریک کے حامیوں میں سے ایک ہیں۔تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو تنقید کے میدان میں انھوں نے ترقی پسند نقطۂ نظر کو سب سے پہلے پیش کیا۔ان کے تنقیدی نظریات ترقی پسندوں کے حالات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ادب کو وہ زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ وہ ادب کو بھی اقتصادی زندگی کا شعبہ مانتے ہیں۔اختر حسین کے نزدیک ادب کا مقصد صرف تفریح طبع یا

احساس جمال کو تسکین دینا نہیں ہے۔ وہ اس نظریے کو سماج کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ ان کی تنقید میں جذباتیت کی وجہ سے انتہا پسندی پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے ان پر اعتراضات بھی ہوئے۔ اپنے دلکش انداز بیان کی وجہ سے ان کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے اپنے نظریات کو سائنٹفک انداز میں پیش کیا۔ ان کی تنقید میں اشتراکی اور مارکسی تنقید کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ وسیع مطالعے اور یورپ میں قیام کے سبب ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی جس کا اظہار ان کی تنقید میں ہوا۔ ''ادب اور انقلاب'' اور ''سنگ میل'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔

محمد حسن عسکری

تنقید کی دنیا میں حسن عسکری ایک اہم نام ہے، جس کے نظام تنقید میں تہذیب کو مرکزیت حاصل ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ان کے نظریے اپنے ہیں، مستعار لیے ہوئے نہیں۔ یہ نظریے مسلسل غور وفکر کے نتیجے ہیں۔ ان کا انداز بیان طنز آمیز اور تیکھا ہے۔ اکثر مصنفین ان کی زد میں آئے۔ وہ انگریزی ادب کے استاد تھے۔ انھوں نے انگریزی ادب کا بطور خاص مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھی تھی۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ مغربی ادب سے مرعوب نہیں ہوئے۔ دوران مطالعہ انھیں مشرقی ادبیات کا افق زیادہ وسیع معلوم ہوا۔ وہ اس کی طرف پیش قدمی کرتے گئے۔ وہ مشرقی تہذیب کی برتری کے قائل تھے اور ادب میں اس کی کارفرمائی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ تہذیب کے علاوہ نفسیات بھی ان کی توجہ کا مرکز رہی۔ وہ ترقی پسند ادب اور مارکسیت سے بیزار نظر آتے ہیں۔ عسکری کی تنقید کی خامی یہ ہے کہ وہ ادب کے پروپیگنڈا پن کے جواب میں جو تنقید پیش کرتے ہیں وہ سراسر تاثراتی ہوتی ہے۔ مگر اس کی وجہ سے ان کی تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی کتابیں ''انسان اور آدمی''، ''ستارہ اور بادبان'' بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

پروفیسر محمد حسن

پروفیسر محمد حسن کا شمار صف اول کے نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ زندگی اور سماج سے ادب کے گہرے تعلق کے قائل ہیں۔ وہ ادب کو کسی تنگ دائرہ میں قید کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ فن کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں اور فنی قدروں کی عظمت کے معترف ہیں۔ وہ مارکسی نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ سائنٹفک تنقید نگار بھی

ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ہر دور کے سنجیدہ ادب کا مطالعہ لازمی طور پر مصنف کا مطالعہ،عصر حاضر کا مطالعہ اور آفاقی اقدار کا مطالعہ بن جاتا ہے۔وہ آرٹ کو جمالیاتی احساس کی تسکین کا ذریعہ مانتے ہیں۔وہ ترقی پسند ادب اور جمالیاتی اقدار کو ایک دوسرے کا حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے کا معاون و مددگار مانتے ہیں۔ دیگر مارکسی نقادوں کی طرح وہ بھی ادب کو مادی حالات کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ان کی کتاب ''اردو شاعری کا فکری وتہذیبی پس منظر'' سے ان کے تنقیدی تصورات کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔وہ اپنی بات مدلل انداز میں پیش کرتے ہیں۔ان کی دوسری تصانیف ''جدید اردو ادب''، ''معاصر ادب کے پیش رو''، ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' اور ''ادبی سماجیات'' وغیرہ مشہور ہیں۔

وزیر آغا

اردو تنقید میں ڈاکٹر وزیر آغا کا نام بھی معتبر اور مستند ہے۔انھوں نے تہذیبی عوامل کے پس منظر اور اس کی گہرائیوں میں اتر کر اپنی بات پیش کی ہے۔اس لیے ان کی تنقید عام روش سے ہٹ کر ہے۔انھوں نے تہذیب اور کلچر کے علاوہ نفسیات اور دیومالائی زاویوں کے تحت اردو ادب کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اجتماعی لاشعور کی مدد سے کئی فن کاروں کا مطالعہ کیا اور بالکل نئے نتیجے نکالے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے تنقید کے دوسرے طریقوں سے بھی کام لیا۔انھوں نے ادب کا مطالعہ سماج کے تعلق سے بھی کیا۔سماجی مطالعے میں انھوں نے مذہبیات اور علم بشریات سے بھی مدد لی۔ان کی تنقید کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تنقید کے لیے کسی فن پارے کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر یہ کام اس فن پارے پر چھوڑتے ہیں کہ اسے کن کن زاویوں سے دیکھا جائے۔اپنی تنقید میں وہ فن پارے کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اسے مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ان کا انداز بیان شگفتہ اور مدلل ہے۔''اردو ادب میں طنز و مزاح''، ''نظم جدید کی کروٹیں''، ''اردو شاعری کا مزاج''، ''تخلیقی عمل''، ''تنقید اور احتساب''، ''تصورات عقل و خرد'' ان کی اہم کتابیں ہیں۔

سلیم احمد

سلیم احمد کا شمار عہد حاضر کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے تنقیدی نظریات ورجحانات پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور عملی تنقید میں کارنمایاں انجام دیا۔انھوں نے علم نفسیات سے بہت فائدہ اٹھایا۔ان کا شمار نفسیاتی ناقدین میں ہوتا ہے۔اپنی تنقید میں نفسیات پر زور دیتے ہوئے وہ انتہا پسندی کے شکار بھی

ہوئے۔ انھوں نے اردو شاعری کو اس لیے کمتر جانا ہے کہ اس میں جنسی معاملات کی بیباکی کم ہے۔ وہ میراجی اور ن.م راشد کی شاعری کی تعریف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا اصل موضوع جنس ہے۔ اپنی تحریروں میں انھوں نے اس مسئلے پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ لاشعور میں پلنے والی ناقابل ذکر خواہشوں سے نظریں چرانے کے بجائے کوشش کر کے انھیں شعور کی سطح تک لانا اور پھر ان کا اظہار کرنا چاہیے، ورنہ ذہن مریض ہو جائے گا اور اس ذہن سے پیدا ہونے والی تخلیقات بھی مریضانہ ہی ہوں گی۔ اپنے خیالات کی وجہ سے سلیم احمد کو بہت زیادہ اختلاف کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے انداز بیان کو غیر علمی، غیر سنجیدہ اور زہرناک بتایا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ تنقید نہیں کرتے بلکہ فقرے بازی کرتے ہیں اور پھبتیاں کستے ہیں۔ ان کی تنقید میں طنز نگاری کا عنصر بھی شامل ہے اور جن تخلیقات کو وہ پسند نہیں کرتے ان کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ

پروفیسر گوپی نارنگ دور جدید کے بلند پایہ نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ اپنے مضامین سے انھوں نے اردو تنقید میں بیش قیمتی اضافے کیے ہیں، جس سے تنقید میں نئی جہتیں روشناس ہوئی ہیں۔ انھوں نے ادب کو ادب کی نظر سے دیکھا ہے۔ اسے قدیم وجدید اور ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کے دائرے میں قید نہیں کیا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ یہ مطالعہ صرف اردو ادب تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ دوسری زبانوں کا ادب بھی ان کے پیش نظر ہے۔ دوسرے نقادوں کے ساتھ ساتھ جدیدیت کی تحریک کو فلسفیانہ اساس فراہم کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ اسلوبیات ان کا خاص موضوع ہے۔ ادبی تنقید میں وہ اسلوبیات کے تعاون کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں تنقید اپنی توجہ ادب پارے پر مرکوز رکھتی ہے اور اس کی صوتیاتی، صرفی اور معنیاتی پرتوں کو کھولتی اور ان کا تجزیہ کرتی ہے جس سے شعر و ادب کی تفہیم کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔

قمر رئیس

اردو تنقید میں پروفیسر قمر رئیس کا شمار پریم چند اور افسانوی ادب کے ماہر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو نثر، ناول اور بطور خاص پریم چند کی تصانیف کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ ان ہی موضوعات کو انھوں نے غور و فکر کا خاص موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں جو مضامین ان کے قلم سے نکلے وہ سند

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے شعری اصناف پر بھی مضامین لکھے جوان کے انہماک، غور وفکر اور ژرف نگاہی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ قمر رئیس ترقی پسند تحریک سے وابستہ اور مارکسی نظریات کے قائل رہے۔ انھوں نے خود بھی اس دبستان سے وابستگی کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ادب کی تخلیق ایک سماجی فعل ہے اور ادب سماجی حقیقت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود ان کا نقطۂ نظر نہایت متوازن ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی اردو تنقید کے بلند پایہ نقاد ہیں۔ اپنے تنقیدی مضامین میں انھوں نے بہت فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ مختلف نقادوں نے ان کی شدید مخالفت بھی کی لیکن ان کی تنقیدی بصیرت کا آخر کار اعتراف کرنا پڑا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ مغربی ادب پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ انھوں نے ادب کی تفہیم میں اسلوبیات، لسانیات، صوتیات اور دیگر نظریات وعلوم کو پیش نظر رکھا ہے۔ انھوں نے شعر وادب کے مسائل پر آزادانہ غور کیا ہے۔ ان کے تنقیدی افکار ان کے اپنے ہوتے ہیں، مستعار کے نہیں ہوتے۔ اپنی تنقیدوں میں وہ اپنی رائے بیباکانہ پیش کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر اپنی بات کی تائید میں مشرقی اور مغربی مفکروں کی بھی رائیں پیش کرتے ہیں۔ اردو کے قدیم وجدید سرمایے کے علاوہ عالمی ادب کا بھی انھوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا۔ افسانے پر انھوں نے بہت زیادہ کام کیا ہے، لیکن افسانے کو شاعری سے کم تر سمجھا ہے۔ اپنی تحریروں میں انھوں نے وہی زبان استعمال کی ہے جو تنقید کے لیے سب سے موزوں ہے۔ ادبی مسائل پر ان کی رائے بہت صاف اور سوچی سمجھی ہے۔ ان کی تحریروں میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی بات وضاحت اور قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں۔ ''لفظ ومعنی''، ''شعر، غیر شعر اور نثر''، ''عروض آہنگ اور بیان''، ''افسانے کی حمایت میں''، ''تنقیدی افکار'' اور ''شعر شور انگیز'' ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

مذکورہ بالا نقادوں کے علاوہ عنوان چشتی جن کی توجہ کا مرکز اردو شاعری ہے، وہاب اشرفی جو تجزیہ و تحلیل سے کام لینے کے عادی ہیں، وارث علوی جنھوں نے نزاعی معاملات پر بے جھجک لکھا، سید محمد عقیل جنھوں نے ترقی پسند رجحان کی اشاعت میں مدد کی۔ عبدالمغنی جو شعر وادب میں اخلاقی اقدار کی جستجو کے عادی ہیں۔ شمیم حنفی جنھوں نے اپنی تحریروں سے جدیدیت کی تحریک کی وضاحت کی۔ لطف الرحمٰن جنھوں

نے اپنے عہد کے ادب کو نئی تنقید کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی، ایسے نام ہیں جو تنقید کی دنیا میں اپنی اہمیت تسلیم کرا چکے ہیں مگر طوالت کے خیال سے ان کا تفصیلی ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔

ممتاز حسین کی تنقید نگاری

ممتاز حسین کا شمار اردو کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''نقد حیات'' ۱۹۵۰ء میں الہ آباد پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی۔ ان کی اس پہلی تصنیف نے ہی ثابت کر دیا کہ ان کا نقطۂ نظر ادب اور زندگی کو ساتھ لے کر چلنے کا ہے۔ وہ ادب میں مارکسی اور ترقی پسند نظریہ کے حامی تھے۔ مارکسزم سے متعلق ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ ممتاز حسین اردو تنقید کی دنیا میں اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، عزیز احمد اور احتشام حسین کے بعد وارد ہوئے اور اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ بہت جلد اپنی جگہ بنا لی۔ ان کے طرزِ تحریر میں انفرادیت تھی۔ انھوں نے پیش رووں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی ڈگر الگ بنائی اور اس رستے پر ہمیشہ فعال رہے۔ فلسفے سے ان کو گہرا شغف تھا۔ وہ فلسفے کے باقاعدہ طالب علم نہیں رہے لیکن مارکسزم کے مطالعے نے ان کے ذہنی کینوس میں وسعت پیدا کر دی تھی۔ مارکسزم کا مطالعہ وہ باقاعدہ طور پر کرتے رہے۔

ممتاز حسین کا تعلق ترقی پسندی کے ساتھ مارکسیت سے بھی تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی تنقید میں خاصے لبرل واقع ہوئے تھے۔ ادب میں وہ کسی بھی تنگ نظری اور تعصب سے پاک تھے۔ ادب کے معاملے میں ترقی پسندوں کے بعض نظریات سے انھوں نے کھلم کھلا اختلاف کیا۔ ترقی پسندی کی انتہا پسندی کے دور میں جب بعض ادیبوں نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھانے کی تلقین کی تو اس موقع پر سب سے پہلے ممتاز حسین نے ہی ترقی پسند ادیبوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی۔ انھوں نے سوویت روس میں اور خود مارکس اور اینگلز کے زمانے کی بھی ادبی کوتاہیوں کو فراموش نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ممتاز حسین نے انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے منعقد کی گئی ایک تقریب میں کہا تھا:

> ''میرا تعلق ترقی پسند تحریک اور انجمن سے بہت پرانا ہے لیکن میری حیثیت اس تحریک اور اس انجمن میں ایک ناقد کی بھی رہی ہے، یعنی میں ترقی پسندی کے بہت سے ایسے خیالات کو، جن کو میں غلط تصور کرتا تھا،

بے نقاب بھی کرتا رہا ہوں اور میرا یہ رول اس تحریک میں بہت نمایاں رہا ہے۔ یہاں میں یہ یاد دلاتا چلوں کہ جب بھیمڑی کانفرنس کے بعد علی سردار جعفری نے یہ نعرہ دیا کہ ''دوستو! قلم پھینک دو، تلوار اٹھا لو'' تو میں نے اس کے خلاف مضامین لکھے۔''[۱]

ممتاز حسین کے تنقیدی سرمائے میں آٹھ کتابیں — ''نقد حیات''، ''ادبی مسائل''، ''نئی قدریں''، ''نئے تنقیدی گوشے''، ''ادب اور شعور''، ''نقد حرف''، ''حالی کے شعری نظریات'' اور ''مارکسی جمالیات'' شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے نظریاتی مضامین میں جن اصولوں کو پیش کیا ہے انھیں عملاً برتنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریاتی اور عملی مضامین میں تضاد نہیں ہے۔

تنقید نگاروں کے درمیان ممتاز حسین کی پہچان ایک وسیع النظر، وسیع المشرب اور بے تعصب نقاد کی ہے۔ وہ ایک آزاد خیال مفکر اور تنقید نگار تھے۔ ان کی تنقید ترقی پسندی اور مارکسزم سے بلند ہو کر کثیر الجہتی اختیار کر چکی تھی۔ ممتاز حسین کی اسی پہچان کی وجہ سے پروفیسر وہاب اشرفی کا خیال ہے کہ ''ممتاز حسین ایسے نہ تھے کہ لکیر کے فقیر بنے رہتے۔ وہ اکثر لوگوں سے اختلاف کرتے اور اپنی ڈگر بنانے میں زیادہ فعال نظر آتے۔''[۲]

ممتاز حسین کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں: ''وہ کسی بھی مطالعے کو سرسری طور پر پیش کرنے کے خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض کتابیں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ان کی طرف بار بار توجہ کی جا رہی ہے۔...... ایک نقاد اور محقق کی حیثیت سے ان کی جگہ محفوظ ہے۔''[۳]

شہزاد منظر نے ممتاز حسین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے:

''ان کے انتقال کے بعد برصغیر میں ان کے پائے کا کوئی دوسرا نقاد نہیں رہا۔ ممتاز حسین کو اگر صرف ترقی پسند نقاد تسلیم کر لیا جائے (حالاں کہ وہ ترقی پسند تنقید سے بہت بلند درجے پر فائز ہو چکے ہیں) تو بھی ان کے مجموعی کارناموں کے پیش نظر وہ تمام ترقی پسند ناقدوں سے بلند نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ احتشام حسین سے بھی بلند (جو بلاشبہ ترقی پسند

ادب کے بہترین نقاد تھے) احتشام حسین کے مقابلے میں ممتاز حسین کا
پلڑا اس لیے بھی بھاری نظر آتا ہے کہ مرحوم نے نہ صرف احتشام حسین
سے زیادہ کام کیا بلکہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ان سے زیادہ وقیع
کارنامہ سرانجام دیا۔ ممتاز حسین کو اردو کے دیگر ناقدین پر اس اعتبار
سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے دیگر ناقدین کی بہ نسبت چھ مکمل
اور مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ اردو کا دوسرا کون ناقد ہے جس نے
مستقل اہمیت کی اتنی ساری کتابیں چھوڑی ہیں۔''[۴]

ممتاز حسین کے مطالعے، ان کے علمی تعمق، ان کی عقلیت پسندی، حقیقت کی تلاش کو اکثر ناقدین نے جہاں سراہا ہے وہیں ان کے مخصوص انداز بیان کے لیے ان کی تنقید بھی کی ہے۔ سید محمد عقیل اپنی کتاب ''ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ (ہندوستان میں) میں ممتاز حسین کے طرز تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ممتاز حسین کا تنقیدی انداز بیان متعدد جگہوں پر رواں دواں
(Lucid) نہیں ہے۔ ان کی ابتدائی کتابیں خصوصاً ''نقد حیات'' خاصی
مبہم اور پیچیدہ زبان میں لکھی گئی ہے جس کے سبب کبھی کبھی ان کا تنقیدی
نقطۂ نظر خاصہ الجھا ہوا ہوتا ہے۔ کسی ایک نکتے کو اٹھا کر وہ تاریخ،
متھالوجی اور دیگر سماجی نیز نفسیاتی مسائل میں ایسا کھو جاتے ہیں کہ اصل
نکتے کی تفہیم بہت دور جا پڑتی ہے۔ یہ غالباً ان کے بے حد عمیق مطالعے
کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اپنی پہلی کتاب نقد حیات کے بعد وہ اپنا یہ
انداز دھیرے دھیرے بدل لیتے ہیں۔ پھر ان کی تفتیش قدرے عام فہم
ہو جاتی ہے۔ نقد حیات کے بعد ان کی دیگر کتابیں خاصی وضاحت کے
ساتھ لکھی گئی ہیں۔ پھر بھی ان کی تحریر کا تاثر اور فکری تعمق ان کی تنقیدوں
کو وزن اور وقار کے ساتھ لے کر چلتا ہے جس سے وہ اپنے ہم عصروں
میں ایک ممتاز اور اہم ناقد نظر آتے ہیں۔''[۵]

ممتاز حسین کے ابتدائی مضامین کی ثقالت اور بعد میں زبان کی بہتری کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے کہ:

''ممتاز حسین کے ابتدائی مضامین میں انداز بیان کی ثقالت بہت گراں گزرتی ہے اوران کا نثری اسلوب بہت ادق اورژولیدہ معلوم ہوتا ہے مگر ادب عالیہ کی بحث نے ان کی زبان کو خراد پر چڑھا کر خاصا ہموار کر دیا۔ بعد کی تنقیدی تحریروں میں یہ عیب کم ہوتا گیا ہے، اگرچہ علمی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ اب بھی خاصی بوجھل نثر لکھتے ہیں اوران کے ایسے مضامین سے استفادہ کرنے کے لیے قاری کو صبر وضبط کی، بہت سی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنے اسلوب پر قابو پالیں تو ان کی تنقیدی اور علمی بصیرت اور بھی عام ہوسکتی ہے۔ ان کے حالیہ مضامین میں ''نثر معلّٰی'' اور رسالہ در معرفت استعارہ خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔''[۶]

ممتاز حسین کے طرز تحریر کے بارے میں پروفیسر نورالحسن نقوی کا خیال ہے:

''انھوں نے قلم اٹھایا تو نہایت پختہ خیالات قارئین کے سامنے پیش کیے ..... زبان پر انھیں پوری گرفت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اکثر الجھاؤ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو قطعیت کے ساتھ ادا نہیں کرپاتے۔''[۷]

مذکورہ بالا اقوال کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ممتاز حسین کی تحریروں میں جہاں کچھ خامیاں نظر آتی ہیں وہیں بہت سی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ مشہور ناقد سید محمد عقیل کے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ ''ممتاز حسین کی تنقید عقلیت پسندی، سماجی اور تاریخی صورتوں سے اصلیت کی تلاش کا بہترین نمونہ ہیں جس میں جمالیات اور نفسیات کی جابہ جا عملی اور امکانی بحثیں اس طرز تنقید کو بے حد وقیع بناتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ مارکسی طرز تنقید کا بھی یہ مثالی نمونہ بنتی ہیں۔''

(ب) ممتاز حسین اور نظری مباحث

فلسفہ جمال:

زمانۂ قدیم سے ہی مفکرین نے جمالیات اور ادب وفن کے تعلق پر غور کیا ہے۔ افلاطون اور ارسطو سے لے کر زمانۂ جدید تک کے دانش وروں نے اس پر اظہار خیال کیا ہے، انھوں نے نئے نئے گوشے تلاش کیے اور اپنی تشریحات ونظریات کو ادب اور فن سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ جمالیات کے فلسفے کا موضوع حسن اور فنون لطیفہ ہے۔ اپنی وسعت اور گہرائی میں یہ تمام زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ علم و زندگی کے تقریباً تمام گوشے اس کے دائرۂ عمل میں آجاتے ہیں۔

ادب اور زندگی کی بنیادی قوتوں کے ساتھ ساتھ جمالیات پر بھی ممتاز حسین کی بڑی گہری نگاہ تھی۔ انھوں نے جمالیات کے موضوع پر چھ مضامین لکھے ہیں۔ [۹] آرٹ میں حسن کے تعین اور حسن و جمال کے مسائل پر ممتاز حسین نے عالمانہ انداز میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ وہ آرٹ کے حسن اور فطرت کے حسن کو ایک دوسرے سے خلط ملط کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں آرٹ کا حسن اپنا ایک مخصوص وجود رکھتا ہے جسے نہ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کا تجزیہ بھی کیا جاسکتا ہے یعنی اس کی خارجیت اور اس کی تخلیق کے قوانین کا تعین ہوسکتا ہے۔ ان کے بقول کسی بھی شے سے بھرپور حظ اٹھانے کے لیے اسے سمجھنا یا ادراک میں لانا ضروری ہے۔ وہ آرٹ میں خیال کو منکشف کرنے کا ذریعہ احساس کو مانتے ہیں۔ ان کے مطابق احساس جسم ہے، خیال روح ہے۔ احساس صورت ہے، خیال متن ہے۔ صورت یا احساس کا حسن اس بات میں ہے کہ وہ خیال کو روشن کرے اور خیال کا حسن اس بات میں ہے کہ وہ اپنے کو محسوس کرائے۔ ان کا خیال ہے کہ جمالیاتی جذبہ ایک خارجی شے ہے۔ آرٹ کا حسن فطرت کے حسن کا مرہون منت نہیں ہے۔ یہ انسان کی مادی تخلیق کے حسن سے مستعار ہے۔ [۱۰]

ممتاز حسین احساسِ جمال کا رشتہ ادراک سے جوڑتے ہیں جس کا براہ راست تعلق احساس اور شعور سے ہوتا ہے۔ وہ احساس اور خیال کو مشترک تسلیم کرتے ہوئے جمالیاتی حظ کو شعور کے اظہار اور صداقت کی مصوری سے ہم آہنگ قرار دیتے ہیں۔ ادب کی افادیت اور جمالیاتی حظ کے درمیان کوئی ناقابل عبور

خلیج نہیں محسوس کرتے۔ احساس صورت کی شکل اختیار کر کے خیال کو روشن کرتا ہے اور حسین بنتا ہے۔ خیال بھی اپنے آپ کو محسوس کرا کے حسین بن سکتا ہے۔ دونوں کا کام حقائق کو زیادہ سے زیادہ منکشف کرنا اور محسوس کرانا ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''جمال ایک داخلی شے کے باوجود خارجی شے ہے۔ اس کی خارجیت اس بات میں مضمر ہے کہ جمالیاتی جذبے کے ذریعہ جس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی مطابقت خارجی حقیقت سے ہونی چاہئے کیوں کہ خیال اگر وہ حقیقی ہے کسی نہ کسی خارجی حقیقت ہی کا عکس ہوگا۔ یہی وہ طریقہ کار ہے جس کے ذریعہ ہم احساس جمال کو بھی متعین کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ایک چیز نظر انداز نہ کرنی چاہیے۔ عام تعلیم اور فنی تعلیم میں فرق ہے۔ عام تعلیم کے ذریعہ آرٹ کے حسن کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کام کے لیے فنی تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔''[۱۱]

جمالیاتی حظ صرف خارجی قوانین کے برتنے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق شعور کے اظہار یا صداقت کی مصوری سے بھی ہے۔ جمالیاتی حظ انسان کے دل و دماغ میں اس وقت انگڑائی لیتا ہے جب کہ اس شے کی حقیقت تک براہِ راست پہنچا جائے اور میڈیم کی رکاوٹ محسوس نہ ہو، فطرت کا حسن انسانی ذہن سے اپنا الگ وجود رکھتا ہے۔ فنی تخلیقات کا حسن انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ اسے انسان کے ذہنی ارتقا کے تناظر میں دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ انسان اپنی فن کارانہ تخلیقات میں ان سب رموز و نکات سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اس نے فن کو جلا بخشنے کے لیے دریافت کیے ہیں۔ ممتاز حسین کا تصور جمال انسان مرکز تصور ہے۔ ان کا یہ تصور ہیگل کے اس تصور سے مختلف ہے جس میں حسن یا حسن کاری کا عمل ذہن مطلق کا رہین منت ہوتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ممتاز حسین کے اس تصور پر مارکس اور اینگلز کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ انھوں نے مارکس اور اینگلز کے تصورات کو دانستہ طور پر قبول کیا ہے۔ اس کے باوجود ان کی اپنی شخصیت بہر حال برقرار رہتی ہے۔ اپنی شخصیت کو برقرار رکھنے کا یہ عمل ان کے یہاں سنجیدگی پیدا کرتا ہے اور یہ سنجیدگی ان کی اپنی ذات کا عکس ہے۔

ممتاز حسین کے خیال میں احساس جمال یا جمالیاتی حظ حاصل کرنے کی صلاحیت انسانی تمدن کی پیداوار ہے۔اس کی تخلیق میں انسان نے اپنی ادراک کی قوت،قوت ارادی،عمل اور انسانی جذبات کوجنم دیا۔وہ لکھتے ہیں:

''احساس جمال یا جمالیاتی حظ حاصل کرنے کی صلاحیت عطیۂ فطرت نہیں بلکہ خالصتاً انسانی تمدن کی پیداوار ہے۔اس کی تخلیق اسی طرح ہوئی جس طرح انسان نے اپنی قوت مدرکہ،قوت ارادی،عقل اور انسانی جذبات (اخوت ومحبت، ہمدردی،انسانیت وغیرہ) کوجنم دیا۔۱۲؎

اخیر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممتاز حسین ادب میں افادیت ومقصدیت کے ساتھ اس کی جمالیاتی قدروں پر بھی اصرار کرتے ہیں۔

ادب اور ادیب:

ادب اور زندگی کے بنیادی رشتوں پر ممتاز حسین گہری نگاہ رکھتے ہیں۔وہ ادب کو زندگی کا آئینہ سمجھتے ہیں۔وہ فلسفے کی طرح ادب کا مقصد زندگی کی تعبیر وتفہیم تصور کرتے ہیں۔ان کے یہاں ادب کا مقصد زندگی کی مقصدیت اور معنویت کی تلاش ہے۔ادب کے اسی تصور کی وجہ سے وہ فلسفے کی طرف مائل ہوئے تھے۔ مختلف فلاسفہ کے مطالعہ سے ان کے خیالات میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہوئی۔اس مطالعہ سے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا اس کا نہایت خوب صورت اظہار''رسالہ درمعرفت استعارہ''،''ادب روایت، جدت اور جدیدیت''،''ادب ایک اسلوب اختلاف کا''،''جوش فکر وفن کے آئینے میں'' اور دیگر مضامین میں کیا ہے۔

ممتاز حسین ادب کو خارجی حقیقت کا آئینہ تصور کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ادب ادراک حقیقت میں بھی مدد کرتا ہے۔ان معنوں میں ادب جسمانی، ذہنی، جذباتی زندگی کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی مدد سے کسی بھی زبان کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ادب ان کے یہاں کچھ تو انسان کی بدلتی ہوئی نفسیات کی کہانی ہے اور کچھ انسانی اقدار کی تبلیغ کا ایک آلہ کار ہے جس کے وسیلے سے انسان اپنی انسانیت کو پانے یا تکمیل کی کوشش کرتا رہا ہے۔ادب کا عوامی زندگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''ادب کی جڑیں عوام کی زندگی میں پیوست ہوتی ہیں۔ ادب کی تخلیق
میں محنت کش انسانوں کی مشقت کا حصہ ہوتا ہے۔ ادب اپنے اصلی
روپ میں حقیقت کی بنیاد تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ زندگی کے
پورے مرقع کو پیش کرتا ہے۔ یہ حقیقت کی گونا گوں اور متضاد طاقتوں
کے درمیان اس کی بڑھتی اور ابھرتی شکل کو سامنے لاتا ہے۔ یہ حقیقت
کے بے شمار پہلوؤں میں ایک ایسی وحدت دریافت کرتا ہے جو ان سب
کو ایک اکائی میں پرو سکتا ہے۔''[۱۳]

ادب انسان کی تعمیر میں بہت اہم کردار نبھاتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اس کو انسان بناتا ہے۔ ادب کا تعلق اخلاق سے بہت گہرا ہے۔ وہ اخلاق جو تخلیقی قوت کا حامل ہوتا ہے وہ انسان کی عزتِ نفس کو بیدار رکھتا ہے۔ یہ اخلاق محبت کے رشتے سے جنم لیتا ہے۔ شعر و ادب توہین انسانیت کے خلاف رہتا ہے۔ ادب آزاد شخصیت کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ چناں چہ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''شعر و ادب کا ایک گہرا رشتہ اخلاق سے ہے مگر اس اخلاق سے جو تخلیقی
قوت کا حامل ہوتا ہے اور جو گداگری اور کاسہ لیسی کو توہین انسانیت سمجھتا
ہے اور اس اخلاق سے جو محبت کے رشتے سے جنم لیتا ہے مگر آزادی کو
برقرار رکھتا ہے۔ اس شعر و ادب کے بہت سے اسالیب ہیں۔ مگر جب
گفتگو آدمی سے آدمی کے لہجے میں ہوتی ہے تو وہ شاعری ہے ورنہ
پند و موعظت۔ ایسا ہی ایک نکتہ شاعری کی ساخت اور بناوٹ میں بھی
پوشیدہ ہے۔ موزونیت اس کی قبا، بالیدگی اس کی فطرت اور شعور اس کا
آئینہ ہے۔ جبر سے اس کو تنفر ہے۔ ادب آزاد شخصیت کا اظہار ہے''۔[۱۴]

ممتاز حسین نے تخلیقی ادب کی بنیادی خصوصیت بتاتے ہوئے کہا کہ وہ ایک آزاد شخصیت کی خود متحرک تخلیق ہوتی ہے۔ اس کی دوسری بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خصوص سے عموم کی طرف اور محسوس سے معقول کی طرف سفر کرتی ہے اور اسی کے ساتھ تاریخی اور مقامی حدود سے بلند ہونے کی کوشش کرتی

ہے۔انھوں نے شاعری کی فلسفیانہ خصوصیت کے بارے میں ورڈس ورتھ کا یہ قول نقل کیا ہے:

''مٹی اورآب وہوا، زبان اور ثقافت، رسوم اورقوانین کے اختلاف کے باوجوداوران ساری چیزوں کے باوجود جوذہنوں سے محوہوچکی ہیں یا اجنبی قدموں کے نیچے پامال ہوچکی ہیں، شاعر اپنے جذبے اور علم سے اس انسانی معاشرے کے اقلیم کومتحد رکھتا ہے جوتمام روئے زمین پراور تاریخ کے سارے ادوار پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔'' ۱۵

ممتاز حسین نے ادب کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے بڑے نکتے کی باتیں کہی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ہم ادب میں انسانی صداقت کی جستجو کرتے ہیں۔ یہ وہ صداقت ہوتی ہے جو اضافی ہوتے ہوئے مطلق سے ہم کنار رہتی ہے اور صداقت ہوتے ہوئے بھی غیر صداقت سے بھی منسلک رہتی ہے، ادب میں اس صداقت کی تصدیق ادب کی عام اپیل اور مقبولیت سے ہوتی ہے۔قوموں کی تاریخ میں انقلاب کا واقع ہونا اس اپیل کا ایک عملی جواب ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کا ساراا اہم اور قدر آفریں ادب پرانی اقدار کو چیلنج کرنے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

ادب زندگی کی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ ہمارے جذبات اوراحساسات کو پاکیزہ بناتا ہے۔ وہ انسان کی قوت ارادی کوتقویت پہنچاتا ہےاورآدمی کوزیورانسانیت سے آراستہ کرتا ہے۔ادب میں شخصیت، تاریخ اور یونی ورسیلٹی ان تینوں ہی کا اظہارایک وحدت میں ہوتا ہے۔ادب کا مقصد یہ ہے کہ وہ نئی قدریں جوعوام کی محنت نے خلق کی ہیں انھیں انسان کی نفسیات کا جزو بنادے۔انسان کواز سرنو حقیقت سے متعارف کرائے پہلے وجود کے خلاف جنگ لڑنے پر اکسائے اور پرانے طریق فکر، عادت وخصلت اورنفسیاتی ردعمل کے جواب میں نیا طریق فکر، نئی عادتیں اور نیا نفسیاتی ردعمل پیدا کرے۔ادب حقیقت پر دوطریقے سے اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ اگرایک طرف خارجی حقیقت کو بدلتا ہےتو دوسری طرف انسانی نفسیات کو۔ یہ خارجی حقیقت اورنئی نفسیات دونوں ہی کی تنظیم کرتا ہے۔ادب کا کام انسانی نفسیات کومنظّم کرنا ہے۔

ادب پر اقتصادیات، سماجی علوم، سائنس اور فلسفے کا گہرا اثر واقع ہوتا ہے۔ اگر ادب ان علوم سے فائدہ حاصل نہیں کرتا ہےتو اپنے مقصد میں زیادہ کام یاب نہیں ہوسکتا۔ دوسرے علوم کی طرح سائنس اور

ادب ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ دونوں کے میل سے ہی انسان کی تخلیقی قوت کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''سائنس اور ادب ان ہی معنوں میں ایک دوسرے کے ممد و مددگار ہیں۔ وہ دونوں مل کر ہی انسان کی تخلیقی قوت کی مکمل نمائندگی کرتے ہیں۔''۱۶

کسی بھی معاشرہ، ملک یا قوم کی تعمیر میں ادیب کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ادیب قومیت کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ وہ اپنی قوم کے انفرادی خدوخال کو ابھارتا ہے۔ اس کی روحانی اور مادی ترقی کی منزلوں کا تعین کرتا ہے۔ اسے ایک نصب العین دیتا ہے۔ اس کا تعمیری کردار ملک وقوم تک ہی محدود نہیں رہتا۔ وہ بہ یک وقت پوری انسانیت کا بھی ترجمان ہوتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں وہ سارے عالم کے اقوام کی مشترکہ خصوصیات کو ابھارتا ہے۔ وہ ایسے تمام تنازعات اور اختلافات کو جو باہمی جنگ وجدال اور سرد مہری کے باعث اٹھتے رہتے ہیں، انھیں وہ وحدت انسانی کے ایک وسیع پس منظر میں پیش کر کے ان کے درمیان صلح جوئی، اخوت ومحبت اور دل گیری سے رسم وراہ بھی پیدا کرتا ہے۔ ادیب کی قومیت کی تعمیر کا یہ کام اس وقت بہتر طریقے سے ہو پاتا ہے جب وہ اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار اپنی قومی زبان میں کرتا ہے۔ اس طرح وہ ادب قومی سرمایہ بن جاتا ہے۔ اس قومی سرمائے کی حفاظت قوم کی بڑی ذمہ داری ہے۔ اس ادب کو تفنن طبع کے طور پر نہیں پڑھنا چاہیے۔ اس صورت میں ادیب کی اعلیٰ سے اعلیٰ تحریر کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ممتاز حسین نے سامراجی طاقتوں کے خلاف کسی بھی قوم کے ادیب اور شاعر کی کوششوں کو سراہا ہے۔ ظلم وتشدد کے خلاف ادیبوں کی تخلیقات قومیت کے جذبے کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ قومیت کی تعمیر میں ادیب بہت فعال کردار ادا کرتا ہے۔ وہ قومی تعصب سے دور رہتا ہے۔ وہ روشن ضمیری اور انسان دوستی کے جذبے پر کار بند ہو کر سرگرم عمل رہتا ہے۔ وہ قوم کی آنکھ، ناک، کان اور ضمیر سبھی کچھ بن جاتا ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''یہاں یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ ادیب آنکھ بند کر کے قومیت کی تعمیر میں حصہ نہیں لیتا ہے اور نہ وہ قومی تعصب ہی کو راہ دیتا ہے بلکہ اس کے

برعکس وہ اس کام میں روشن ضمیری اور انسان دوستی کے ساتھ ساتھ سرگرم
عمل رہتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف دیدہ بینائے قوم ہے، اس کے کردار
اور اس کے نصب العین کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے تو دوسری طرف وہ ضمیر
انسانیت بھی ہے۔ وہ نہ صرف اسی قوم کے انسانی اور فطری حقوق کے
لیے جدوجہد کرتا ہے بلکہ دوسری اقوام کی آزادی اور انسانی حقوق کے
لیے جدوجہد کرتا ہے اور اس جدوجہد میں ہر فرد کے فطری اور انسانی
حقوق کی جدوجہد شامل ہے۔'' ۱۷

''ادیب اور آزادیٔ رائے'' ممتاز حسین کا بہت فکر انگیز مضمون ہے۔ اس میں مغربی افکار کی روشنی میں سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے وہ آزادیٔ رائے پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ آزادیٔ رائے کو انھوں نے ہر فرد و بشر کا حق تو مانا ہے لیکن وہ ادیب کے لیے اسے بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر اس کو انھوں نے تھوڑا مشروط کر دیا ہے۔ وہ ادیب کی فضیلت تسلیم کرتے ہیں بشرطیکہ وہ آدمی پہلے ہو اور ادیب بعد میں اور اس کا ادب تادیبی نہ ہو بلکہ غم گسار ہو۔ ادیب کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی فن پارے میں اپنی رائے کا اظہار برائے آزادیٔ رائے نہیں کرتا بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ جس رائے کو ابلاغ کے لیے منتخب کرتا ہے اسے وہ بہ حیثیت ایک عالم گیر اصول یا بہ حیثیت آفاقی سچائی پیش کرتا ہے اور اس کا خواہش مند ہوتا ہے کہ جس رائے کو اس نے آزادی سے منتخب کیا ہے وہ دوسروں کی بھی ویسی آزادانہ منتخب رائے بن سکے۔

ادیب کی آزادی رائے کے بارے میں ممتاز حسین نے دو سوال قائم کیے ہیں۔ اول جب ادیب بنیادی حیثیت سے ایک حقیقت کا تخیلی روپ ہے اس کو کس حد تک عقل کے معیار سے جانچنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ کس حد تک ایک باشعور ادیب پر عام انسانوں کے مقابلے میں اظہار رائے کی آزادی حاصل کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا ہے کہ اس کی رائے کو صرف معقولیت کے تصورات سے نہیں جانچنا چاہیے بلکہ اس سلسلے میں چشم تخیل کو بھی راہ دینی چاہیے اور اگر وہ زیادہ تلخ و ترش ہے تو اس کو برداشت کرنا چاہیے۔ ہر بڑا ادیب اور ہر بڑا مفکر اپنی غیر معمولی بصیرت رکھنے کے باعث اپنے زمانے کی تاریخی حدود سے بہت آگے سوچتا ہے۔ ادیب اور آزادی رائے کے تعلق سے

ممتاز حسین نے اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے:

''ادیب اور آزادیٔ رائے کے رشتے کی صحیح پوزیشن میرے نزدیک یہ ہے
کہ ادیب آزادیٔ رائے کا صرف طالب ہی نہیں بلکہ خالق بھی ہوتا ہے۔
وہ آزادی کی بھیک نہیں مانگتا ہے بلکہ آزادی حاصل کرتا ہے اور اس کی
دولت سارے لوگوں میں تقسیم کرتا ہے اور جس طرح کہ انسان کے آزادیٔ
عمل کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح اس کی آزادیٔ فکر کی بھی کوئی حد نہیں ہے
کیوں کہ آزادی کسی بھی تخلیق یا تخلیقی عمل کی اولین شرط ہے۔ اور انسان اپنی
نوع بنوع تخلیقات ہی سے زندہ ہے۔''۱۸

مارکسی جمالیات:

ممتاز حسین کو اردو کے دیگر ناقدین پر ایک لحاظ سے اس لئے بھی فوقیت حاصل تھی کہ انھوں نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ فلسفے سے ممتاز حسین کی دل چسپی مارکسزم کے مطالعے سے شروع ہوئی اور بتدریج بڑھتی گئی۔ ان کا مارکسزم کا مطالعہ صرف روس کی سرکاری مطبوعات تک محدود نہ تھا۔ انھوں نے انگلینڈ، امریکہ اور جرمنی سے مارکس اور اینگلز کی شائع ہونے والی تصانیف اور مراسلات کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ زندگی کے آخری ایام میں انھیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ سوویت یونین میں بعض سیاسی مصلحتوں کے باعث مارکس کی بعض ایسی اوریجنل تحریریں شائع ہی نہیں ہوئیں، جو جرمن زبان میں موجود ہیں اور جو بعد میں مغربی ممالک میں شائع ہوئیں۔ ممتاز حسین کا نہ صرف کلاسیکی مارکسزم کا مطالعہ وسیع تھا، بلکہ مغرب میں مارکسزم سے متعلق ہونے والے تازہ ترین کام اور مباحث سے بھی وہ واقف تھے۔ انھیں جب ۱۹۸۹ء میں دہلی یونیورسٹی میں ''نظام لکچر'' دینے کے لیے مدعو کیا گیا تو اس وقت بھی انھوں نے مارکسزم سے متعلق جدید تر تصانیف کا مطالعہ جاری رکھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا:

''میں نے ۱۹۸۹ء میں نظام لکچر کے تحت ''مارکسی جمالیات'' پر جو کچھ کہا
اس سے مارکسی تحریروں کے اقتباس سے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ اب

تک جن خیالات کو ہمارے ترقی پسند ادیب مارکس سے نسبت دیتے
رہے ہیں وہ اس کی اصل تحریروں میں نہیں ہے۔ مارکس اول تو شاعری
اور فنون لطیفہ کو روحانی تخلیق بتلاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس کی حیثیت
مادی تخلیقات کی طرح استعمال کیے جانے کی نہیں ہے، بلکہ انسانی شعور
کو حسن کاری کے ذریعے بیدار کرنے کی ہے۔ اس کا سفر زمین سے
آسمان کی طرف اور معلوم سے نامعلوم کی طرف ہوتا ہے۔ اس کا حسن
تخیل کو راہ دینے میں ہے، چناں چہ جہاں وہ ایک طرف تاریخی حقائق
کی مصوری کا بھی قائل ہے وہاں دوسری ادبی تخلیقات کی دائمی کشش
کا بھی قائل ہے اور اس سلسلے میں اس نے یونانی ادب کے بیشتر حوالے
دیئے ہیں۔'' ۱۹

مارکسی جمالیات پر ممتاز حسین سے قبل بشمول مجنوں گورکھپوری دوسرے نقادوں نے بھی مضامین لکھے ہیں لیکن ممتاز حسین کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر ایک مستقل اور مبسوط کتاب لکھی۔ اس کتاب کا عنوان ہے ''مارکسی جمالیات''۔ مارکسی جمالیات دراصل ممتاز حسین کا نظام لکچر ہے۔ نامور شاعر اور نقاد پروفیسر قمر رئیس نے اس لکچر کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔ ممتاز حسین نے یہ کتاب مارکس کے بنیادی آخذ کی روشنی میں لکھی۔ یہ اردو میں مارکسی جمالیات پر عمدہ ترین کتاب کہی جاسکتی ہے۔ اس کتاب میں ممتاز حسین نے فلسفیانہ اور مفکرانہ انداز میں مارکسی جمالیات کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے جمالیات سے متعلق مارکس کے خیالات کو ہر زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں مختلف بنیادی نکات مثلاً شعور، تاریخ، مادی جبریت، پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں کا تخلیقی سرگرمیوں سے تعلق وغیرہ نکات کا معروضی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تمام بنیادی نکات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے اس مقالے میں جہاں اس بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی
ہے کہ شعور کی مادی، اقتصادی بنیاد یا ڈھانچے کا ایک عکس کے ساتھ
بدلنے میں، منقلب کر دینے میں مددگار رہتا ہے۔ یعنی وہ ایک جہان نو

کی تعمیر میں بڑا فعال کردار ادا کرتا ہے، وہاں اسی کے ساتھ ساتھ اس
بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مارکس کے فلسفے پر جو الزام لگایا
جاتا ہے کہ وہ اقتصادی جبریت کا فلسفہ ہے، وہ درست نہیں کہ مارکس اور
اینگلز دونوں ہی زندگی کو متغیر کرنے والے عوامل میں تنہا اقتصادی تحریک
کو فیصلہ کن نہیں بناتے ہیں بلکہ شعوری تحریکات کو بھی اسی عمل میں شریک
کار قرار دیتے ہیں۔'' ۲۰

ممتاز حسین کے فلسفے کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مقالے میں انھوں نے افلاطون، ارسطو، پارمنائڈیز وغیرہ سے گفتگو کا آغاز کر کے ڈیکارٹ تک کے خیالات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد کانٹ اور تجربی فلسفیوں کے نظریات سے بحث کی ہے۔

اپنی تصنیف ''مارکسی جمالیات'' میں ممتاز حسین نے جمالیات سے متعلق مارکس کے خیالات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ جائزے سے قبل انھوں نے مارکس کی نجی زندگی کے بارے میں اجمالاً ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ایام شباب میں مارکس ایک شاعر اور عاشق دونوں تھا۔ اپنی مادری زبان جرمن کے علاوہ وہ لاطینی اور روسی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے واقف تھا اور اس میں پڑھنے لکھنے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ مطالعے کا بے حد شوقین تھا۔ اس کے مطالعے کے شوق کے بارے میں ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''انگلستان کے قیام کے زمانے میں وہ تیس برس تک مسلسل برٹش
میوزیم لائبریری میں بلا ناغہ اس طرح روز جایا کرتا تھا کہ اس لائبریری
میں داخل ہونے والوں میں وہ پہلا شخص اور وہاں سے رخصت ہونے
والوں میں وہ آخری شخص ہوتا۔'' ۲۱

مارکس کے شوق کے بارے میں ممتاز حسین مزید لکھتے ہیں:

''وہ ہر سال یونانی ڈرامے بالخصوص ایس کیلس کے ڈرامے، یونانی
زبان میں پڑھا کرتا اور اس کے خاندان کے لوگ، بشمول اس کے
ہر سال شیکسپیئر کے سارے ڈراموں کے پڑھنے کا ایک تہوار سا منایا

کرتے۔ اسے شاعروں میں دانتےؔ، شیکسپیئرؔ اور گوئٹےؔ بہت پسند تھے۔
انگریزی شعرا میں وہ شیلیؔ کو بہت پسند کرتا اور اسے اپنے قبیلے کا یعنی
انقلابی بتاتا۔ ناول نگاروں میں اسے سروانتے، بالزاک، ڈکنز،
اسکاٹ، تھیکرے اور فیلڈنگ بہت پسند تھے۔'' ۲۲

مارکس کو جمالیات کے موضوع سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ اس موضوع پر ایک کتاب لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی رہی ہوگی کہ ''داکیپٹل'' لکھنے میں اسے وقت لگا۔ اس سلسلے میں ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''کارل مارکس اپنی تصنیفی زندگی کے ابتدائی امکانات میں جمالیات
کے موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا خواہش مند تھا، لیکن ''سرمائے'' کی
حقیقت معلوم کرنے میں وہ اس قدر زیادہ مشغول ہوگیا کہ وہ یہ کام نہ
کرسکا۔'' ۲۳

ممتاز حسین نے اپنا زیادہ تر وقت سماجی شعور کی روشنی میں زندگی، ادب اور اس کے متعلقات کو سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کیا۔ ساختیات کے بعض مباحث جو برصغیر کے رسالوں میں شائع ہوئے وہ ان کا تذکرہ بھی اپنی گفتگو میں کرتے تھے۔ اس قسم کی تحریکوں کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ یہ سب آرٹ اور ادب کو Dehumanize کرنے کی کوششیں ہیں۔ مارکسی جمالیات میں وہ لکھتے ہیں کہ ''آرٹ اور ادب کو Dehumanize کرنے کی کوشش دورحاضر کی ادبی اسٹرکچرلزم میں بھی نظر آتی ہے۔ اس تحریک کے بعض شارحین اکثر مارٹن ہیڈگر کے اس قول کو نقل کرتے ہیں:

''آدمی زبان کے ذریعے نہیں بلکہ زبان آدمی کے ذریعے بولتی ہے۔'' ۲۴

اس قول کے ساتھ ساتھ وہ لیوی اسٹراسن کے اس قول کو بھی نقل کرتے ہیں:

''آدمی متھ سے مخاطب نہیں ہوتا ہے بلکہ متھ آدمی سے گفتگو کرتی ہے۔'' ۲۵

جمالیات فن کا بنیادی عنصر ہوتا ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ انسان برخلاف حیوان، جمالیاتی قوانین کو مدنظر رکھ کر ادب یا فن کی تخلیق کرتا ہے یا ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حیوانات کا عمل جبلی ہوتا ہے۔

اورانھیں یہ جبلی خصوصیت فطرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔لیکن انسان کا تخلیقی عمل محض جبلی دائرے میں محدود نہیں ہے۔انسان مختلف یادوں کو جمالیاتی قوانین جو خارجی، معروضی ہوتے ہیں، کے مطابق تخلیقی روپ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ جمالیاتی تصورات سماجی زندگی اوراس کی ساخت، تاریخی حالات اورطبقاتی جدوجہد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ محض مجرد تصورات نہیں ہوتے۔

ممتاز حسین کی تحریروں میں ان کے تصور جمالیات کا جابجا اظہار ہوا ہے۔ان کا یہ تصور افلاطون سے لے کر مارکس تک کے نظریات کے مطالعہ اور ذاتی غوروفکر سے پیدا ہوا ہے۔ مارکسی جمالیات میں وہ لکھتے ہیں:

> ''افلاطون نے یہ بات بہت پہلے طے کردی تھی کہ حسن کی کوئی تشریح حسین شے کے حوالے کے بغیر نہیں کی جاسکتی یعنی حسن کی وضاحت حسین شے سے کرنی چاہیے چنانچہ یونانیوں کے نزدیک کائنات میں سب سے حسین شے خود انسان تھا۔افلاطون اورارسطو کے عہد کے بعد کے زمانے میں اسکندریہ کے فلوطینس نے خدا کو حسن قرار دیا اور ہمارے صوفیا نے ''اللہ جمیل ویحب الجمال'' کا ورد کرتے ہوئے حسن پرستی شعار کی، لیکن یہاں گفتگو فن کارانہ ادبی تخلیق کی حسن کاری تک محدود رکھوں گا جس کا اظہار اس کی فنی تخلیقات میں ہوتا ہے۔فنی تخلیقات کے حسن پر غور کرتے ہوئے ہمیں اس بات کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ فنی تخلیق، خواہ اس کی کتنی ہی آمد کیوں نہ محسوس ہوتی ہو، اکتساب ہنر یا آرائش کی شعوری کوشش سے آزاد نہیں ہوتی۔اس لیے انسان کی فنی تخلیقات اس حقیقی نامیاتی وحدت اور زندگی کے حسن کی حامل نہیں ہوسکتیں جو لالہ وگل کے نامیاتی حسن اوران کی زندگی سے عبارت ہے۔''[۲۶]

ممتاز حسین نے اپنے مقالے کے اخیر میں ہیگل کی جمالیات کا ایک اقتباس دیا ہے اور وہ اسے مارکسی جمالیات کے برخلاف تصور نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے وہ مارکسی جمالیات کے برخلاف نہیں ہے۔ ہیگل اس موضوع سے بحث کرتے ہوئے کہ کیوں کر آرٹ بہیمانہ جذبات کو انسانی جذبات میں تبدیل کرتے ہوئے یعنی شدت غم کو ادبی اظہار دیتے ہوئے ہمیں جذبے کی ضرر رسانی سے بچاتا ہے، وہ اعلیٰ سنجیدہ موسیقی اور پروقار مرثیوں کو اس پہلو سے بہت سراہتا ہے کہ وہ ہمیں ناامیدی کے طوفان میں ڈوبنے سے بچاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ یہ کہتا ہے کہ آرٹ کا اخلاقی نظریہ یہ نہیں ہے کہ اس سے آدمی کے چال چلن کی اصلاح اس طرح کی جائے جس طرح کہ ایک واعظ کرتا ہے۔ اس سے نہ تو اخلاق کی خدمت ہوتی ہے اور نہ آرٹ کی، بلکہ اس سے آرٹ کی تذلیل ہوتی ہے، آرٹ اپنے بلند مقام سے نیچے گر جاتا ہے۔ لیکن اگر آرٹ کا کام انسان کی ذات اور اس کے پوشیدہ امکانات کا سراغ لگانا ہے ..... تو وہ آرٹ خواہ کتنا ہی چونکا دینے والا کیوں نہ ہو، ہماری روحانی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔'' ۲۷

اپنی کتاب مارکسی جمالیات میں ممتاز حسین نے دور وسطیٰ کے جمالیاتی تصورات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ نشاۃ ثانیہ کے انسان پرست جمالیات کے ربانی تصورات کے خلاف مارکس کی بغاوت اور انسان کو اس کے کھوئے ہوئے مقام کو واپس دلانے کی ان کی کوششوں کو بیان کیا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہوئی گفتگو اور پیش کردہ اقتباسات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمالیات فلسفہ کا ایک حصہ ہے۔ یہ ادب اور فنون کی قدر شناسی میں معاون ہوتا ہے۔ عہد جدید کے ادبی تصورات کو مارکسی نظریات نے بھی متاثر کیا ہے۔ ادب کی جمالیات کی تفہیم میں مارکسی نظریات کس طرح معاون ہوتے ہیں، ممتاز حسین نے مارکس اور اینگلز کی تحریروں کی روشنی میں اس مسئلے پر غور و خوض کیا ہے اور اپنی کتاب مارکسی جمالیات میں اس کے خدوخال اور امکانات کا بہتر طور پر جائزہ لیا ہے۔

شعری نظریات:

ممتاز حسین کے کئی مضامین مثلاً ''زبان اور شعر کا رشتہ''، ''تخیل کی دنیا اور حقیقت''، ''آرٹ میں حسن کا تعین''، ''جمالیاتی حظ اور افادیت''، ''اسلوب'' اور ''تکنیک'' وغیرہ سے ان کے شعری نظریات کا اندازہ لگتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے ہر عمل اور تخلیقی جذبہ کی بنیاد کو مادی اور خارجی حقیقت کا پابند سمجھتے ہیں۔ کسی بھی فن پارہ یا صنف سخن کے جائزہ میں ان کی نظر سماجی زندگی، ذہنی، فکری اور تہذیبی روایات پر ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کی طرح تخلیقی عمل کو بھی مادی تحریک کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ذہن بھی مادہ ہی کا ایک جز ہے جس سے ادب اور فن قوت ادراک کے ذریعہ تخلیق پاتے ہیں یہاں تک کہ ذہن اس وقت تک کوئی حسّی تصور پیش نہیں کر سکتا جب تک اس میں ذہنی حرکت کی شمولیت نہ ہو۔

یہ کوئی نئی بحث نہیں ہے کہ شعر و ادب کی تخلیق میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں، کس فن پارۂ ادب کی تشکیل کے در پردہ کون سے محرکات ہوتے ہیں، یہ بحث ابتدا سے چلی آ رہی ہے۔ فرائڈ اور مارکس کے نظریات کی اشاعت کے بعد اس مسئلے نے اس وقت اختلافی شکل اختیار کر لی جب ان دو مخالف اصولوں کے حامیوں نے اسے اپنے اپنے طریقے سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مارکسی اصولوں کے زیر اثر ممتاز حسین نے مادہ کے عنصر اور خارجی حقیقت کو فنی تخلیق کا بنیادی جز قرار دیا لیکن فرائڈ کے اصولوں سے شدید مخالفت کے باوجود انھوں نے بہت سے ایسے خیالات پیش کیے جو تحلیل نفسی کے نظریوں کے منافی تو ہو سکتے ہیں لیکن جدید نفسیاتی اصولوں کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

ممتاز حسین تخلیق میں شخصیت کے عنصر کے اثر انداز ہونے کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ہربرٹ ریڈ کے اس خیال سے متفق ہیں کہ فن کی بنیادی قوت آ گہی ہے لیکن وہ اس بات سے اختلاف کرتے ہیں کہ شخصیت صرف جذبات اور احساسات تک محدود ہے کیوں کہ اس طرح شاعری کا عمل اقلیم سخن سے خارج ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ فنی تخلیق میں محض لاشعوری کیفیات کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ شعور کے دخل کا بھی اقرار کرتے ہیں۔

زبان و شعر کے باہمی رشتے سے متعلق سامراجی ممالک کے ناقدین کے رویہ پر ممتاز حسین خفا نظر

آتے ہیں۔ ممتاز حسین نے ان کے اس خیال کی سخت تنقید کی ہے کہ شاعری صرف زبان کے ایک مخصوص استعمال کا نام ہے، اور پھر اس کی نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ ایسے ناقدین کیوں اس خیال کے حامی ہیں۔ ان کے خیال میں وہ ایسی شاعری سے اس لیے برہم ہیں کہ وہ انسانی شعور کی ترجمان ہے اور یہ شعور سرمایہ دارانہ یا سامراجی نظام کی بنیاد ہلانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ترقی پسند مفکرین کے اس خیال سے کہ شعر شعور کے اظہار کا ایک طریقہ کار رہے، کسی حد تک متفق نظر آتے ہیں۔

زبان وشعر کے باہمی رشتے کے سلسلے میں ممتاز حسین کا خیال ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں۔ دونوں ہی سماجی زندگی کی پیداوار ہیں۔ ان میں کسی ایک کو بھی اوّلیت نہیں دی جاسکتی۔ البتہ اہمیت دی جاسکتی ہے تو انسان کی اس محنت شاقہ کو دی جاسکتی ہے جس کی وجہ سے وہ انسان بن سکا۔ اس سلسلے میں وہ کارل مارکس کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

> ''زبان اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ شعور...... زبان عملی شعور ہے۔ چوں کہ اس کا وجود دوسروں کے لیے ہے، اس لیے وہ میرے لیے بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ زبان شعور کی طرح اس ضرورت سے پیدا ہوئی کہ دوسروں کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا جائے۔[۲۸]

زبان وشعر کے رشتے کے سلسلے میں ممتاز حسین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب زبان اور شعور لازم وملزوم ہیں۔ دونوں کی پیدائش آپسی تبادلۂ خیال کی ضرورت کی وجہ سے ہوئی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ شاعری کو ''صرف'' زبان کے ایک مخصوص استعمال کا نام دیا جائے اور اسے شعور کی ترجمانی نہ سمجھا جائے حالاں کہ شاعری شعور ہی کا ایک ذریعہ اظہار ہے۔ انسان نے صحیح معنوں میں زبان یا قوت نطق گلے میں عضوی تبدیلیوں کے پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ذہن میں حقیقت کے ادراک کے ساتھ حاصل کی۔

جہاں تک شاعرانہ تخیل کا تعلق ہے ممتاز حسین اسے حسّیہ تصویروں کے ذریعہ سوچنے کا عمل بتاتے ہیں ان کے بقول اردو تنقید میں اس کے صحیح مفہوم کو متعین کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی ہے۔ ممتاز حسین کے یہاں شاعرانہ تخیل حِسّیہ تصویروں کے ذریعہ ایک سوچ ہے جو روشن اور محسوس نقش کو ذہن میں ابھارتی ہے جس سے ادراک اور جذبات کا ملا جلا سانچہ تیار ہوتا ہے۔ اسی کو انگریزی زبان میں Imagination اور

اردو زبان میں عام طور پر قوت متخیلہ کہا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں یہ لفظ Image سے ماخوذ ہے۔ چناں چہ اردو زبان میں تخیل کا لفظ دراصل اس مفہوم کی ترجمانی کرتا ہے۔ ممتاز حسین کے خیال میں ادب کے انحطاطی دور میں تخیل کو صرف خیال آفرینی کا مترادف سمجھ لیا گیا جس کی وجہ سے اس کا حسیاتی روپ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شاعرانہ تخیل ایک ایسی شے ہے جس کے بغیر ہم نہ صرف شاعری کو بلکہ کسی بھی قسم کے آرٹ کو سمجھنے سے قاصر رہ سکتے ہیں۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ اساطیری عہد سے شاعری میں موجود رہی ہے۔ یہ چیز شاعری کا ذریعۂ اظہار اس لیے بنی کہ اس ابتدائی دور میں انسانی فکر کا صرف یہی اکیلا طریق کار رہا۔ ابتدائی انسان ہمیشہ محسوس تصویروں کے ذریعہ ہی سوچتا تھا۔

دور جدید میں انسانی ذہن میں فلسفیانہ طور پر نہیں بلکہ اکتسابی طور پر حقیقت کو منعکس کرنے، سماج کی ماہیت کو معلوم کرنے اور اس کو آگے بڑھانے کی زیادہ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ انسان اپنی زندگی میں سکھ، دکھ، خوشی و غم جیسے بہت سے نفسیاتی تجربے سے گزرتا ہے۔ لیکن شاعر اس کو دوسری طرح سے محسوس کرتا ہے۔ اس کو ایک شعر کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کہیے　　　کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

جب شاعر رنج کو گراں نشیں اور صبر کو گریز پا کہتا ہے تو ان میں ایک ایسی محسوس کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو مجرد تصورات میں نہیں ملتی۔ حِسّیہ تصویروں کے ذریعہ سوچنا اسی کو کہتے ہیں۔ یہ صورت آفریں تخیل فاعل اور مفعول کے رشتوں کو ادراکی اور جذباتی دونوں پہلوؤں سے ابھارتا ہے۔ ۲۹

آرٹ میں حسن کے تعلق سے ممتاز حسین کا خیال ہے کہ اس کا تعلق اولین طور سے ادراک سے ہے۔ اس لیے اسے داخلی کیفیت نہیں کہہ سکتے۔ اس کی یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہر وہ شے جو ادراک کے طریقۂ کار سے گزرتی ہے اپنا ایک خارجی وجود رکھتی ہے۔ یہ ایسا وجود ہوتا ہے جسے نہ صرف محسوس کیا جا سکتا بلکہ اس پر غور بھی کیا جا سکتا۔

ممتاز حسین جمالیاتی جذبہ کو خارجی شے بتاتے ہیں۔ وہ اس جمالیاتی جذبہ کو حیوانی جبلت آرائش سے مختلف بتاتے ہیں۔ حیوان میں یہ جذبہ جبلّی ہوتا ہے اور ایک ہی نمونے کا پابند ہوتا ہے۔ اس کے برعکس

انسان میں یہ جذبہ شعوری ہوتا ہے اور مختلف قسم کا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ جمالیاتی جذبہ انسان کی اپنی تخلیق ہے اور یہ چیز اس کی مزید خارجیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ انسان اسے مشاہدے سے حاصل کرتا ہے۔ یہ فطرت سے حاصل ہوتا ہے۔ حسن کا یہ احساس نہ تو دیو مالائی ادب میں ملتا ہے اور نہ ہی زمانہ قدیم کی نقاشی میں۔ ممتاز حسین نے ان لوگوں کے رویے پر حیرت کا اظہار کیا ہے جو تحیر کے جذبے کو فن کی بنیاد ٹھہراتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسے لوگ نہ صرف آرٹ کی تاریخ سے ناواقف ہیں بلکہ تحیر کے جذبے سے بھی نابلد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ جذبہ انسان میں فطرت کے حسن کے مشاہدے سے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی اپنی مادی اور ذہنی تخلیقات کے جلو میں پیدا ہوا ہے جن میں مشاہدہ فطرت کا علم شامل ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ فطرت کے مناظر کے حسن کا احساس نہ تو دیو مالائی ادب میں ملتا ہے اور نہ قدیم زمانے کی نقاشی میں۔ یہ چیز آرٹ میں بہت بعد کے زمانے میں آئی ہے۔ ہمارے وہ بزرگ جو تحیر کے جذبے کو فن کی بنیاد ٹھہراتے ہیں، وہ نہ صرف آرٹ کی تاریخ ہی سے ناوقف ہیں بلکہ تحیر کے جذبے سے بھی۔'' [۳۰]

فنون لطیفہ ہو یا شعر وادب اس کی تکنیک کے بارے میں ممتاز حسین کا خیال ہے کہ یہ اضطراری یا جبلی تخلیق نہیں ہوتی۔ یہ ایک شعوری تخلیق ہوتی ہے جو صورت و معنی کی باہمی کشاکش یا اندرونی تضاد کی بنا پر ارتقا پذیر قوانین حسن کی پابند ہوتی ہے۔ اگر یہ قوانین خارجی ہیں، انسان کی نیت سے آزاد ہو کر عمل پیرا ہیں، تخلیقی مظہر کے ادراک کا نتیجہ ہیں تو ان سے آزاد رہ کر ادبی تخلیق وجود میں نہیں آسکتی۔

اشتراکی سماج میں جمالیات کے قوانین وضع کرنے کے بارے میں ممتاز حسین کی رائے بالکل واضح ہے۔ ان کے خیال میں اشتراکیت جس طرح سرمایہ دارانہ نظام کی سیاسی معیشت کے قوانین پر دسترس حاصل کر کے پیداواری رشتوں سے استحصال کرنے والے عناصر کو خارج کر دیتی ہے یا پیداوار میں رکاوٹ پیدا کرنے والے عناصر پر قدغن لگاتی ہے اسی طرح وہ جمالیات کے قوانین پر زیادہ سے زیادہ

دسترس حاصل کر کے ادبی مظہر سے ایسے سارے عناصر کو خارج کر سکتی ہے جو ادب کو زیادہ سے زیادہ انسانوں کی زندگی کے لیے مفید، توانا، تندرست اور حسین بنانے میں حائل رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سوویت روس نے اپنے ادب سے ایسے عناصر کو خارج کر دیا۔'' ۳۱؎

ادب میں تکنیک کے استعمال کے سلسلے میں ممتاز حسین کا خیال ہے کہ اوّل تو ادب میں زبان کا استعمال ایک مخصوص صورت پر ہوتا ہے۔ اس لیے زبان پر مہارت کے حصول کے بغیر ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ زبان کا تصور بغیر خیال کے ممکن نہیں۔ اگر تصنیف ادراک حقیقت میں ٹھیک ہو لیکن زبان کے حسن اور حسیاتی روپ سے عاری ہو تو اسے ادبی تخلیق کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، لیکن اس کی سماجی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ممتاز حسین نے نظم ونثر دونوں میں تکنیک کے استعمال پر اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے ناول نگاری، ڈرامہ نگاری دونوں میں تکنیک کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ناول میں پلاٹ کو انھوں نے ناول کی منطق کا نام دیا ہے۔

غزل کے اشعار میں جمالیاتی پہلو کی تلاش کے سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ غزل کے اشعار جمالیاتی تعلیم کے صرف ایک ہی پہلو کو انجام دے پاتے ہیں۔ غزل کا شاعر منفرد اور محسوس سے عام کی طرف آتا ہے لیکن جمالیاتی تعلیم کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان یعنی مجرد اور تعمیم شدہ خیالات کو منفرد اور محسوس کے لباس میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کام کے لیے تفصیل نگاری اور وضع حکایت درکار ہے اور یہ مقصد نظم ہی کے مختلف پہلوؤں کے اصناف کے اپنانے سے پورا ہو سکتا ہے۔ ۳۲؎

(ج) ممتاز حسین اور عملی تنقید

(i) کلاسیکی ادب:

امیر خسرو:

''امیر خسرو حیات اور شاعری'' ممتاز حسین کی ایک معرکتہ الآراء تصنیف ہے۔ اسمیں امیر خسرو سے متعلق کئی حقائق کو پہلی بار منظر عام پر لایا گیا ہے۔ ممتاز حسین کی یہ تصنیف تنقید میں تحقیق کی کارفرمائی اور ناگزیریت کو ظاہر کرتی ہے۔ انھوں نے امیر خسرو کی ابتدائی زندگی سے متعلق کئی اہم معلومات فراہم کی ہیں مثلاً امیر خسرو کی جائے پیدائش پٹیالی نہیں بلکہ دہلی تھی۔ خسرو مخلوط ازدواج کی پیداوار تھے۔ ان کے والد ترکی النسل تھے اور والدہ ایک نو مسلم راجپوت عہدہ دار کی بیٹی تھیں۔ امیر خسرو کے والد کا ترکی نام لاچین اور اسلامی نام شمس الدین تھا۔ خسرو کی مادری زبان ہندوی تھی جس میں انھوں نے اشعار کہے ہیں۔

خسرو شناسی میں علامہ شبلی، پروفیسر محمد حبیب اور ڈاکٹر وحید مرزا کے نام بہت اہم ہیں جن کی تصانیف حوالے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ان تصانیف میں مذکورہ دانشوروں نے بہت عرق ریزی سے خسرو سے متعلق حقائق فراہم کیے ہیں لیکن خسرو کے والد کے نام کے تعین اور خسرو کی جاءِ پیدائش کے بارے میں ان سے چوک ہوئی ہے۔ ممتاز حسین نے اپنی اس تصنیف میں اپنے استدلال سے ثابت کیا ہے کہ خسرو کی جاءِ پیدائش جو کہ پٹیالی بتائی جاتی ہے وہ غلط ہے اور اصل جائے پیدائش دہلی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود خسرو کے بیانات اور اشعار پیش کیے ہیں۔ مصنف کے بیان میں اس وقت اور بھی قطعیت پیدا ہو جاتی ہے جب وہ خسرو زبان سے اپنے موقف کی حمایت میں یہ کہلواتے ہیں:

> ''خسرو لاچین بندۂ کمترین'' اپنے شاہانہ نام سے نادم ہانک پکار کر کہتا ہے کہ اس بندۂ کمترین کے والد کا نام لاچین ہے۔'' [۳۳]

امیر خسرو کی جاءِ پیدائش کے بارے میں ممتاز حسین بڑی قطعیت کے ساتھ لکھتے ہیں:

> ''امیر خسرو سے متعلق جہاں بہت سے افسانے گھڑے گئے، ایک

افسانہ یہ بھی وضع کرلیا گیا کہ وہ پٹیالی میں پیدا ہوئے تھے۔'' ۳۴؎

خسرو کے ہندوی اور فارسی دونوں کلام بہت مقبول ہوئے۔ خسرو کے کلام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے دوسرے شعراء نے بھی ان کے انداز میں شعر کہنے کو ذریعہ افتخار سمجھا۔ مشہور مؤرخ سید حسن عسکری نے ممتاز حسین کو اس بات پر خراج تحسین پیش کیا کہ انھوں نے تنقیدی محاکمہ کر کے اس حقیقت کا کافی ثبوت بہم کیا ہے کہ حافظ شیرازی نے غزل گوئی میں خسرو کی پیروی کی ہے۔'' ۳۵؎

پاکستانی تنقید نگار شہزاد منظر نے اپنی کتاب ''پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال'' میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے آرکیالوجکل سروے آف انڈیا کے سابق ڈائرکٹر زیڈ۔ اے۔ دیسائی نے مصنف کو اپنے ایک خط میں لکھا:

> ''۱۹۷۵ء کے بعد یونسکو کی طرف سے امیر خسرو کے سلسلے میں جتنے یوم منائے گئے اور حکومت اور دیگر پرائیوٹ اداروں سے جو بھی یادگاری کتابیں شائع ہوئیں ان میں ممتاز حسین کی تصنیف مذکور کی حیثیت نہ صرف اس وقت بلکہ آنے والے دنوں میں بھی حرف آخر رہے گی۔''

پروفیسر شارب ردولوی نے ممتاز حسین کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے:

> ''ممتاز حسین کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان کی جدید تصنیفات میں ''غالب ایک مطالعہ'' اور'' امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری'' بہت اہمیت رکھتی ہیں جس کے تذکرے کے بغیر ان کے تنقیدی نظریے پر کوئی گفتگو مکمل نہیں کہی جاسکتی''۔ ۳۶؎

پروفیسر شارب ردولوی اس کتاب کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

> ''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری'' ان کی تنقیدی بصیرت کے ساتھ ساتھ ان کی تحقیقی دقت نظر کو بھی پیش کرتی ہے۔ اس کے ذریعہ امیر خسرو کے بارے میں بہت سی باتیں پہلی بار سامنے آئی ہیں۔ یہ کتاب تنقید

میں تحقیق کی اہمیت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔''۳۷

ممتاز حسین کی اس تصنیف سے ان کے مطالعے کی وسعت، تجزیاتی طریقہ کار، نتائج کی قطعیت اور تنقیدی اسلوب میں تخلیقیت کی شان واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس تصنیف سے ان کے ایک عمر کے غور وفکر، دریافت، تجربے اور محنت شاقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

میر امن:

میر امن دہلوی کے عہد میں اردو نثر میں تصنع اور بناوٹ کا دور دورہ اور لفاظی وعبارت آرائی کا بول بالا تھا۔ مسجع اور مقفیٰ عبارت کا دستور تھا۔ یہ میر امن کا کمال ہے کہ اس نے باغ و بہار لکھ کر سادگی، صفائی اور سہل نگاری کا راستہ دکھایا۔ باغ و بہار کوئی طبع زاد تصنیف نہیں ہے۔ یہ ترجمہ ہے لیکن اسے اردو کے نثری ادب میں نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے۔ اردو نثر کو لفاظی، عبارت آرائی، قافیہ اور وزن کی پابندی سے نجات دلانے کی طرف یہ پہلا انقلابی قدم تھا۔ باغ و بہار کی سادگی میں غضب کی دل کشی ہے۔ اس کی سادہ و بے تکلف نثر نے اردو کو ایک نیا راستہ دکھایا اور اہل قلم کو یہ احساس دلایا کہ سادگی کا حسن بناوٹی حسن سے زیادہ جاذبیت رکھتا ہے۔ اور زبان اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب وہ رنگینی، پیچیدگی، لفاظی اور بناوٹ سے نجات پالے۔ باغ و بہار کی اسی خوبی کے اعتراف میں سرسید نے کہا تھا: ''میر امن کو اردو نثر میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو میر تقی میر کو شاعری میں حاصل ہے۔'' میر امن نے عربی و فارسی الفاظ کے استعمال سے جہاں تک ہوسکا ہے پرہیز کیا ہے۔ انھوں نے قصداً عام بول چال کے الفاظ لانے کی کوشش کی ہے۔ ہندی الفاظ کو بالعموم ترجیح دی ہے۔

باغ و بہار کی ابتدا میں میر امن نے کہانی لکھنے کا سبب بھی لکھا ہے۔ انھوں نے بھی عطا حسین کی طرح یہی کہا ہے کہ یہ امیر خسرو کی چہار درویش پر مبنی ہے۔ محققین بتاتے ہیں کہ خسرو کی اس نام کی کوئی تصنیف نہیں تھی۔ لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ فارسی میں اس طرح کی کہانیاں رائج تھیں کیوں کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے تین ترجمے اردو زبان میں ہوئے۔ کئی محققوں کا خیال ہے کہ میر امن نے اس کا ترجمہ فارسی سے نہیں کیا بلکہ تحسین کی کتاب نوطرز مرصع کو سامنے رکھ کر اسے بول چال کی آسان زبان میں لکھ دیا

ہے۔خود میرامن نے لکھا ہے کہ ''جان گل کرسٹ صاحب نے لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ، ہندو مسلمان، مرد عورت، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔'' ترجمہ کرتے وقت میرامن نے فارسی کتاب بھی دیکھی، مگر اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے زیادہ تر تحسین کی نوطرز مرصع کا ہی تتبع کیا ہے۔ کہانی ایک ہی ہے مگر دونوں کے اسالیب اتنے مختلف ہیں کہ دو کتابیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرامن نے محمد معصوم کے چہار درویش کے جس نسخہ سے ترجمہ کیا وہ اپنے متن میں اس سے مختلف ہو جس پر تحسین کی کتاب بنی ہے۔ میرامن نے حقیقت میں ٹھیٹھ ''ہندوستانی'' زبان کا استعمال کیا ہے اور اس نے اس کو بہت خوب صورت بنا دیا ہے۔ ترجمہ ہوتے ہوئے بھی یہ خود میرامن کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اس کے ترجمے ہندی اور یورپی زبانوں میں ہو چکے ہیں اور وہاں کے نقادوں نے بھی اس کی ستائش کی ہے۔

باغ و بہار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعے سے اس زمانے کی معاشرت کا جیتا جاگتا مرقع سامنے آ جاتا ہے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی سماجی حالت اور خصوصاً مسلمانوں کی ثقافتی زندگی کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور جاگیردارانہ سماج کے طور طریقے، خورد و نوش، لباس و زیورات، اخلاقی تصورات، ہر مسئلے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں سنسکرت اور بھاشا کے لفظ اس خوب صورتی سے لیے گئے ہیں جیسے انگوٹھی پر نگ جڑ دیا گیا ہو۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ میرامن کی باغ و بہار ان تصانیف میں سے ہے جو ایک بار پیدا ہونے کے بعد نہیں مرتیں۔

قصہ چہار درویش علامتی یا تمثیلی قصہ ہے۔ یہ تمثیلی قصہ چار درویشوں کی سیر میں ہے نہ کہ چھوٹے ضمنی قصوں میں یا آزاد بخت بادشاہ کی سرگزشت میں، جہاں خواجہ سگ پرست کا قصہ اس منفی اخلاقی قدر کی تبلیغ کے لیے وضع کیا گیا ہے کہ ''انسان بے وفا بدتر از حیوان است'' یعنی بے وفا انسان حیوان سے بدتر ہے۔ اس قصہ کی روح تک پہنچنے کے لیے ہمیں اس کی اوپری پرت کو اتار کر دیکھنا ہوگا جس میں اخلاقی اقدار کی تبلیغ کے بہت سے ضمنی قصے بھرے پڑے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اس کی اندرونی پرت اور بالائی پرت یا اس کی روح اور جسم کے درمیان کوئی تضاد ہے بلکہ ان دونوں میں مقاصد کی ہم آہنگی

ہے۔ اگراس کی اندرونی پرت ایک روحانی تجربے کی صوفیانہ تعمیم حقیقت پیش کرتی ہے تو اس کی بالائی پرت صوفیانہ اقدار کی تبلیغ وترسیل کی خدمت انجام دیتی ہے اورفن کار کے یہ دونوں عمل جو ایک وحدت میں پروئے ہوئے ہیں، آرٹ کی طرح مصور ہیں۔

چاروں درویشوں کے روحانی سفر کا نچوڑ یہ ہے کہ ان چاروں سیروں میں انقلاب حقیقت جادو اور سحر سے کم اور عشق کی کرامت سے زیادہ دکھایا گیا ہے۔ عشق کی کرامات میں تائید غیبی اور فوق الفطرت طاقتوں کی امداد کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ ایک موقع پر اسم اعظم کے عمل سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن یہ عمل پھر دوہرایا نہیں گیا ہے۔ کل ملا کر جیت کا سہرا اسم اعظم کے سر نہیں رہتا ہے بلکہ عشق صادق کی راہ میں جان کی بازی لگانے اور امداد غیبی پر بھروسہ کرنے میں ملتا ہے شہزادے ہوں یا کہ خواجہ زادے، عشق کی دولت سے فیض یاب ہوکر ملک ومال اور تاج وتخت کی طرف نہیں لوٹتے ہیں بلکہ فقیر اور درویش بن جاتے ہیں۔ فقر وقناعت، صبر وتوکل اختیار کرتے ہیں اور یاد الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ ۳۸

جن وپری، اسم اعظم، تعویذ گنڈے، جھاڑ پھونک کے عقیدے کے سلسلے میں ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ

اس پر لوگوں کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کیوں کہ میر امن کے زمانے میں ان پر لوگوں کا ویسا ہی عقیدہ تھا جیسا ان دنوں ڈاکٹروں کے علاج پر ہے۔ ہمارا نفسیاتی نقطۂ نظر ویسا ہی تھا جو کہ اس داستان میں ہے۔ موجودہ دور میں بھلے ہی اس کی اہمیت نہ ہو لیکن اس زمانے میں تو اس کا ایک زندہ اور حرکی تصور موجود تھا۔ ممتاز حسین کا خیال ہے کہ اسے صرف داستان کی تکنیک سے دیکھنا چاہیے ناول کے تکنیک سے نہیں۔ کیوں کہ دونوں کے درمیان ذہنی ارتقا کا فاصلہ، میٹریل اور تکنیک میں بھی فرق ہے۔ داستان کا میٹریل روزمرہ کی زندگی سے نہیں بلکہ خواب وخیال کی دنیا سے لیا جاتا ہے جہاں حقیقت پر تخیل کا ایک سحر آفریں سایہ سا لرزتا رہتا ہے۔ اس دنیا میں فوق الفطرت فطری اور فطری فوق الفطرت بن جاتی ہے۔ داستانوں کے واقعات کے پیچھے اسباب وعلل کا کوئی مجرد قانون نہیں ہوتا۔ یہاں تو ہر حادثہ مشیت ایزدی کی تعمیل کا آلہ کار تصور کیا جاتا ہے اور جو حادثات کہ انسان کے عمل سے صورت پذیر ہوتے ہیں ان میں بھی مشیت ایزدی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جس طرح انسان میں خیر وشر کی دو متضاد طاقتیں ہیں اسی طرح فوق الفطرت دنیا کے افراد یعنی جن وپری کو بھی خیر وشر کی طاقتوں میں بٹا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ چناں چہ داستانوں کے افراد کی

زندگی میں ٹریجڈی کچھ انھیں کی قوت ارادی کے ٹکراؤ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں فوق الفطرت ہستیوں کے ارادوں کو بھی دخل ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے رنج کو راحت میں بدلتے وقت فوق الفطرت ہستیوں کی مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ ۳۹

قصہ چہار درویش کا پلاٹ قصہ در قصہ، منطقی تسلسل یا اندرونی ارتباط سے بے نیاز ہے۔ اس میں بھی دوسرے داستانوں کی طرح بہت سے واقعات بغیر کسی سبب کے یا ''قضارا'' رونما ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ جس وقت تیسرے درویش کی سیر میں شہزادئ فرنگ تلوار پھینک کر اپنے عاشق سے لپٹ جاتی ہے اور وزیر اس کے اس فعل پر شہزادے کو قتل کرنے کے لیے تلوار اٹھاتا ہے تو ایک تیر غیب سے ناگہانی اس کی پیشانی پر آ کر لگتا ہے۔ ۴۰

داستانوں میں زمان و مکان کا تصور بھی دور حاضر کے تصور زمان و مکان سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں زمان و مکان کا تصور کیفیاتی ہوتا ہے نہ کہ کمیاتی۔ داستان گو اپنے قصوں کا محل وقوع دور دراز کے ملکوں میں رکھتا ہے اور اس کے لیے ماضی کا زمانہ منتخب کرتا ہے تا کہ محیر العقول باتوں پر یقین کیا جا سکے۔ اس لیے تمہید قصہ میں نہ کہ قصے میں اس کا التزام کیا جاتا تھا کہ اس پر حقیقت کا دھوکہ ہو مثلاً شہر نیم روز کسی نے نہیں دیکھا ہے لیکن داستان گو نے اسے ملک عمان میں دکھایا ہے۔ داستان میں بتائے گئے کسی شہر یا ملک کو حقیقی تصور کرنے پر قاری دھوکہ کھا سکتا ہے۔ کبھی کبھار تمہید قصہ میں زمان و مکان سے متعلق جو تفصیلات پیش کی جاتی ہیں تو اس کا مقصد قصے کو یقین آفرین بنانا ہوتا ہے۔ یہاں پر محض جغرافیہ اور تاریخ کا فریب پیش کیا جاتا ہے نہ کہ اصل جغرافیہ اور تاریخ۔ کہتے ہیں کہ داستان کا مصنف کچھ جاگتا اور کچھ عالم خواب میں ہوتا ہے۔ اس کے لیے کیا چین و ماچیں اور کیا اصفہان، ان کے فاصلے چٹکی بجاتے طے ہو جاتے ہیں۔

ممتاز حسین نے ناول کے نقادوں کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ داستان گو کو کردار نگاری کے گر سے واقفیت نہیں ہے۔ ان کے کردار ساکت ہیں، یک طرفہ ہیں، کثیر الاوضاع نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں ان کا خیال ہے کہ یہ ساری باتیں کسی اور داستان کی کردار نگاری کے بارے میں صحیح ہو سکتی ہیں مگر میر امن کے داستان کے کرداروں کے بارے میں صحیح نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ شخصیت کا تصور ہر عہد میں بدلتا رہتا ہے، لیکن کوئی بھی عہد ایسا نہیں گزرا ہے جس میں اس کے بننے یا بگڑنے کا معیار نہ رہا ہو۔ ہم

جس عہد کی باتیں کر رہے ہیں اس میں شخصیت کا ایک مثالی تصور خلاف فطرت تصور نہیں کیا جاتا۔

قصہ چہار درویش کی نوعیت کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ اس کی بنیادی حیثیت صوفیانہ ہے۔ صوفیوں کے یہاں جنگ وجدال اور معرکہ کارزار نہیں ہوتا بلکہ صلح جوئی اور امن وآشتی ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''چوں کہ یہ داستان بنیادی حیثیت سے صوفیانہ ہے اس لیے اس میں جنگ وجدال اور معرکہ کارزار تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ کہیں کہیں تلوار اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس موقع پر ہیرو مبارزت طلبی کے بدلے مسکینی اور عاجزی سے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ دوسرا درویش شہزادۂ نیم روز کے روبرو اور تیسرا درویش مقتول شہزادۂ فرنگ کے کوکا کے سامنے اسی طرح پیش آتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چوں کہ یہ قصہ درویشوں کی روحانی سیر کا ہے اس لیے یہ التزام برتا گیا ہے کہ ان کے ہاتھ سے کس کا قتل نہ کروایا جائے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ جب تیسرے درویش کی سیر میں لڑائی کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ درویش شہزادیٔ فرنگ کو بھگاتا ہے اور غنیم کی فوج اس کا تعاقب کرتی ہے، تو اسکے معرکے کو صرف داروغہ بہزاد خاں سر کرتا ہے اور درویش کھڑا تماشا دیکھتا ہے، لیکن داستان گو نے رزم آرائی کی ساری کمی کو اس ایک گھڑی میں پوری کر دیا ہے۔ داروغہ بہزاد خاں کی مبارزت طلبی کا جو انداز ہے وہ ہمیں داستان کے خواب سے چونکا دیتا ہے اور ہم ان درویشوں کے بیچ ایک جواں مرد کو جو دلی کا کوئی بانکا سپاہی ہے، اس طرح نعرہ زن پاتے ہیں:

جب شہزادہ دروازے پر آیا۔ ایک نعرہ مارا اور تیر سے قفل کو توڑا اور نگہبانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر للکارا کہ بڑ چودوا اپنے خاوند کو جا کر کہو کہ بہزاد خاں ملکہ مہر نگار اور شہزادہ کام گور کو، جو تمھارا داماد ہے، ہانکے پکارے لیے جاتا ہے۔

اگر مردمی کا کچھ نشہ ہے تو باہر نکلو اور ملکہ کو چھین لو۔ یہ نہ کہیو چپ چاپ لے گیا نہیں تو قلعے میں بیٹھ آرام کیا کرو۔''۴۱؎

اس پوری داستان میں صرف خواجہ سگ پرست اور اس کے دو بھائیوں کا کردار ایسا ہے جس میں لچک دکھائی نہیں پڑتی۔ ایک طرف خواجہ سگ پرست نیکی پر قائم ہے تو دوسری طرف دونوں بھائی برائی پر قائم ہیں۔ یہ احساس کس حد تک صحیح ہے کیوں کہ یہ کہانی جزوی حیثیت سے تمثیلی انداز کی ہے۔ اس کہانی میں خواجہ سگ پرست کا کتا اس کے بھائیوں کے مقابلے میں ایک مثبت رول انجام دیتا ہے۔ وہ ان کی بے وفائیوں کا جواب اپنی وفاداری سے دیتا ہے لیکن یہ تمام تر حقیقت نہیں ہے۔ خواجہ سگ پرست کا کردار نہ تو اٹل ہے اور نہ آئیڈیل بلکہ لچک دار اور ظاہر دار ہے اور جو کچھ کہ آئیڈیلزم ہے وہ بڑی سطحی ہے۔ وہ اگر ایک طرف اس قدر نیک ہے کہ اپنے بھائیوں کی بے وفائی کا جواب اپنی نیکیوں اور حسن سلوک سے دیتا رہتا ہے تو دوسری طرف اتنا ظالم ہے کہ جب وہ نیکی سے عاجز آتا ہے تو ان کے لیے ایک ایسی سزا تجویز کرتا ہے جو قاہر سے قاہر بادشاہ کے ذہن میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ ایسی ہی سطحیت اس کی مذہبی زندگی میں بھی ملتی ہے۔۴۲؎

جہاں تک اس داستان کے پلاٹ کا تعلق ہے یوں کہنا چاہیے کہ چاروں درویشوں کی سیر کو ایک لنگر میں الجھانے کا تعلق ہے۔ وہ تمام تر ایک ذہنی سازش کا نتیجہ ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلے یہ قصہ چار درویشوں کا الگ الگ تھا۔ جب کسی داستان گو نے انھیں ایک رشتے میں پرونے کی کوشش کی تو اس کا یہ حل نکالا کہ بادشاہ آزاد بخت کی تکمیل آرزو کو ان چاروں درویشوں کی ملاقات پر مشروط کر دیا۔ اس سے قصے کے آغاز اور انجام دونوں ہی میں وحدت پیدا ہوگئی جو ہر چند کہ سازش ہے، پھر بھی گوارا ہے۔ کیوں کہ چاروں درویشوں کی سیر میں غزل جیسی ایک داخلی وحدت پائی جاتی ہے۔ اس کا ناگوار پہلو یا بھرتی کا حصہ

تو صرف خواجہ سگ پرست کی سرگزشت اور پھر اس کی زبانی آذربائجانی نوجوان کا قصہ ہے جو چہار درویشوں کی روحانی سیر کی اسپرٹ سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہے۔ ہر چند کہ داستان کا طویل ہونا ہی حسن ہے، لیکن تاوقتے کہ طوالت میں کوئی حسن تعلیل پیدا نہ کیا جائے، طوالت نہ صرف کھلتی ہے بلکہ داستان کی اسپرٹ کو مجروح بھی کرتی ہے اور یہ نقص اس داستان میں خواجہ سگ پرست کی کہانی سے پیدا ہوا ہے۔

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے میر امن کی زبان ہندوستانی اور بیان بنیادی اعتبار سے تصنع اور تکلف سے عاری ہے۔ ان کی زبان میں رنگینی پائی جاتی ہے۔ ان کی عبارت میں رنگینی استعاروں کے ایجاز و اختصار اور محاوروں کے برتنے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ میر امن کی نثر رواں دواں، سلیس، بامحاورہ اور سریع الفہم ہے۔

باغ و بہار میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہیں اس میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں۔ ممتاز حسین نے ان کمیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میر امن نے چند ایسے محاوروں کا استعمال کیا ہے جن سے بقول رجب علی بیگ سرور ''ان کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً ''میرا قصہ دور و دراز ہے''، ''سلطنت برباد دی''، ''دسترخوان مزید کیا''، ''محنت کھینچا''، ''دست گیر کرکے لائے''۔ لیکن ایسے محاوروں کی بہتات نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ممتاز حسین نے چند ایسے الفاظ کا ذکر کیا ہے جس کو میر امن نے غلط العوام اور غلط العام کی تمیز کے بغیر استعمال کیا ہے مثلاً ''بجد''، ''مہربانگی''، ''امراؤ''، ''غرباؤں''، ''سلاطینو''، ''پنڈت خانہ'' جیسے الفاظ غلط العوام کے تحت آتے ہیں نہ کہ غلط العام کے تحت۔ ایک آدھ جگہ پر سنسکرت کا لفظ غلط استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ''ایک گمت رہیں یا جدا جدا ہو جائیں'' گمت کی جگہ سنگھ زیادہ مستعمل ہے۔

ممتاز حسین نے میر امن کی ایک بہت بڑی کمی کی طرف نشان دہی کی ہے۔ بقول ممتاز حسین:

''میر امن کو جذبات نگاری میں قدرت حاصل نہ تھی۔ وہ سفر کے ہرج مرج اور طلسم و حیرت کا سماں اچھا باندھتے ہیں۔ کہیں کہیں کسی کو دو ہتھی جھاڑتا اور ہانک پکار کے بھگاتا ہوا بھی پیش کر لیتے ہیں، لیکن جب محبت و کیفیت کے بیان کا وقت آتا ہے تو وہ توضیح اور تمثیل سے آگے بڑھ نہیں پاتے ہیں۔ وہ نہ تو جدائی کا کوئی نوحہ لکھ پاتے ہیں اور نہ محبت کی کوئی غزل۔ وہ عشق کی داستان لکھتے ہیں لیکن عشق کی کیفیات کو سوز اور درد کے ساتھ بیان کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ اس کے لیے تنہا تمثیل کافی نہیں ہے۔ اداکاری کے

ساتھ کچھ شاعری کو بھی لینا پڑتا ہے۔ ۳۴؎

غالب:

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ عہد مغلیہ کے آخری دور کے سب سے نامور شاعر ہیں۔ ان کے دم سے اردو شاعری کی دنیا میں ایک نقلاب پیدا ہوگیا۔ پروفیسر آل احمد سرور کا قول ہے: ''غالبؔ سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی دنیا تھی، غالبؔ نے اسے نیا ذہن دیا۔'' بلاشبہ وہ اپنے عہد کی آواز ہیں۔ ان کے کلام کی مقبولیت کسی دور میں کم نہیں ہوئی۔''

مطالعہ غالب پروفیسر ممتاز حسین کا پسندیدہ مشغلہ معلوم ہوتا ہے۔ غالب سے متعلق انھوں نے چھ مضامین قلم بند کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو کتابیں ''انتخاب غالب'' اور ''غالب ایک مطالعہ'' لکھی ہیں۔ انتخاب غالب کا مقدمہ بے حد دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ممتاز حسین اور غالب آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کررہے ہوں۔ دوسری تصنیفات کی طرح غالب ایک مطالعہ ان کی دقت نظر، وسیع مطالعے اور قدرت اظہار کی گواہ ہیں۔ ممتاز حسین کی یہ کتاب ابھی تک غالب پر لکھی گئی تمام کتابوں میں بے حد متوازن تصنیف ہے۔ اپنی خصوصی نوعیت اور اظہار مطالب کے لحاظ سے غالبیات میں بلند مقام رکھتی ہے۔ ادب کے ناقدین کے یہاں ممتاز حسین کی اس کتاب کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ غالب کے مطالعے سے ممتاز حسین نے غالب کو ان کے ماحول، ان کے سماج اور اس زمانے کے سیاسی اور اقتصادی عوامل سے الگ کر کے نہیں پرکھا ہے بلکہ انھوں نے ان عناصر کی چھان پھٹک کی ہے جو غالب کی ذہنی ترکیب میں کام کررہے تھے۔ ممتاز حسین نے غالب کی تعقل پسندی، اور انسان دوستی کو اہمیت دی ہے۔

میر اور غالب اردو شاعری کے دو اہم نام ہیں۔ اپنی شاعری میں میرؔ نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو بار سب پہ گراں گزرا اس کو ان کا دل ناتواں اٹھالیا۔ میر کی شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے غالب نے بھی کہا ہے کہ ''اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا۔'' لیکن ممتاز حسین غالب کو میرؔ پر فوقیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ ممتاز حسین ایسا کیوں کہتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ فلک کے برسوں پھرنے کے بعد خاک کے پردے سے ایسا انسان نکلا ہے:

''الٰہی کس غضب کی آگ تو نے اس مشت خاک میں رکھ دی تھی کہ اس کا ہر نفس آتش بار، صد جلوہ کف اعجاز تھا۔ یوں تو میر سا معجز نگار بھی شعلہ فشاں گزرا ہے۔ اس کا بھی پنجہ زرنگار پنجہ خورشید میں ہر صبح ہے۔ لیکن اس کا داغ دل شبنم گریہ سے اس قدر خنک تاب ہے کہ وہ روکش ماہتاب تو ہے، خورشید کا اس پر گماں نہیں۔ میرؔ اور غالبؔ کا یہی بنیادی فرق ہے۔ میرؔ طلسم ماہ کا اسیر، غالبؔ اقلیم خورشید کا سفیر، ایک اس شش جہت میں حیرت زدہ بصورت تصویر۔ دوسرا سرگرم جستجو: دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی، ایک گرفتار طلسم شوق، غوطہ زن سراب الفت، دوسرا آتش زیر پا۔ بیروں حلقہ سلاسل، سرگرم جولاں:

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے　　میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں　　صورت رشتہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ　　ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستان مجھ سے

ایک ہی منشور سے دونوں کی تحریر، ایک ہی صورت پر دونوں کا نقش لیکن ایک کو اپنے نقش پر یہ حیرت ع منہ ہی تکا کرے ہے جس تس کا۔ دوسرے کو یہ شکایت ع کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا۔ ایک کو دل بے مدعا کی خواہش، بندگی کیا خدائی سے بھی شرمندگی۔ دوسرا ہمہ تن آرزو۔ جاں دادہ غمزۂ زیست، حریص لذت ہستی، تکمیل نقش کا خواہاں، حصول ذات کا جویا، نور حرارت کا شیدا، نبرد آزمائے پنجۂ ظلمت، میر کارہ نما عشق، غالب کارہ نما خرد۔ ایک کا سفر رو بہ تسخیر نفس۔ دوسرے کا سفر رو بہ تسخیر شش جہت، ایک کو بے خودی جہاں در جہاں۔ دوسرے کو تشت خورشید برسر ہوش۔ یہ ہیں چند اسباب کہ غالبؔ میرؔ سے زیادہ اس عہد کا مقبول شاعر ہے۔''[۴۴]

غالب کی شاعری کی عظمت کے وہ اس طرح معترف ہیں:

''ہر وہ خیال جو ہمارے شعر و ادب، قوت و توانائی کا حامل ہے۔ ہر وہ نکتہ ادا جو سحر کاری فن سے عبارت ہے اس کا ایک رشتہ غالب کی فکر اور فن سے ضرور ہے۔''[۴۵]

سید محمد عقیل کے بقول تعقل پسندی اور روایت میں تاریخ اور معاشرے کی تلاش، ممتاز حسین کی تنقیدی فکر کا خاص حصہ ہے جسے مجرد تعقل پسندی اور زندگی کے ٹھوس تجربے سمجھنا چاہیے۔ یہ تنقید تقریباً ہمہ وقت معاشیات، وقت، تاریخ اور معاشیات کے گھیرے میں رہتی ہے۔ معاشرہ جس نے ہر زبان و انسان کو اہم جانا اور اس کی ضرورتوں، وسائل اور محرومیوں سے زندگی پیش کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ غالب کی پہچان کے لیے جب ممتاز حسین اس کی معیت میں ہوتے ہیں تو یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

''اس غم نے غالب کی صرف تخلیقی قوت ہی کو نہیں ابھارا بلکہ اس کی انسانیت اور دل سوزی کو بھی.... ''نہ یہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بنوں اور نہ یہ بخشائش کہ دونوں ہاتھوں سے زر ہاتھی پر سے برساتا چلوں۔'' غالب کی اس انسان دوستی میں امرائیت کی شان بے شک ہے ..... لیکن وہ انسان اور انسان کے درمیان ہر قسم کی تقسیم کا مخالف تھا۔ وہ جو کہ توحید وجودی کا قائل ہو، ہر فرد میں خدائی دیکھتا ہو، وہ بھلا کسی ایسی تقسیم کو کیوں کر برداشت کرسکتا تھا..... اس نے گفتگو کسی مجمع خاص و عام سے نہیں کی بلکہ انسان سے کی ہے:

جہاں را خاص و عامی است، آں مغرور و ایں عاجز
بیا غالبؔ ز خاصاں بگزرد بہ گزار عاماں را [۴۶]

ممتاز حسین کی یہ کتاب غالب کی شاعری کا بہترین مطالعہ ہے، لیکن مصنف اس میں جذباتیت پر قابو نہیں پا سکے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ غالب کے طرفدار بن گئے ہیں۔ اس سے قاری کا ذہن تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن انھوں نے غالب کی شاعری کے وہ نکتے بیان کیے ہیں جو انسان دوستی کی بہترین مثال

کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ غالب کی تعقل پسندی اور انسان دوستی کی اہمیت پر زور یقیناً مطالعہ غالب کا ایک بے حد اہم رخ ہے۔ یہ مطالعہ اس تاریخ پر بھی محیط ہے جس میں ایک معاشی نظام اور سماج رو بہ زوال ہے اور دوسرا بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے اور روز وشب ترقی کے نئے افلاک کی طرف گام زن ہے جس کا اشارہ انھوں نے سرسید کی فرمائش کے جواب میں ایک مثنوی کی شکل میں تقریظ لکھ کر دیا تھا۔ اس تقریظ میں انھوں نے انگریزوں کی ہنرمندی کی تعریف کی ہے۔

غالب کا دور تہذیبی تصادم کا دور تھا۔ اس دور میں نئے پرانے خیالات، متضاد روایات باہم متصادم تھیں۔ صدیوں کی روایت سے الگ ہونا اور ایک الگ راہ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ لیکن غالب نے ایسا کر دکھایا۔ ان کے نزدیک زندگی کوئی ساکت جامد شے نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غدر کو محض ایک سیاسی واقعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سیاسی تبدیلی کو زندگی کی ایک بڑی حقیقت سمجھ کر قبول کر رہے تھے۔ انھیں قتل و غارت گری کا دکھ ضرور تھا لیکن مغلیہ حکومت کے جانے کا رنج نہ تھا اور نہ ہی انگریزوں کی آمد کا دکھ۔ اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے غالب کا تاریخی شعور اور صوفی مزاج کام کر رہا تھا جو دنیا کو متحرک اور متغیر سمجھ کر نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ تبدیلیوں کا استقبال بھی کرتا ہے۔

غالب اپنے افکار و خیالات میں کسی بھی قسم کی سخت گیری کے مخالف تھے۔ ان کے یہاں وسیع المشربی بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس نکتے کی وضاحت ممتاز حسین نے اپنی کتاب ''انتخاب غالب'' میں خود غالب کی زبانی کروائی ہے:

> ''چونکہ میری عجمی فطرت ماوراء النہری کی خشک مغزی سے میل نہ کھاتی تھی۔ میں نے سمرقند، حنفی سنی مذہب کو ترک کر دیا اور عجم کی شیعیت کی طرف مائل ہو گیا لیکن اپنی ذات کو جیسا کہ اہل تصوف کا پیشہ ہے ہر قسم کی دینی اور ملی تعصب سے پاک رکھا۔ میری نظر میں ہندو، مسلم، عیسائی، زرتشتی، سنی، شیعہ سب برابر تھے۔''[۴۷]

شارب ردولوی ممتاز حسین کی تصانیف غالب ایک مطالعہ اور امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری کو ان کی بہترین تصانیف میں شمار کرتے ہیں۔ وہ ان تصانیف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان (ممتاز حسین) کی جدید تصانیف میں غالب ایک مطالعہ اور امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری بہت اہمیت رکھتی ہیں جس کے تذکرے کے بغیر ان کے تنقیدی نظریے پر کوئی مکمل گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ ان تصانیف کی حیثیت ان کی تنقیدی نظریات کے عملی اطلاق کی ہے۔[۴۸]

وہ مزید لکھتے ہیں:

''ادب اور تنقید کے مسائل اور اپروچ کے بارے میں ان کا ذہن بالکل واضح ہے اسی لیے ان تحریروں میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ مطالعہ غالب ذہن جدید سے غالب کا مطالعہ ہے جو بلاشبہ غالب شناسی میں ایک سنگ میل ہے۔[۴۹]

(ii) جدید ادب:

سرسید احمد خاں:

''سرسید احمد خاں کا تاریخی کارنامہ'' ممتاز حسین کا ایک فکر انگیز مضمون ہے۔ اس مضمون میں ممتاز حسین نے نہ صرف سرسید کے سیاسی، سماجی اور ادبی کارناموں کی تعریف کی ہے بلکہ سرسید کی سیاسی، مذہبی اور سائنس سے متعلق ان کے افکار کے لیے سرزنش کی ہے۔ عام طور پر سرسید کے کارناموں کا ذکر کیا جاتا ہے مگر ان کی کوتاہیوں کی ان دیکھی کر دی جاتی ہے۔ ممتاز حسین نے ان کی مذہبی تاویلات اور لبرل خیالات کے لیے ان کی تعریف کی ہے، ان کی ادبی خدمات کو سراہا ہے، ان کے اسلوب کو سراہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے سرسید کی رجعت پسندی، انگلستان کی قدامت پرست جماعت کی سیاست کا آلۂ کار بننے اپنے خیالات میں تھیوڈور بیک کے زیر اثر آ جانے کی وجہ سے ان پر زبردست تنقید کی ہے۔

موجودہ دور کے نثر کے معماروں کی بات آتی ہے تو اس وقت میر امن اور غالب کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ مگر اس بات سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ جدید نثر کے ڈھانچے کی تعمیر میں سرسید کا خون جگر شامل ہے۔ نثر کی دنیا میں انھوں نے خود اپنی تحریروں سے انقلاب پیدا کر دیا۔ انھوں نے مدعا نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اپنی بات کو دلیلوں کے ساتھ پیش کرنے کا راستہ دکھایا۔ گویا استدلالی نثر کی مثال قائم کی۔

اس ضمن میں ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''ہمارے ادبی مؤرخین میر امن اور غالب کو موجودہ نثر کا معمار بتاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے صرف اسی حد تک کہ انھوں نے اس کی بنیاد ڈالی ہے۔ ورنہ جہاں تک اس کے ڈھانچے کی تعمیر کا تعلق ہے وہ کارنامہ سرسید ہی کا ہے۔ ان ہی کی کوششوں سے اردو زبان بناؤ سنگار سے آزاد ہو کر اس لائق بنی کہ وہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار کر سکے۔''۵۰

سرسید نے اپنی نثر میں وضاحت، صراحت اور قطعیت کی اہمیت واضح کی۔ اردو نثر کو تصنع، فضول عبارت آرائی، لفاظی اور مبالغہ آرائی سے نجات دلائی۔ سرسید صاحب اسلوب نثر نگار تھے۔ ان کے اسلوب میں سادگی اور حسن کی آمیزش ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''جہاں تک اس کے خالصتاً ادبی کارناموں کا تعلق ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان سے بہتر ہماری زبان میں کوئی دوسرا مضمون نگار نہیں گزرا ہے اور انھوں نے انھیں مضامین میں یہ بھی ثابت کیا کہ وہ صاحب اسلوب بھی ہیں، ان کے اسلوب میں سادگی اور حسن کا بہترین سنگم ہے۔''۵۱

ممتاز حسین نے اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ سرسید کی سیاست منفی ردعمل کی سیاست بن جاتی ہے۔ سرسید اقلیت کے مسئلے کے حل کے لیے نامزدگی کے اصول کی حمایت کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے انگریز آئی۔سی۔ایس افسروں کو ہندوؤں پر ترجیح دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مسٹر تھیوڈر بک کے زیر اثر وہ رجعت پسندی کی راہ میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر سرسید ہندو اور مسلمان کی علاحدہ قومیتوں کے قائل ہو چکے تھے تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک متحدہ جماعت یونائیٹیڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ وہ ایسوسی ایشن سرسید کی قوم کی نہیں بلکہ سامراج کی تھی جو دیسی راجواڑوں کی مدد سے کانگریس کی مخالفت کروانا چاہتا تھا۔ اس کا واضح ثبوت ایسوسی ایشن کے لائحہ عمل میں ملتا ہے۔

سرسید کے تمام کارناموں کا محاسبہ کرتے ہوئے ممتاز حسین سرسید کے بعض کاموں کی خوب تحسین

کرتے ہیں۔ وہ سرسید کی تاریخی اور مذہبی کتابوں کی تالیف وتصنیف کو خوب سراہتے ہیں اور سرسید کا ایک بڑا کارنامہ بتاتے ہیں۔لیکن جن کاموں کی وجہ سے اکبر کے خیال میں سامراجیت کو تقویت پہنچتی ہے'اس کو وہ گرفت میں بھی لاتے ہیں۔ وہ سرسید کے بعض کاموں کو ان کی سمجھوتہ بازی، معذرت خواہی اور رجعت پسندی پر محمول کرتے ہیں۔ممتاز حسین سرسید کے اس عمل سے جس سے مسلمان ماڈرن بنے خوش نظر آتے ہیں لیکن ''اینگلو ماڈرن'' بننے سے خوش نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ان سارے کارناموں کو دیکھتے ہوئے میرا ذاتی ردعمل یہ ہے کہ جہاں تک ان کی اس کوشش کا تعلق ہے کہ انھوں نے ہمیں مسلمان سے محمڈن بنایا یعنی ماڈرن بنایا ہم اس کے سامنے عظمت وتکریم سے جھکتے ہیں۔ لیکن جہاں انھوں نے اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہمیں اینگلو محمڈن بنا دیا ہم ان کے اس خطاب کو نہایت احترام کے ساتھ واپس کرتے ہیں۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں بہت سی ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے اینگلو کا خطاب تو ایک طرف رہا سر کا خطاب بھی واپس نہیں کیا ہے۔'' ۵۲

الطاف حسین حالی:

حالؔی ایک اہم نثر نگار اور شاعر ہونے کے علاوہ بڑے نقاد بھی تھے۔ وہ شاعری کی بنی بنائی ڈگر پر نہیں چلے بلکہ انھوں نے نئی شاعری کی بنا ڈالی۔اس کے لیے ان کی تلخ تنقید بھی ہوئی مگر وہ اس سے نہیں گھبرائے ۔انھوں نے جس نئے اسلوب کی نشرواشاعت کی انھیں اپنے اغراض ومقاصد کی تبلیغ کے لیے بروئے کار لایا۔ان کی زبان آسان، خیال سنجیدہ اور طرز نیا تھا۔ وہ نئی شاعری کے پیامبر مانے جاتے ہیں اور اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود ان کی ترقی پسندی آج بھی بے یقینی اور تذبذب میں مبتلا رہنے والے شاعروں کے لیے خضر راہ ہے۔

ممتاز حسین نے حالی پر تین مضامین لکھے ہیں ۔ یہ مضامین علی الترتیب ''حالی — اردو کا پہلا نقاد''،

''حالی کا نقطۂ نظر'' اور ''نئی غزل کا موجد — حالی'' ہیں۔ اس کے علاوہ ممتاز حسین نے ''حالی کے شعری نظریات — ایک مطالعہ'' کے نام سے ایک بہت ہی اہم تحقیقی و تنقیدی کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کو اردو میں ایک مستقل اور مبسوط کتاب مانا جاسکتا ہے۔

حالی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی رہ نمائی کی۔ قصیدہ و غزل کی خامیوں کو واضح کیا۔ مرثیہ و مثنوی کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ شاعری میں سادگی، جوش اور اصلیت پر زور دیا اور مقدمہ شعر و شاعری جیسا معرکۃ الآرا تنقیدی کارنامہ پیش کیا جسے آل احمد سرور نے اردو شاعری کا پہلا مینی فیسٹو قرار دیا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری ان کے مجموعہ نظم کا مقدمہ ہے لیکن یہ بجائے خود اردو تنقید کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں پہلی بار منظّم اور علمی انداز میں شاعری کی پرکھ کے بعض معروضی اصول پیش کیے گئے۔ اس کا شمار دورِ جدید کی ان بنیادی کتابوں میں ہوتا ہے جس میں سنجیدہ نثر میں تنقیدی طرزِ فکر کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ حالی سماجی اور اخلاقی اقدار کو اپنے عہد کے آئینے میں دیکھتے تھے۔ پوری کتاب پر یہ انداز نظر چھایا ہوا ہے۔ شاعری کی اچھائیوں اور برائیوں کی کسوٹی محض چند فنی قواعد نہیں رہ جاتے بلکہ زندگی کے نشیب و فراز بن جاتے ہیں۔ ۵۳؎

ممتاز حسین کی تصانیف میں ''حالی کے شعری نظریات'' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے نہ صرف حالی کے شعری نظریات سے بحث کی اور ان کے ادبی تصورات کا منبع تلاش کیا بلکہ شاعری کے بنیادی مسائل سے بھی بحث کی ہے، مثلاً یہ کہ شاعری کیا ہے؟ کیا شاعری کے لیے بحور اور اوزان ضروری ہیں؟ کیا شاعری محض کلام موزوں کو کہتے ہیں یا شاعری کے لیے دوسرے عوامل بھی ضروری ہیں؟ انھوں نے ان مباحث کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ شاعری کی بنیاد تخیل پر ہوتی ہے اور قوت متخیلہ کے بغیر شاعری صرف کلام موزوں بن کر رہ جاتی ہے۔ ممتاز حسین نے حالی کے مقصدی ادب کے نظریے سے اتفاق کرنے کے باوجود ان پر بعض معاملات میں کڑی نکتہ چینی بھی کی مثلاً یہ کہ حاؔلی نے ادب میں مقصدیت کے جوش میں ادب اور غیر ادب کے فرق کو فراموش کر دیا۔

مذکورہ کتاب میں ممتاز حسین نے ان تمام مآخذ کو دریافت کیا جو اس سے قبل تلاش نہیں کیے گئے تھے۔ انھوں نے ان تمام مآخذ پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ جہاں تک حالی کے شعری نظریات کے پرکھنے،

چھاننے اور پھٹکنے کا تعلق ہے یہ کام بھی انھوں نے بہت عرق ریزی سے کیا ہے۔انھوں نے اس کام میں خود کو مقدمہ شعروشاعری کے مشمولات تک محدود نہیں رکھا۔انھوں نے حالی کی تمام نگارشات نثر ونظم کو بھی کھنگالا ہے۔اس طرح یہ کتاب حالی کے شعری نظریات کو سمجھنے میں بہت زیادہ معاون و مددگار رہے۔ممتاز حسین نے اس کتاب میں دورِ حاضر کی ماڈرن اور الٹرا ماڈرن شاعری کو بھی جانچا اور پرکھا ہے جن کا رشتہ حالی کے شعری نظریات سے بھی ملتا ہے۔یہ کتاب ایک گہری سوچ اور وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے، اردو تنقید میں اس کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے۔

ممتاز حسین کی مذکورہ کتاب سے مطالعہ حالی کے سلسلے میں بہت سے نئے سوالات جنم لیتے ہیں۔اس میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں اس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے حالی کا از سرنو محاسبہ ضروری ہے۔ممتاز حسین نے اس کتاب میں ایسے سوالات اٹھائے ہیں جس سے مزید بحث وتمحیص کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس بحث سے پہلے کولرج، ورڈ سورتھ اور ملٹن کے شعری نظریات اور نقد شعر کی ایماندارانہ تفتیش ضروری معلوم ہوتی ہے۔[۵۴]

یگانہ چنگیزی:

یگانہ کا کلام پڑھ کر انسانی زندگی کی قوت کا احساس ہوتا ہے۔آزادی، بانکپن اور پرزوری ان کے خیالات کی خصوصیتیں ہیں۔ان کے لہجے کی تمکنت اور وقار آتش کی یاد دلاتا تھا۔عہد یگانہ کی شاعری پر رومانی فضا چھائی ہوئی تھی۔یگانہ نے مکمل زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔حلقہ شاعری میں ان کی نوک جھونک ہم عصر شعراء سے چلتی رہی۔انھوں نے غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے خلاف بہت کچھ لکھا۔اور بہت سے شعراء سے وہ مطمئن نہیں رہے۔

''یگانہ شخص اور شاعری'' ممتاز حسین کے ذریعہ یگانہ کے کلام کا انتخاب ہے۔اس انتخاب میں ممتاز حسین نے یگانہ کے کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے اور ان کے مجموعی کلام کا جائزہ لیا ہے۔ممتاز حسین کا خیال ہے کہ سرسید اور حالی کی کوششوں سے ان کے بعد غزل گو شعراء کی ایک کھیپ بالخصوص لکھنؤ میں تیار ہوئی ان میں لفظوں کی شعبدہ گری کے بجائے ایک شعوری کوشش، اظہار غم اور سامعین کو متاثر کرنے کا مقصد راہ پاتا

ہے۔اس بزم میں کچھ ایسے شعراء بھی شامل تھے جنھوں نے حقیقی شاعری کی اور صحیح معنوں میں حقیقی شاعر تھے۔اس سلسلے میں انھوں نے حسرتؔ کے ساتھ یگانہ چنگیزی کا بھی نام لیا ہے۔مگر یگانہ کی حق پرستی حسرت کی حق پرستی سے مختلف تھی:

کیا بتاؤں کیا ہوں میں، قدرت خدا ہوں میں　　میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے

ممتاز حسین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ کی شاعری کا موضوع خود پرستی ہے مگر ان کی خود پرستی محیط ہے حیات انسانی کی تفہیم اور اس کی تنقید و تشریح پر، اور چونکہ حیات انسانی کو کائنات اور قضا و قدر کے رشتوں کے بغیر سمجھنا مشکل ہے اس لیے ان کے بارے میں بھی یگانہ نے اظہار خیال کیا ہے، مگر کس طرح؟ ایک شاعر کے طرز سخن میں جو شخص جذبات سے مملو ہوتا ہے۔ یگانہ کوئی فلسفی نہ تھے جو بھولے سے شاعری کے میدان میں آگئے تھے۔وہ ایک حقیقی شاعر تھے۔ان کی فکر ان کے اپنے تجربات زندگی کی پروردہ تھی۔۵۵''

یگانہ کی شاعری کا موضوع اخلاق انسانی ہے اور اس نسبت سے نیک و بد کے مابعد الطبیعاتی ماخذ، جبر و قدر، سزا و جزا وغیرہ کے مسائل بھی بیان کرتے ہیں، لیکن وہ ان ساری باتوں کو انسانی رشتوں یا محسوس رشتوں اور حسن تغزل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔لیکن ان کا لہجہ سخت گیر اور جارحانہ ہے۔

یگانہ میرؔ کو اردو کا سب سے بڑا شاعر تصور کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے شعر سے متأثر بھی نظر آتے ہیں۔لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے کہ میرؔ کی شاعری ان کی شاعری سے خاصی مختلف ہے۔میر بنیادی اعتبار سے حسن و عشق اور لہجے کی نرمی اور سپردگی کے شاعر ہیں۔مگر میرؔ کے کردار کا ایک پہلو یگانہ کے کردار سے میل کھاتا ہے وہ پہلو ہے خود شناسی اور خودداری کا۔

یگانہ کے بعض اشعار میں ایک شان قلندری نظر آتی ہے۔وہ یاد خدا میں طمع خام سے آزاد نظر آتے ہیں۔یگانہ ایسی نماز کے قائل ہیں جو بے نیاز اجر ہو:

یادِ خدا کا وقت بھی آئے گا کوئی یا نہیں　　یاد گناہ کب تلک شام وسحر نماز میں

یگانہ کی شاعری کا انداز ہی جداگانہ ہے۔ ان کو اقبال، جوش، اختر شیرانی اور مجاز کوئی پسند نہ تھا۔ البتہ کلام اکبرالہ آبادی میں ان کو جاذبیت نظر آتی تھی۔ وہ اپنے خیال میں اکبرالہ آبادی کو ہم نوا مانتے تھے۔ ان کے فلسفے کا رخ مستقل آفرینی کی طرف نہیں بلکہ تنقید نفس اور تنقید ذات کی طرف تھا۔ یگانہ میؔر اور آتشؔ کی درویشانہ زندگی، ان کی خودداری اور غیرت کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہیں۔ مگر ان کے زمانے میں یہ صفات نہیں ملتیں۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مرتی ہوئی تہذیب کے ناقد تھے۔ ۵۶

یگانہ کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کا ایک پرتو ہے۔ ان کی شاعری تمام تر ان کی زندگی کا اظہار ہے۔ مگر زندگی کے صرف ایک پہلو کا اظہار ہے۔ ان کی اپنی ایک انفرادیت تھی۔ وہ اپنی خودرائی میں کسی کی پیروی کے قائل نہیں تھے۔ درج ذیل دو اشعار دیکھئے:

خضر منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں　　میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

....

کوئی بندہ عشق کا، اور کوئی بندہ عقل کا　　پاؤں اپنے ہی نہ تھے قابل کسی زنجیر کے

اکبرالہ آبادی:

اکبرالہ آبادی کا نام سنتے ہی ذہن ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی طرف جاتا ہے۔ ابتدائی زمانہ سے ہی ان کو رعایت لفظی، ضلع جگت اور الفاظ کے ہیر پھیر کا چسکا لگ گیا تھا۔ انھوں نے طنز و مزاح اور ظرافت کا ایسا رنگ اختیار کیا کہ اس صنف شاعری کے امام ہو گئے۔ احتشام حسین نے کہا ہے کہ اکبر نے ۱۸۸۵ء سے باقاعدہ ظریفانہ شاعری شروع کر دی جو ان کا سرمایہ افتخار ہے۔ اکبر جب اپنے خیالات و جذبات کا اظہار طنز و مزاح میں کرتے تو محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ اس شاعری میں خیال کی ندرت بھی ہوتی اور الفاظ پر خلاقانہ تصرف بھی۔

سرسید جدید مغربی تعلیم کو ہندوستانی مسلمان کے درمیان رواج دینا چاہتے تھے۔ اکبر سرسید کے اس لیے مخالف تھے کہ سرسید احمد خاں کی تحریک مسلمانوں کو ان کے مذہب سے بیزار کر دے گی۔ لہٰذا انھوں نے

سرسید اوران کے تعلیمی پروگرام پر شدید حملے کیے، لیکن اکبر محسوس کرتے تھے کہ ان کی مخالفت کے باوجود نئی تہذیب کا طوفان آگے بڑھے گا۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''اکبر کو یہ معلوم تھا کہ وہ ایک گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے رہے ہیں اور قوم کا قافلہ اسی پیروی مغرب پر چلے گا جس پر سرسید نے اسے لگا دیا ہے، لیکن وہ اپنا فرض پورا کرر ہے تھے۔ سرسید کی تحریک اصلاح کے شدایداورعواقب سے لوگوں کو متنبہ کرر ہے تھے، اور موقع ملنے پر لوگوں کو ان سے بھڑکا بھی دیتے۔''۵۷؎

اکبر انگریزی حکومت کے ہاتھوں ہندوستانی سماج کی تباہی دیکھ رہے تھے۔ مغرب سائنس کے زور پر مشرق کو کم زور بنا رہا تھا اور معاشرے کو برباد کرر ہا تھا۔ اکبر نے انگریزوں کی حکمرانی اوراس کے غاصبانہ اور جابرانہ پہلو کو اپنے اشعار میں اجاگر کیا۔ یہ اشعار ان کے ذہنی اور روحانی کش مکش کا نتیجہ تھے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''اکبر کے ان پرفن اشعار سے محفوظ ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس ذہنی اور روحانی کش مکش کو سمجھا جائے جو ان دونوں کے درمیان تھی۔ اس کے سمجھنے کے بعد ہی ہم معلوم کرسکیں گے کہ اکبر کا حصہ ہماری قومی بیداری میں کیا ہے۔''۵۸؎

قومی بیداری میں اکبر کے رول کو سراہنے کے باوجود ممتاز حسین اکبر کی سائنسی تہذیب اور مغربی جمہوری اداروں کی مخالفت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں اکبر نے محکومی کی مخالفت کے ساتھ اس فلسفہ ترقی کی بھی مخالفت کی جو قوموں کی مادی خوش حالی سے تعلق رکھتی ہے۔ ممتاز حسین نے اکبر کے خیالات کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جس طرح ہمیں ہر بات کا علم بہت دیر میں ہوتا ہے۔ تقریباً اس وقت ہوتا ہے جب سر چھپانے کے لیے ریت بھی باقی نہیں رہتی ہے۔ اسی طرح ہمیں اس بات کا علم بھی بہت دیر میں ہوا کہ ہم انگریزوں سے

جنگ ۱۸۵۷ء میں نہیں بلکہ اس سے پہلے ہی ہار چکے تھے۔ یہ لڑائی
مسیحیت اور اسلام کی نہیں بلکہ مغرب کے ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ
نظام اور مشرق کے صدیوں پرانے جاگیردارانہ نظام کے درمیان تھی۔
یہ لڑائی مغرب کی سائنس اور ٹکنالوجی اور مشرق کے پرانے علوم وفنون
.... کے درمیان تھی، لیکن مشرق کا پرانا ذہن اپنی شکست کا سبب صرف
اخلاقی زوال میں دیکھتا — سرسید اور حالی نے اس کے علاوہ مادی اور
تاریخی اسباب پر بھی نظر ڈالی۔ مغربی تہذیب سے کچھ سمجھوتہ چاہا۔ مگر
اکبرالہ آبادی نے ان کی ساری باتیں سنی ان سنی کر دیں اور ماضی پرستی کی
طرف جھک گئے۔"۵۹

اکبر اس وقت کے سیاسی حالات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ جنگ طرابلس، جنگ بلقان، پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے واقف تھے۔ ممتاز حسین کے خیال میں وہ محکومیت کے دباؤ میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کے قائل نہ تھے۔ آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی تو اکبر کی ہمدردی وطن پرستوں کے ساتھ تھی۔ جہاں تک مغربی اور مشرقی تہذیب کی کش مکش کا سوال ہے اکبر کو تبدیلی سے اتنا بغض نہیں تھا جتنا مغرب کی اندھی تقلید سے جس نے ہمارے معاشرے میں ایک مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی طرز کہن پر اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں تو وہ مغرب کی ملوکیت اور ہماری غلامانہ ذہنیت کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اکبر کی یہ جنگ نقالی کے بجائے قوم کے اندر تخلیقی قوتوں کو ابھارنے کی تھی۔ ممتاز حسین قومی بیداری میں اکبر کا یہ حصہ مانتے ہیں کہ ان کی شاعری نے علامہ اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری کو بہت زیادہ متاثر کیا بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں شاہین کا تصور اکبر ہی کا عطیہ تھا۔

جوشؔ ملیح آبادی:

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ جوشؔ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر ہیں۔ یوں تو جوش نے کچھ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی شہرت نظموں کی وجہ سے

ہے۔ انھوں نے انسان دوستی، سامراج مخالفت، سماجی طور پر پس ماندہ اور کم تر سمجھے جانے والے لوگوں کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ انھوں نے تحریک آزادی کی حمایت میں جو نظمیں کہیں اس سے انھیں ملک گیر شہرت حاصل ہوگئی اور انھیں شاعر انقلاب کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ شاعر انقلاب کے علاوہ جوش کی ایک حیثیت شاعر فطرت کی ہے۔ مناظر فطرت میں جوش کے لیے بے حد کشش ہے۔ انھوں نے مناظر فطرت پر کثرت سے نظمیں لکھی ہیں۔ جوش کی ایک اور حیثیت شاعر شباب کی ہے۔ ان کی شاعری میں سب سے زیادہ قابل توجہ شے ان کی دل کش اور جاندار زبان ہے۔ ان کو زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ انھیں بجا طور پر لفظوں کا بادشاہ کہا گیا ہے۔

ممتاز حسین کا مقالہ ''جوش فکر وفن کے آئینے میں'' ان کی فلسفیانہ ژرف نگاہی کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے جوش کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی شاعری میں مختلف فلسفوں کے اثرات کی نشاندہی کی ہے اور ثبوت کے طور پر ان کے اشعار پیش کیے ہیں۔

جوش کے اول دور کی نظموں میں آزادی کے جذبے کی ترجمانی ملتی ہے۔ ممتاز حسین نے جوش کی شاعری میں رومانیت کے عناصر تلاش کیے ہیں اور اس رومانیت کو انقلابی اقدار کا حامل بتایا ہے۔ یہ ایسی رومانیت ہے جسے غیر حقیقی کہہ کر رَد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''....جوش کی رومانیت اس کے برعکس ہے۔ ان کی رومانیت فعال حرب وضرب کی ہے۔ وہ آزادی کے جذبے کو بیدار کرتے ہیں، آزادی کو ایک فطری حق بتاتے ہیں.... دوسرا اثر اس رومانیت کا جوش کی فکر اور شاعری پر یہ ہے کہ وہ جس چیز کو سچ سمجھتے ہیں، وہ اسے چھپاتے نہیں بلکہ اس کا اظہار برملا کرتے ہیں۔''[۶۰]

ممتاز حسین نے روسو، دورو اور ہول باخ وغیرہ کے حوالے سے بتایا ہے کہ آدمی کے جذبات اور احساسات کا تجزیہ طبعیاتی اور کیمیائی اصولوں پر کیا جا سکتا ہے لیکن انسان کی قوت ارادی کے معاملے میں انھیں مبتذل مادیت کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے لیکن ان کے برعکس جوش انسانی جذبات کا تجزیہ انسائیکلو پیڈئس کے نظریات کے تحت میکانکی مادیت، مبتذل مادیت کی روشنی میں کرتے نظر آتے ہیں۔

فلسفہ جبر اور قدر کا مسئلہ فلسفیوں کے یہاں بحث و تمحیص کا موضوع رہا ہے۔شعراء بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ہیں۔ جوش فلسفہ جبر کے قائل نہ تھے۔مگر اس کے باوجود وہ جبر مشیت کے قائل تھے اور آزادقوت ارادی کے سخت مخالف تھے۔ان کی شاعری حرکی اور باغیانہ جذبات سے مملو ہے۔اس معاملے میں وہ اقبال کے خیال سے بہت زیادہ متأثر معلوم ہوتے ہیں۔ چناں چہ وہ آدمی کی بغاوت کو بھی اقبال کے ابلیس کی بغاوت کی طرح مشیت الٰہی کا ایک حصہ تصور کرتے تھے۔

نیتشے ایک ایسا مفکر گزرا ہے جس نے ہم عصر اور بعد کے شاعروں اور فلسفیوں کو بہت زیادہ متأثر کیا ہے۔اقبال کی طرح جوش کے خیالات پر نیتشے کے خیالات کا گہرا اثر تھا۔ یہ اثر کتنا گہرا تھا اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جوش نے ''سنبل وسلاسل'' میں شامل رباعیات کو نیتشے کے نام معنون کیا ہے اور اس کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔''اسیر فکر و عمل نیتشے کے نام'' لیکن ممتاز حسین نے اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ جوش اور اقبال جیسا شاعر عوام اور جمہوریت دشمن مفکر سے کیوں متأثر ہوا۔ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب کا یہ زبردست المیہ ہے کہ جوشؔ اور اقبالؔ دونوں ہی ایک ایسے مفکر کے خیالات سے متأثر ہوئے جو کھلے لفظوں ،عوام دشمن، جمہوریت دشمن اور اشتراکیت دشمن تھا اور جو کھلے عام اس بات کا اعلان کرتا تھا کہ جنگ ایک فطری طریق کار ہے کمزوروں اور ضعیفوں کو میدان ہستی سے ملیا میٹ کرنے کا اور جب تک یہ عوام کالانعام (جو مثل چوپائے کے ہیں) صفحہ ہستی سے مٹیں گے نہیں وہ واحد انسانی نوع پیدا نہ ہوگا۔''۶۱

جوش کی شاعرانہ خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ جوش کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جسے وہ سچ محسوس کرتے ہیں اسے چھپاتے نہیں ہیں۔ جہاں وہ اپنی شکست میدان جستجو میں ظاہر کرتے ہیں وہاں وہ اپنے فیوڈل پس منظر کو بیان کر دیتے ہیں۔ جوش کے یہاں عظمت آدم اور احترام آدمیت کا جذبہ پایا جاتا ہے جوش کے دوسرے اور تیسرے دور کی شاعری میں فن شاعری پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی

ہے اور زیادہ قادرالکلامی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ لفظوں سے کھیلنے لگتے ہیں۔

فراق گورکھپوری:

فراق ، جوش اور اختر شیرانی کے ہم عصر ہیں۔فراق کی شاعری ایک نئی اواز ، نیا لب ولہجہ اور نئی کیفیت کی حامل ہے۔ان کی شاعری کا لب ولہجہ سکون ،نرمی اور ٹھنڈک سے پہچانا جا سکتا ہے۔ان کی غزل میں جدیدحسیت کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری نے پوری نسل کو متأثر کیا۔ان کی شاعری ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت میں بھی انوکھا پن ہے۔شاید اسی وجہ سے ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''معاصرین فراق میں سے کوئی دوسرا شاعر بجز ان کے ایسا نظر نہیں آتا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس نے جو اثاثہ اپنے مرنے کے بعد چھوڑا ہے اس میں اس کی شاعری اور نثر ہی اہم نہیں ہے بلکہ اس کی شخصیت کا انوکھا پن، اس کی گفتگو، اس کے اقوال ظرافت اور ذکاوت بھی اپنی دل چسپی میں کچھ اہم نہیں ہیں۔'' ۶۲

فراق کی غزل نے اردو غزل کو بہت متأثر کیا۔وہ ایک اچھوتے اور منفرد لہجے کے ساتھ غزل کی دنیا میں داخل ہوئے۔بعض ناقدوں کا خیال تھا کہ ان کا یہ لہجہ ہماری شاعری کے مزاج سے میل نہیں کھاتا اس لیے دیرپا ثابت نہیں ہوگا،لیکن فراق نے دنیائے غزل میں بتدریج ایسی جگہ بنائی کہ آخر کار غزل کی دنیا پر چھا گئے۔فراق نے اپنی غزلیہ شاعری میں مصحفی کے علاوہ میرؔ، ذوقؔ، داغؔ، ناسخؔ اور حسرتؔ وغیرہ کا اثر قبول کیا۔ممتاز حسین نے ان کی غزل گوئی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''فراق کی غزلیہ شاعری کی یہ ایک بڑی خصوصیت ہے کہ جہاں اس میں محبوب کے خط ورخسار کا ذکر نہیں ہے وہاں وہ جرأتؔ اور انشاءؔ کی ایسی غزلوں کی خصوصیت سے بھی عاری ہے جو کھل کھیلنے کے عالم کی ہے۔فراق کی شاعری تمام تر دنیائے مجاز کی شاعری ہے ..... ہم یہ محسوس کریں گے کہ ان کی بیش تر غزلیں بدن کی دنیا سے مرتفع ہو کر،

عشق ومحبت ، دردِ زیست اور حیات و کائنات کی حقیقت کی نقاب
کشائیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔''٦٣؎

ممتاز حسین نے اقبالؔ، جوشؔ اور فراقؔ — تینوں کو ترقی پسند شعراء کا پیش رو تسلیم کیا ہے۔ ان تینوں شعراء نے زندگی کو مجرد طریقے سے دیکھنے کے بجائے اسے آئینہ ایام یا تاریخ کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس زندگی کا کوئی عقبیٰ نہیں ہے۔ یہ زندگی تو دائمی ہے۔ اس کا حشر ونشر سب کچھ اس زمین پر ہے۔ فراق اقبال کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ ممتاز حسین کا خیال ہے کہ فراق کے بعض خیالات سے اختلاف رکھتے ہوئے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ فراق بھی تغیر وانقلاب کا شاعر ہے۔ اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ فراق ایک اچھے شاعر ضرور تھے لیکن وہ بڑے مفکر نہیں تھے۔ ان کی شاعری اور مضامین میں کوئی بڑی فکر نہیں ملتی ہے۔ فکری سطح پر ان کی شاعری اقبال اور جوش کے درجے کو نہیں پہنچتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اردو کے ان اہم شاعروں میں سے تھے جنھوں نے اردو شاعری کے رخ کو پیش پا افتادہ مضامین کی ترجمانی سے ایک ایسی سمت کی طرف موڑ دیا جو حیات آفریں اور سماجی زندگی کو منقلب کرنے والی ہے۔

ممتاز حسین فراق کی شاعری کی ایک بڑی کمی یہ بتاتے ہیں کہ وہ ہر کسی کے پیچھے دوڑے اور ان کی نقالی کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''فراق کی ایک دشواری یہ تھی.... جب کہ انھوں نے شاعری شروع کی
ان کی اپنی کوئی آواز نہ تھی۔ وہ ہر کسی کے پیچھے یا کسی کسی کے پیچھے جسے وہ
لائق اعتنا سمجھتے، یا جس میں کرب و اضطراب یا سوز وگداز دیکھتے،
دوڑتے اور اس کے لہجے میں حتیٰ کہ اس کے فقروں میں شعر کہتے۔''٦٤؎

فراقؔ نے غزلوں، نظموں کے علاوہ رباعی بھی کہی۔ ان کی رباعیاں بے حد دلکش ہیں اور ہمارے ادب میں بہت مقبول ہوئیں۔ ان کی وہ رباعیاں جو صوفیانہ نہیں ہیں بلکہ روپ اور رس کی حامل ہیں اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہیں۔ اس طرح کی رباعیاں ان کے ''روپ'' میں شامل ہیں۔

فراق اردو کے عاشق دل دادہ تھے۔ ان کی اردو دوستی مشہور ہے۔ وہ اس کے لب و لہجے کی نرمی و شائستگی پر ایسے فریفتہ تھے کہ وہ سنسکرت آمیز جدید ہندی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ لیکن وہ ہندی کے دشمن

نہیں تھے۔ وہ ہندی کو اردو کے سرمایہ الفاظ اور اس کے لب و لہجے کی شائستگی اور اس کے معیار فصاحت سے بیش قیمت بنانے کے حامی تھے۔

ممتاز حسین کو فراق کے یہاں ایک اچھے شاعر کی تمام تر خوبیاں ملتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب میں ان ساری باتوں کو سمیٹتے ہوئے اپنی ذات سے یہ استفسار کرتا ہوں کہ ایک شاعر کی عظمت کی وہ کیا نشانیاں ہیں جو اوروں کے یہاں ملتی ہیں اور فراق کے یہاں نہیں ہیں تو مجھے اس کا کوئی جواب ملتا ہوا نظر نہیں آتا۔''[۶۵]

فیض احمد فیضؔ:

فیض غزل گوئی اور نظم نگاری دونوں میں ممتاز ہیں۔ انھوں نے غزل کی کلاسیکی روایت سے استفادہ کیا اور اسے انقلابی فکر سے ہم آہنگ کر کے اس میں ایک بالکل نئی کیفیت پیدا کی۔ فیض اہم ترین ترقی پسند شاعر تھے۔ انھوں نے جلاوطنی کی زندگی بھی گزاری لیکن حق و انصاف کے لیے برابر آواز اٹھاتے رہے۔ ان کی شاعری میں دردمندی، دل آویزی اور تاثیر ہے۔

ممتاز حسین کا مضمون 'فیض کی شاعری' انتہائی فکر انگیز ہے۔ اس میں انھوں نے فیض کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ ترقی پسند شعراء بہ یک وقت رومانیت پسند تھے اور ترقی پسند بھی یعنی حسن پرست تھے اور انقلاب پسند بھی۔ وہ ان دونوں کیفیتوں کی ترجمانی کرتے تھے ۳۵-۱۹۳۴ء سے ذرا قبل اس انقلابی جذبے کا اظہار شروع ہو چکا تھا۔ فیضؔ نے اپنی نظم ''ہم لوگ'' میں اس زمانے کی آشفتہ سری، بے روزگاری اور بدحالی کے ساتھ ساتھ ان کے جذبہ بغاوت کی بھی تصویر کشی ہے۔

فیضؔ کی پوری شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے ممتاز حسین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فیض کی شاعری دکھ کی ہے نہ کہ سیاسی اقدام کی۔ اس سلسلے میں ان کی تکنیک مظلوم کو کسی عدالت میں پیش کر کے اس کی وکالت کرنے کی نہیں ہے بلکہ خود ہی فریادی بن جانے کی ہے۔ جس دور میں وہ یہ شاعری کر رہے ہیں وہ دور سماجی تبدیلیوں سے متعلق جدوجہد کا دور ہے۔ اس دور میں بے گناہی کے باوجود تربیت زنداں سے ان کا

حوصلہ بڑھتا گیا، جتنی تکلیفیں بڑھیں ان کی آواز لہو ترنگ اور لہو تال ہوتی گئی۔ اس زمانے میں فیضؔ نے مخصوص طرز فغاں اور طرزِ بیاں ایجاد کیا۔ فیض کے اس طرزِ فغاں نے بہت زیادہ مقبولیت پائی۔ برصغیر میں ہر جگہ اس طرح کی غزلیں کہی گئیں۔

جہاں تک فیض کے انداز سخن کی بات ہے تو اس میں موسیقیت ہے، ہم کلامی ہے لیکن بعض نظموں میں آواز ہم کلامی تک محدود نہیں رہتی بلکہ بلند بھی ہو جاتی ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''فیض کا انداز سخن بالعموم زیر لب گنگنانے، خود سے ہم کلام ہونے، تہہ مے خانۂ حرف کوئی خمار آگیں بات کہہ دینے کا رہا ہے، لیکن اس دور میں بعض نظموں میں ان کی آواز بلند بھی ہو جاتی ہے .... اور پھر وہ بلند آواز رجز کی صورت اختیار کرتی ہے اور شیر ببر کی چال پر لہو تال دیتی ہے۔''[۶۶]

بہت سے ترقی پسند شعراء نے غزل کے حسن تغزل کو اپنی نظموں میں بھی راہ دی ہے۔ ان شعراء میں فیض کا نام سرفہرست آتا ہے۔ فیض کی غزلوں میں ایسا وحدت تاثر پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس میں نظموں کا رنگ پایا جاتا ہے، اور ان کی نظموں میں حسن تغزل کی راہ پانے اور نامیاتی ارتقاء کی وجہ سے غزلوں کا مزا ملتا ہے۔ فیض کی شاعری میں مجرد استعارات کی جگہ ٹھوس محسوس امیجز راہ پاتی ہیں۔ محسوس استعارے جنم لیتے ہیں۔ شاعری میں ایک معروضیت اور ایک معروضی نظام کا حوالہ بھی وجود میں آتا ہے۔ اس سے شعر میں ایک چمک آجاتی ہے اور شعر زیادہ دل پزیر اور قابل فہم ہو جاتا ہے۔

فیض نے ایک نئی طرز فغاں کی ایجاد کے ساتھ ساتھ پرانی علامتوں کو نئی معنویت عطا کی۔ انھوں نے نئے استعارے اور نئی ترکیبیں وضع کیں۔ انھوں نے ہماری شاعری کو ایک نئی زبان بھی دی۔ یہ نئی زباں ہماری ادبی روایت سے مربوط اور مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ نئی بھی ہے۔

شاعری میں راشد حسین راشد کا اپنا الگ مقام ہے۔ جدید شاعری میں ان کی خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ راشدؔ اور فیضؔ کے کلام کا موازنہ کرتے ہوئے ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ راشد اور فیض نے ایک ساتھ شاعری کا سفر شروع کیا لیکن راشد کے مقابلے میں فیض نے بہت جلد اپنا مقام بنالیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''راشدؔ اور فیضؔ دونوں نے اپنی شاعری کا سفر ایک ساتھ شروع کیا تھا.... راشد چلے تھے بڑی جھونک سے لیکن انا میں گھر گئے اور پھر چند خوابوں کی خواب گری میں ایسا ڈوبے کہ ذات کا یہ احساس مٹ گیا کہ میں تنہا کچھ نہیں، پروردۂ محن غیر ہوں۔ فیضؔ اپنی ذات میں فرد فرد پھیلتے رہے، واحد متکلم کے بجائے جمع متکلم میں گفتگو کرتے رہے۔ ان کی آواز عالم عالم پہنچی۔ دنیا نے دیکھا کہ جدید شاعری کی وہ شمع جو ۱۹۳۰ء کی دہائی کی تھی، کس کے سامنے رکھی گئی۔ صدر محفل فیضؔ ہی ٹھہرے۔ اس میں راشدؔ کی ہتک نہیں۔ ان کا اپنا ایک مقام ہے۔''[۶۷]

فیض کے یہاں بسیار گوئی اور زود گوئی نہیں ملتی۔ وہ بدیہہ گو شاعر بھی نہیں تھے۔ وہ اپنی شاعری میں مصرعے خوب سنوارتے تھے۔ ایک اعتبار سے ان کا کلام مختصر ہی ہے۔ مگر کیفیت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ جو بھی کلام ہے وہ منتخب ہے۔ ہر شعر داد کا طالب ہے اور یہ داد فیضؔ وصول کرتے بھی رہے ہیں۔

فانی بدایونی:

فانی صف اول کے شاعر تھے جن کے خیالات میں فلسفیانہ عناصر اور جذبات انگیز حقیقت پسندی دونوں کی کمی نہیں۔ وہ فن کی افادیت کے قائل نہیں تھے، فن برائے فن میں یقین رکھتے تھے۔ اس لیے لفظوں کے انتخاب، ان کی ترتیب اور تراش خراش کی طرف اتنی توجہ کرتے تھے کہ ان کے یہاں ایک خاص قسم کی رعنائی و دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔ اس لیے ان کے شعروں میں بلا کی تاثیر ہے۔ فانی نے اپنی زندگی بڑی تکلیف میں گزاری اور کہا جاسکتا ہے کہ اسی کیفیت نے ان کو اردو کا سب سے بڑا قنوطی شاعر بنا دیا۔

ممتاز حسین نے ''فانی کے کلام پر ایک نظر'' میں فانی کی شاعری کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ شعر گوئی میں ان کے جذبے اور خیال کو اہمیت نہیں دیتے اور نہ ہی دماغ پر مرتب ہونے والی اس کی تاثیر کو اہم سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس بات کی اہمیت ہے کہ فن برائے فن کے تحت یہ دیکھنا چاہیے کہ کس خیال کو کس طرح ادا کیا گیا ہے۔ اس کو کیوں کر برتا گیا ہے اور اس کا کون سا پہلو نمایاں ہے۔ ممتاز حسین کے

نزدیک آج کے سائنسی دور میں فکر فانی کے کئی موضوعات از کار رفتہ ہیں۔ آج کے نوجوانوں کے لیے اس میں کوئی کشش نہیں ہے۔ ان کا واضح اشارہ فانی کے فلسفہ جبر، یاسیت اور مقدر پرستی کی طرف ہے۔

فلسفہ جبر و قدر پر بحث کرتے ہوئے ممتاز حسین نے فانی اور اقبال کے کلام کا موازنہ بھی کیا ہے جس میں انھوں نے فکر اقبال کو تہذیبی جد و جہد سے متعلق بتایا ہے جب کہ فانی کی فکر کو صدائے بازگشت قرار دیا ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''فانی اور اقبال، یہ دونوں ایک ہی سوسائٹی کے دو ہم عصر شاعر ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ ایک کے یہاں اختیار پر زور ہے، دوسرے کے یہاں جبر پر زور ہے۔ ایک انسان کو اپنی تقدیر کا خالق، راکب زمانہ قرار دیتا ہے اور دوسرا اس کو مجبور محض تصور کرتا ہے:

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

اگر فانی کی اس فکر کا مقابلہ اقبال کی فکر سے کیا جائے اور کیوں نہ کیا جائے جب کہ وہ دونوں معاصر تھے۔ دونوں ہی کو نہ صرف اپنے ماضی کا ہوش تھا بلکہ دونوں ہی خرد کے مقابلے میں جنوں کی رہبری کے قائل تھے۔ تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فکر اقبال کا تعلق ہماری اس تہذیبی جد و جہد سے تھا جو ہمارے عقائد، خیالات اور اقدار میں ایک زبردست تبدیلی لانے کی تھی اور فانی کی فکر ایک صدائے بازگشت تھی اس دور کی، جب کہ ہم دشت میں کھو گئے تھے''۔ ۶۸

فانی کا رنگ شاعری کسی حد تک میرؔ و غالبؔ سے ملتا جلتا ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''غالب کے طرز بیدل میں فانی نے بھی چند اشعار ریختہ کے کہے ہیں مگر اس سے بے نیاز ہو کر کہ غالب نے قافلہ ہستی کو کہاں چھوڑا تھا۔ غالب کو یہ وہم کچھ اپنے بارے میں نہ تھا کہ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

(یہ بھی ایک صدائے بازگشت تھی کھوئے ہوؤں کی دشت میں) وہ تو اس
عرفان ذات کو پہنچے ہوئے تھے:

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

....

اور یہی عرفان ذات میرؔ کے یہاں ملتا ہے۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

مگر فانی اپنا تشخص نہ کر سکے یا یہ کہ ان پر معرفت ذات عیاں نہ ہو سکی۔''۶۹

ممتاز حسین فانی کے معرفت انگیز اشعار کی خوب داد دیتے ہیں۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہاں ایک طرز ادا ہی نہیں بلکہ وجدانیت کے کچھ گوہر آبدار بھی ہیں اور جب تجریدی انداز سے ہٹ کر مجاز کا پہلو لیے گفتگو کرتے ہیں تو بڑی عاشقانہ غزلیں کہتے ہیں۔

آخر نگاہ دوست میں فانیؔ نے پالیا یوں مرگ ناگہانی تجھے ڈھونڈا کہاں کہاں

ممتاز حسین نے فانی کی ابتدائی دور کی غزلوں سے قطع نظر جن میں نوحہ و ماتم، گور و کفن، میت اور تربت کی فضا ملتی ہے ان کی شاعری میں طرز ادا کو سراہتے ہیں۔ بعد کے دور میں جذبات کا ٹھہراؤ، فکر میں متانت و سنجیدگی ملتی ہے۔ گفتگو کا انداز مہذب ہے۔ یہاں پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب سے کسب فیض کیا ہے۔ جہاں غالب نے طرز بیدل میں فارسی میں ریختہ کہا ہے وہیں فانی نے اس سے ملتی جلتی بات اردو محاورے میں کہی ہے۔ ممتاز حسین کو فانی کے یہاں مضامین کی یکسانیت کھٹکتی ہے۔ ان کے بقول اگر ان کے مضامین میں تنوع اور رنگا رنگی ہوتی تو نہ جانے وہ کیا غضب ڈھاتے۔

اختر حسین رائے پوری:

اختر حسین رائے پوری کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ یورپ میں قیام کے بعد ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور ان کی تنقید میں اس کا اظہار ہوا۔ اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ انھوں نے اہل نظر کے ایک بڑے حلقے کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ ''ادب اور انقلاب''، ''سنگ میل'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔

''اختر حسین رائے پوری اور گرد راہ'' ممتاز حسین کا ایک فکر انگیز مضمون ہے۔ ''گردِ راہ'' اختر حسین کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت میں زندگی کی مختلف جہات کو روشن کیا ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر ان کی زندگی گزری۔ ان کی خود نوشت میں ان کے قیام کلکتہ اور قیام علی گڑھ کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے قیام کلکتہ کے زمانے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس میں علی گڑھ کے قیام کے زمانے کا ذکر محض ضمنی طور پر ملتا ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''اس (کلکتہ کے قیام کے) زمانے کی زندگی کو انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات ''گرد راہ'' میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان بھی کیا ہے۔ اس کے برعکس علی گڑھ کے زمانے کے قیام کا قصہ کچھ یوں ہی سرسری سا بیان ہو کر رہ گیا ہے حتیٰ کہ انھوں نے اس دیوار کی بھی شرم نہ رکھی جس کے سائے میں وہ اکثر پائے جاتے تھے۔'' ۷۰

اختر حسین رائے پوری ایک مدت تک کلکتہ میں رہے۔ ان کا ادبی شعور اور انقلابی ذہن یہاں کی علمی فضا میں فروغ پایا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں رابندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذرالاسلام اور سبھاش چندر بوس جیسی انقلابی شخصیات اپنے افکار و خیالات سے لوگوں کو متأثر کر رہے تھے، اختر حسین، نذرالاسلام کی شاعری اور شخصیت دونوں سے متأثر تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب کے انقلابی کلام کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اردو ادب میں قاضی نذرالاسلام کی شاعری اختر حسین کے ترجمے کی وساطت سے ہی متعارف ہوئی۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''یہ کلکتہ اس زمانے میں کچھ ٹیگور ہی کا کلکتہ نہ تھا بلکہ قاضی نذرالاسلام اور سبھاش چندر بوس کا بھی تھا۔ یہ کلکتہ ان آشفتہ سر اشترا کی نوجوان کا بھی تھا جن سے اقبال کبھی خائف تھے۔ اسی کلکتہ میں نذرالاسلام کا بدروہی ایک ہیبت ناک ادعائے خودی کے ساتھ اعلان بغاوت کر رہا تھا۔ نذرالاسلام کی نظم 'بدروہی' سے ہمیں متعارف اس کے ترجمے کے ذریعے اختر حسین رائے پوری ہی نے کرایا تھا۔'' ۷۱

اختر حسین رائے پوری کا شمار ترقی پسند ادب کے اولین معماروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی خود

نوشت ''گرد راہ'' میں اپنی زندگی کے تجربات، مشاہدات اور دھوپ چھاؤں کے جہالت کو روشن کیا ہے۔ ''گرد راہ'' کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے گذشتہ پچاس پچپن سال کے اہم سیاسی واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں جگہ جگہ ان کی اپنی ذاتی رائے اور تأثرات بھی ملتے ہیں۔ اختر حسین رائے پوری دو شخصیات — مولوی عبدالحق اور پنڈت بنارسی داس چترویدی سے بے حد متأثر تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ ان دونوں کی شخصیات نے اختر حسین کی شخصیت کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ممتاز حسین کو اس بات کی شکایت ہے کہ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اپنے معاصر ادیبوں کا ذکر بہت ہی کم کیا ہے۔ ممتاز حسین اس کا سبب بھی بتاتے ہیں:

> ''شاید اس لیے کہ باہر رہنے کی وجہ سے ان سے ملنے کا انھیں بہت کم موقع ملا۔ ویسے وہ دیر آشنا اور خلوت نشیں بھی ہیں۔'' ۲؎

ممتاز حسین گرد راہ کی خوبی اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''بہر حال جو کچھ بھی لکھوایا ہے وہ خاصا دل چسپ ہے۔ اس کو پڑھنے میں ایک ناول کا لطف ملتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں ہمیں بہت کچھ ان کی شخصیت کے گوشوں میں جھانکنے اور ان کی شخصیت کی تعمیر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہاں ان کے دور اور ان کے زمانے کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مکتبہ افکار کی یہ ایک قابل تحسین پیش کش ہے اس کی کچھ داد صہبا لکھنوی کو بھی ملنی چاہیے۔ ۳؎

اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں اختر حسین رائے پوری نے اردو کتابوں پر تبصرے کیے جو بہت مقبول ہوئے۔ ان کی مقبولیت میں ان کے دل کش انداز بیان کو بڑا دخل ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ انھوں نے جو کچھ اردو ادب کی تنقید، افسانے اور مضمون کی صورت میں دیا ہے۔ وہ اردو کا ایک نا قابل فراموش سرمایہ ہے۔ ان کا نام جدید اردو ادب کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

پریم چند:

پریم چند نئی کہانی کے فن کے موجد کہے جاسکتے ہیں۔انھوں نے ہندوستانی زندگی کی کثیر الجہات کش مکش کو اپنی تخلیقات میں اس طریقے سے پیش کیا کہ کہانی سماج کا جیتا جاگتا آئینہ بن گئی اور ان کے بعد لکھنے والوں کے سامنے نئی سمتیں نمایاں ہوگئیں۔ پریم چند اردو کے عظیم ترین ناول نگار بھی ہیں اور جدید اردو ناول کے بنیاد گزار بھی۔ ''چوگان ہستی'' کو پریم چند نے اپنا بہترین ناول کہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ''گئودان'' کو چھوڑ کر ان کے باقی تمام ناولوں کی بہ نسبت یہ زیادہ فن کارانہ ہے۔اس عہد کے مسلکی مسائل کام یابی کے ساتھ اس میں پیش ہوئے ہیں۔ ''میدان عمل'' ان کا ایک کام یاب ناول ہے۔ یہ اس زمانے میں لکھا گیا ہے جب پریم چند کو نہ مہاتما گاندھی پر بھروسا رہا تھا اور نہ بھگوان پر وشواس۔اگر کسی چیز پر اعتماد تھا تو وہ تھا عمل۔گئودان پریم چند کا آخری ناول ہے جو فنی تکمیل کا بہترین نمونہ ہے۔

''پریم چند کی ناول نگاری'' ممتاز حسین کا ایک فکر انگیز مضمون ہے۔اس میں انھوں نے پریم چند کے افکار کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ممتاز حسین کا خیال ہے کہ پریم چند کا بنیادی رجحان آئیڈیل حاصل کرنے کا ہے۔وہ ٹالسٹائی کے نہ صرف آرٹ سے متاثر تھے بلکہ ان کے خیالات اور معتقدات سے بھی بہت متأثر تھے۔ان کا آرٹ تمام تر اخلاقی ہے۔ پریم چند کے یہاں حقیقت نگاری بدرجہ اتم موجود ہے۔زندگی کی جیسی حسین اور سچی تصویر، جذبات کی داخلی کش مکش اور اس کے نتیجے میں عوام الناس کے قلبی اسرار جس طرح ان کے یہاں کھلتے ہیں، دوسرے ادیبوں کے یہاں اس کامیابی کے ساتھ نہیں کھلتے۔

ٹیگور اور اقبال کی طرح منشی پریم چند نے بھی سرمایہ دارانہ نظام کو اخلاقی نقطہ نظر سے مسترد کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھنے لگے تھے جس میں تصوراتی قسم کا سوشلزم موجود تھا۔ وہ حال کی اصلاح مذہبی یا پرانی اخلاقی اقدار سے کرنے کے حق میں تھے۔مقصد کے حصول میں وہ خواب و خیال تک محدود نہیں تھے بلکہ عملی طور پر اس کے حصول کے خواہاں تھے۔ان کا یہ فن اتنا متحرک ہوگیا کہ اس پر انقلابی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔منشی پریم چند عمل کے ساتھ ساتھ عدم تشدد بھی چاہتے تھے۔اس کے لیے انھوں نے یہ راستہ نکالا کہ وہ مظلوم کو ظالم سے لڑانے کے بجائے ظالم میں نفسیاتی یا روحانی تبدیلی کا عمل پیدا کر دیتے

ہیں۔ وہ ظالم کو اس کے انجام تک پہنچاتے تو ہیں لیکن اس میں روحانی تبدیلی لا کر ایسا کرتے ہیں۔

پریم چند کا آرٹ اخلاقی ہے۔ اسے نیچرلزم کے زاویے سے نہیں جانچا جا سکتا۔ پریم چند کا یہ نظریہ کہ انسان میں نیک بننے کا جذبہ فطری ہے ایک رومانوی تصور ہے۔ وہ گورکی طرح کسی انقلابی رومانیت کے فن کار نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس ٹالسٹائی کی روایت کے فن کار ہیں جس کے یہاں جذبات کی انقلابی قوت پر اتنا زور نہیں ہے جتنا کہ تصورات کی معقولیت پر ہے۔ لوگوں کے عقائد اور خیالات بدلنے کی یہی معقولیت ہمیں منشی پریم چند کے ناولوں میں بھی نظر آتی ہیں۔

پریم چند کے آرٹ کو فنی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے ناول میں فن اور زندگی کا امتزاج اور قربت ملتی ہے۔ ان کا انداز بیان سادہ اور سہل ہے۔ ان کے یہاں غضب کی برجستگی بھی ہے۔ انھوں نے حال کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو پیش کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''ان کی نظر میں فطرت وجود (Being) ہے نہ کہ ارتقا (Becoming) لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ حال کو اس کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں اور اس کو خارجی نقطہ نگاہ سے پیش کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کا آرٹ ہمارے قدیم افسانوی ادب سے بہت ہی آگے ہے۔ زندگی اور آرٹ کی جیسی قربت ہمیں منشی پریم چندر کے یہاں ملتی ہے ویسی ہمارے کسی دوسرے ناول نگار کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ ان کے کردار صرف ٹائپ ہی نہیں بلکہ وہ افراد بھی ہیں جو اپنی گوناگوں انفرادیتوں کے حامل ہیں۔ ان کا یہ آرٹ زندگی سے اس قدر قریب ہے کہ وہ اس کی قربت میں خود اپنے کو بھول جاتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو اپنے آرٹ میں مرتسم کرنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ اس کی سچائی کو بروئے کار لانے میں خود اپنے کو مٹا دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے آرٹ میں کسی قسم کی کوئی آرائش نہیں ہے، اور نہ ان کے اسٹائل میں کوئی شعوری تراش وخراش ہے''۔[۴۷]

خدیجہ مستور:

ممتاز حسین نے فکشن کی تنقید پر کم توجہ دی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فکشن پر تنقید بہت کم ملتی ہے۔ انھوں نے فکشن پر صرف تین تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ان ہی مضامین میں ایک مضمون مشہور افسانہ نگار خدیجہ مستور کے فن پر ہے۔ افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں خدیجہ کا نام اعتبار و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کا ناول ''آنگن'' ناقدین ادب سے داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ممتاز حسین کا مضمون ''خدیجہ مستور کا فن'' معنی خیز اور فکر انگیز مضمون ہے، انھوں نے خدیجہ کے ناول کے مطالعے کے بعد عورتوں کے مسائل اور ان کے حقوق سے متعلق کئی سوالات قائم کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ممتاز حسین نے مضمون کی ابتدا میں ہی لکھا ہے:

> ''خدیجہ مستور نے اپنے ناول میں کسی جگہ یہ جملہ لکھا ہے کہ ''عورت کسی نہ کسی مرد سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مفہوم ہوگا کہ محبت اس کا مقدر ہے — یعنی ایک جبر ناگزیر — اور چوں کہ محبت اس کا مقدر ہے اس کی زندگی کی ٹریجڈی اس کے اسی مقدر یا مرد سے محبت یا نفرت کے گرد گھومتی ہے — کیا عورت اپنے اس مقدر پر غالب آسکتی ہے؟ — غالب آنے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ اسے فنا کرسکتی ہے بلکہ یہ کہ اسے آزادی میں تبدیل کرسکتی ہے، اسے ایک معقول جذبے کی صورت دے سکتی ہے۔ اسے دوستی، احترام، باہمی تعاون، ایثار و قربانی کی قدروں میں تبدیل کرسکتی ہے، یا یہ کہ اس کے نیش غم کو گوارا کرسکتی ہے، اس کی تاب لاسکتی ہے؟ — یہ ایک بڑا سوال ہے، اور اس کا جواب ایک ایسی عورت ہی دے سکتی ہے، جس میں اپنے مقدر کو بدلنے یا اس پر غالب آنے کا حوصلہ ہو۔'' [۵۷]

خدیجہ کے فکشن کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے فن میں عورتوں کے حوالے سے مقدر ساز ماحول کو

بدلنے کا رجحان ملتا ہے۔ وہ افسانے اور ناول دونوں میں مرد کی بے وفائی اور اس کے ظلم کو روشنی میں لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے اس بیان میں تلخیاں راہ پا جاتی ہیں۔ لیکن وہ انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ اس کا احساس ان کے ناول ''آنگن'' میں بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''خدیجہ میں یہ حوصلہ تھا اپنے مقدر ساز ماحول کو بدلنے کا، وہ ان کے فن کا طرہ امتیاز لیکن وہ اپنے فن کی اس منزل تک آہستہ آہستہ پہنچی تھیں ——وہ اپنی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں بالعموم مرد کی بے وفائی اور مرد کے ظلم کو بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ان کے اس بیان میں جا بجا تلخیاں ہیں لیکن انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ اس کی کچھ جھلکیاں ''آنگن'' میں بھی ملتی ہیں۔''[٦٧]

یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ خدیجہ مستور کے ناولوں اور افسانوں میں نسائی حسیت پورے طور پر پائی جاتی ہے جس کا اظہار بجا طور پر انھوں نے ''تین عورتیں'' میں کیا ہے۔ اس افسانہ میں عورتوں پر گزرنے والے تین قسم کے ظلم کا بیان ہے۔ ایک محبت میں ناکام رہتی ہے، دوسرے کو اس کا شوہر شادی کے ایک سال کے بعد طلاق دیتا ہے، تیسری وہ عورت ہے جو اپنے شوہر کی شریک زندگی تو ہے رفیق زندگی نہیں۔ ممتاز حسین اپنے تجزیے میں اس پہلو پر زور دیتے ہیں۔ وہ خدیجہ کے فن کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ معاشرے میں عورتوں سے متعلق سوچ پر اور خود عورتوں کی زندگی میں بدلاؤ کے لیے خدیجہ کی تحریروں کو بہت دخل ہے۔ اس کی بازگشت بین الاقوامی سطح پر سنی گئی۔ میکسکو میں منعقدہ عورتوں کے بین الاقوامی سمینار میں جو آوازیں بلند ہوئیں اس میں خدیجہ کے ناولوں اور افسانوں کے تمام نسائی کردار شریک تھے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''سچ تو یہ ہے کہ خدیجہ کے ناولوں اور افسانوں کے تمام نسائی کردار اس جلوس میں شریک تھے—— تاریخ بتاتی ہے کہ گیلیلیو نے بائبل کے لکھے کو بدل دیا—— ایسا ہی کچھ عورتوں کے اس جلوس نے بھی کیا—— اس نے بھی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ دیا ہے اور اس میں خدیجہ کی تحریروں کو بھی

دخل ہے۔''۷۷؎

ممتاز حسین کی تنقیدی نگارشات کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقید کے قابل قدر نمونے پیش کیے۔ بنیادی طور پر وہ ترقی پسند نقاد تھے لیکن ان کے نظریات میں اتنی شدت نہیں پائی جاتی جو بعض دوسرے ترقی پسند نقادوں کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ممتاز حسین ادب کو نظریے کا اشتہار بنانے کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ ادب کی جمالیاتی قدروں پر بھی اصرار کرتے تھے۔ اس لیے ان کے نظریات میں اعتدال اور توازن کی کیفیت نمایاں ہے۔ جہاں تک ان کی عملی تنقید کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے دیگر ترقی پسند نقادوں کی طرح ممتاز حسین نے اردو کے کلاسیکی ادبی سرمایے کو مسترد نہیں کیا بلکہ اس کی از سر نو معنویت دریافت کی۔ اس کی اہمیت کا اقرار کیا اور اس پر اصرار بھی کیا۔ ان کی عملی تنقید میں ایک خاص بات جو دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تحقیقی ژرف نگاہی کا عمل دخل نمایاں ہے۔ ممتاز حسین ایک اعلیٰ درجے کے محقق بھی تھے اسی لیے ان کی تنقیدی نگارشات، تحقیق اور تنقید کا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہیں۔ وہ افسانوی ادب کے بھی بہترین پارکھ ہیں اور غیر افسانوی نثر کے سرمایے کا بھی انھوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اسی طرح نثر کے ساتھ ساتھ انھوں نے شاعری کا مطالعہ بھی ایک خاص انداز سے کیا ہے۔ حالی، یگانہ، جوش، اکبر، فراق اور فیض جیسے شعراء کے کلام کا مطالعہ اور جائزہ اردو تنقید میں ان کے وسیع کینوس کو ظاہر کرتا ہے۔ ممتاز حسین اردو کے ایک قابل قدر نقاد تھے۔ ان کی تنقید میں معروضی اور سائنسی انداز کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جو ان کی اصابت رائے کا پتہ دیتی ہیں۔ اردو تنقید کی تاریخ میں ان کا نام یادگار رہے گا۔

○

حواشی:

۱۔ پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال، شہزاد منظر، منظر پبلیکیشنز، ۱۹۹۶ء، ص: ۹۰
۲۔ تاریخ ادب اردو (ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک (جلد دوم)، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۷ء، ص: ۹۲۶
۳۔ محولہ بالا، ص: ۹۲۹
۴۔ پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال، شہزاد منظر، منظر پبلیکیشنز ۱۹۹۶ء، ص: ۹۹
۵۔ ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ (ہندوستان)، سید محمد عقیل، دریا آباد، الہ آباد ۲۰۰۹ء، ص: ۱۰۹
۶۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۷ء، ص: ۳۲۵-۳۲۴
۷۔ تاریخ ادب اردو، نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص: ۴۶۶
۸۔ ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ (ہندوستان میں)، سید محمد عقیل، ص: ۱۱۰
۹۔ ان مضامین کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے نئے تنقیدی گوشے از ممتاز حسین، ص: ۲۱۶-۱۸۲ نیز مارکسی جمالیات از ممتاز حسین، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء
۱۰۔ نئی قدریں، ممتاز حسین، استقلال پریس لاہور، ۱۹۵۳ء، ص: ۱۲
۱۱۔ ادبی مسائل، ممتاز حسین، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۸۹-۸۸
۱۲۔ محولہ بالا، ص: ۹۳
۱۳۔ نئی قدریں، ممتاز حسین، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۵۳ء، ص: ۶۰-۵۹
۱۴۔ نقد حرف، ممتاز حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۵۰
۱۵۔ محولہ بالا، ص: ۱۵۱
۱۶۔ ادب اور شعور، ممتاز حسین، اردو اکیڈمی، سندھ کراچی، ۱۹۶۱ء، ص: ۲۱۴
۱۷۔ محولہ بالا، ص: ۴۱۱، ۴۱۰
۱۸۔ نقد حرف، ص: ۱۴۵
۱۹۔ پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال، شہزاد منظر، ص: ۹۶-۹۵
۲۰۔ مارکسی جمالیات، ممتاز حسین، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص: ۳۲
۲۱۔ محولہ بالا، ص: ۲۳
۲۲۔ محولہ بالا، ص: ۲۴
۲۳۔ محولہ بالا، ص: ۲۲
۲۴۔ محولہ بالا، ص: ۵۷
۲۵۔ محولہ بالا، ص: ۵۷
۲۶۔ محولہ بالا، ص: ۵۴-۵۳
۲۷۔ محولہ بالا، ص: ۵۹، ۵۸
۲۸۔ ادبی مسائل، ص: ۳۵
۲۹۔ محولہ بالا، ص: ۷۰
۳۰۔ محولہ بالا، ص: ۷۸

۳۱۔ محولہ بالا،ص:۱۵۳
۳۲۔ محولہ بالا،ص:۱۷۰
۳۳۔ امیر خسرو دہلوی، حیات اور شاعری، ممتاز حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی،۱۹۸۲ء،ص:۱۵
۳۴۔ محولہ بالا،ص:۱۰۵
۳۵۔ پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال، شہزاد منظر،ص:۹۷
۳۶۔ جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، ڈاکٹر شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ،۱۹۹۴ء،ص:۳۷۹
۳۷۔ محولہ بالا،ص:۳۸۰
۳۸۔ نقد حرف،ص:۲۸۱
۳۹۔ محولہ بالا،ص:۲۸۲
۴۰۔ محولہ بالا،ص:۲۸۳
۴۱۔ محولہ بالا،ص:۲۸۶
۴۲۔ محولہ بالا،ص:۲۸۸
۴۳۔ محولہ بالا،ص:۳۰۰
۴۴۔ غالب: ایک مطالعہ، ممتاز حسین، انجمن ترقی اردو، کراچی،۱۹۶۹ء،ص:۱۰-۹
۴۵۔ محولہ بالا،ص:۱۱
۴۶۔ غالب: ایک مطالعہ،ص:۱۶۴
۴۷۔ انتخاب غالب، ممتاز حسین، اردو اکیڈمی، سندھ،۱۹۵۷ء،ص:۱۶
۴۸۔ جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، ڈاکٹر شارب ردولوی،ص:۳۷۹
۴۹۔ محولہ بالا،ص:۳۸۰
۵۰۔ نئی قدریں،ص:۲۰۷
۵۱۔ محولہ بالا،ص:۲۰۸
۵۲۔ محولہ بالا،ص:۲۰۸
۵۳۔ محولہ بالا،ص:۵۳
۵۴۔ محولہ بالا،ص:۵۴
۵۵۔ یگانہ: شخص اور شاعری، ممتاز حسین، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۸۸ء،ص:۸
۵۶۔ محولہ بالا،ص:۲۱
۵۷۔ نقد حرف،ص:۲۱۸
۵۸۔ محولہ بالا،ص:۲۱۸
۵۹۔ محولہ بالا،ص:۲۱۹
۶۰۔ نقد حرف،ص:۳۴
۶۱۔ محولہ بالا،ص:۴۱،۴۰
۶۲۔ محولہ بالا،ص:۷۴
۶۳۔ محولہ بالا،ص:۷۷

۶۴ محولہ بالا،ص:۷۹
۶۵ محولہ بالا،ص:۸۷
۶۶ محولہ بالا،ص:۹۸
۶۷ محولہ بالا،ص:۱۰۱
۶۸ محولہ بالا،ص:۲۲۹
۶۹ محولہ بالا،ص:۲۳۰-۲۲۹
۷۰ محولہ بالا،ص:۲۳۴
۷۱ محولہ بالا،ص:۲۳۵
۷۲ محولہ بالا،ص:۲۳۹
۷۳ محولہ بالا،ص:۲۳۹
۷۴ ادب اور شعور،ص:۲۸۳
۷۵ نقد حرف،ص:۲۴۰
۷۶ محولہ بالا،ص:۲۴۰
۷۷ محولہ بالا،ص:۲۴۳

باب چہارم

ممتاز حسین بحیثیت محقق

(i) تحقیق کا مفہوم
(ii) اردو میں تحقیق و تدوین کی روایت
(iii) ممتاز حسین کی تحقیقی خدمات

(i) تحقیق کا مفہوم:

ممتاز حسین کی تحقیقی خدمات کے مطالعے اور جائزے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ تحقیق کے معنی و مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے اردو تحقیق کے ارتقا کی تاریخ پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے۔

تحقیق کیا ہے؟ اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق حقائق کی بازیافت کا نام ہے۔ جب کسی حقیقت کے چہرے پر وقت اور حالات کی دھول اس طرح جم جاتی ہے کہ اس کا نظر آنا مشکل ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی محقق اس حقیقت کی ٹھوس اور چمکدار سطح سے وقت اور حالات کی دھول کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتا ہے اور اس حقیقت کا اصلی چہرہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ حقیقت تک رسائی کا جذبہ اور اس کی بازیافت کی کوشش نہ صرف اہل علم کو ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے بچاتا ہے بلکہ راہ حقیقت کو بھی آسان بناتا ہے۔ حالات و واقعات جو ماضی کا حصہ بن کر ہمارے دائرۂ علم سے باہر ہوجاتے ہیں محقق ان حالات و واقعات کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو از سر نو جوڑ کر حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ محقق بھولی بسری سچائیوں کو از سر نو مرتب کر کے، اپنی تہذیبی تشخص کا عرفان حاصل کر کے علوم و فنون کے کارواں کو نئی جہتوں سے روشناس کراتا ہے۔ اس لیے علم و ادب اور تصنیف و تالیف کے میدان میں کام کرنے والوں کے مقابلے میں محقق کا منصب زیادہ اہم اور بڑا ہے اور نسبتاً زیادہ غور و فکر اور زیادہ دقت نظر کا تقاضہ کرتا ہے۔

دیگر فنون لطیفہ کی طرح تحقیق بھی ایک فن ہے۔ یہ ایک ذہنی رویہ بھی ہے اور طرز زندگی بھی ہے۔ ایک مخصوص طرز زندگی کا حامل انسان سنی سنائی باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا۔ وہ حالات و واقعات کی تہہ میں جا کر حقائق کی نئی راہ کھولتا اور نئی سمت متعین کرتا ہے۔ یہ ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ صحیح اور غلط کے درمیان

تفریق کی جاتی ہے۔اس کے ذریعہ نامعلوم سے معلوم تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ انسان کی محققانہ فطرت کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ دشت و بیاباں کی زندگی سے نکل کر تہذیب وتمدن کی سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ اپنے تحقیقی عمل کے ذریعے ہی اس نے گزربسر، خورد ونوش، نقل وحمل اور زندگی کے مختلف شعبوں میں بے پناہ ترقیاں کیں۔تحقیق کا یہ عمل جاری ہے اور مسلسل جاری رہے گا۔تحقیق اور غور وفکر انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ فطرت کا یہی تقاضہ اسے غور وفکر میں مبتلا رکھتا ہے۔ انسان کے اندر تجسس کا مادہ ازل سے ہے۔اسی تجسس نے اسے جانوروں سے ممتاز کیا اور اشرف المخلوقات بنایا۔انسانی ارتقا کا دارومدار تحقیق پر ہے۔ یہ انسانی معاشرہ کی ضرورت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”تحقیق زندگی کی ہر سطح پر ایک زندہ معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔“[۱]

تحقیق تفتیش کا ایک انداز ہے۔نامعلوم حقایق کی تلاش و دریافت کرنا،معلوم شدہ حقائق کی تجدید کرنا، اسے نئے انداز سے پیش کرنا اور کسی نئے پہلو کا انکشاف کرنا، تحقیق کہلاتا ہے۔تحقیق غور وفکر کا ایک منظّم طریقہ ہے جس میں شہادت کے ذریعہ فیصلوں تک پہنچا جاتا ہے۔مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تحقیق کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ حقائق کی دریافت کرلی جائے۔اس سلسلے میں ضروری ہے کہ ان حاصل شدہ حقائق کا ازسرنو جائزہ لیا جائے اور پھر نتیجے تک پہنچا جائے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ تحقیق سے مراد کسی مسئلے کا تجزیہ کرکے اس کے حل تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہے۔اس کی حقیقت کا پتہ لگانا ہے۔مکمل صداقت کے ساتھ حقائق کی بازیافت کرکے اس کے نتیجے کو مدلل طور پر پیش کرنے کا نام 'تحقیق' ہے۔زندگی کے ہر شعبے میں لگاتار ترقی کے لیے تحقیق عمل نہایت ضروری ہے۔

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے اور لفظ 'حق' سے مشتق ہے۔فرہنگ عامرہ میں ”حق“ کے معانی سزاوار واجب، راست، درست، لائق اور اللہ تعالیٰ کا ایک نام بتایا گیا ہے اور ”تحقیق“ کے معنی 'تلاش'، 'حقیقت جاننا' اور 'حق بات ڈھونڈنا' درج ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین اس کے اشتقاق، مصدر اور معنی سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”تحقیق عربی لفظ ہے۔ یہ باب تفعیل سے مصدر ہے۔اس کے اصلی حروف ح ق ق ہیں۔اس کا مطلب ہے حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف

پھیرنا۔''۲؎

یوسف حسین سرمست اپنے ایک مضمون ''ادبی تحقیق کا طریقہ کار'' میں لکھتے ہیں:

''فارسی میں تحقیق کے لیے 'پژوہش' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی کھوج کرنے اور تلاش کرنے کے ہیں۔ جستجو کا لفظ بھی تحقیق کے لیے فارسی میں استعمال ہوتا ہے۔''۳؎

مشہور محقق قاضی عبدالودود کے مطابق:

''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔''۴؎

تحقیق سے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے:

''تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی ''حقیقت'' کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں ''موجود مواد'' کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔''۵؎

انگریزی میں تحقیق کے لیے ریسرچ (Research) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی ''توجہ سے تلاش کرنے'' کے ہیں۔ اس کا دوسرا معنی (to search back) 'دوبارہ تلاش کرنا' ہے۔۶؎

لفظ research فرانسیسی زبان کے recherche سے اخذ کیا گیا ہے، جس کا مطلب to go about seeking ہے۔ یہ لفظ قدیم فرانسیسی لفظ recherchier سے ماخوذ ہے جو دو الفاظ re+cherchier کا مرکب ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں تحقیق کے معانی اس طرح درج ہیں:

۱۔ کسی مخصوص چیز یا شخص سے متعلق گہری یا محتاط تلاش کا عمل۔

۲۔ کسی حقیقت کے انکشاف کی غرض سے محتاط غور و فکر یا کسی مضمون کے مطالعے کے ذریعے تلاش یا چھان بین، ناقدانہ یا سائنسی سلسلہ تلاش۔

۳۔ کسی مضمون کی چھان بین یا مسلسل مطالعہ۔

۴۔ دوسری بار یا بار بار کی تلاش۔۷؎

ہندی میں اس کے لیے جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ ''انوسندھان'' ہے۔ اس کا مادہ ''دھائے''

ہے جس کے معنی برقرار رکھنا ہے۔ ''سندھان'' کے معنی ''دلکش'' یا مقصود برقرار رکھنا یا نشانہ لگانا ہے۔ ''انو'' کے معنی ہیں پیچھے۔ یعنی کسی مقصود یا نشانے کا تعاقب کرنا۔ ''انوسندھان'' کا ایک معنی ٹوٹے بکھرے دھاگوں کو جوڑنا بھی ہے۔ ۸

تحقیق کے لیے ''شودھ'' کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مادہ 'شدھ' یعنی خالص ہے۔ شودھ کے معنی میل دور کر کے خالص کرنا جیسے کسی دھات مثلاً سونے کو صاف کیا جائے۔ تحقیق کے لیے انوسندھان مناسب لفظ ہوگا یا شودھ، ہندی کے عالم ڈاکٹر راوت اور کھنڈیلوال سہولت کی خاطر شودھ کو زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ ۹

(ii) اردو میں تحقیق و تدوین کی روایت:

اردو میں تحقیق و تدوین کی روایت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں تحقیق کی طرف کم توجہ کی گئی۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ اس کو کم تر درجے کا کام سمجھا گیا ہوگا۔ اس لیے ابتداءً تحقیق سے متعلق کوئی مستقل رجحان موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے اندر تحقیقی شعور کا فقدان تھا۔ اردو زبان سے باقاعدہ دلچسپی، شعر و شاعری اور دوسرے ادبی مشاغل کے سلسلے کے ساتھ اس کے ابتدائی نقوش ابھرنے لگتے ہیں۔ یہ نقوش ہمیں آغاز میں تذکروں میں ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں میر کے تذکرہ ''نکات الشعراء'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ میر کوئی محقق نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے حقائق کی جستجو کی غرض سے تذکرہ کی تدوین کی تھی، پھر بھی ان کے تذکرے میں ایسی باتیں مل جاتی ہیں جنھیں تحقیقی سفر کے ابتدائی نقوش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

تذکروں کے علاوہ ابتدائی عہد کی دوسری تحریروں میں بھی ادبی تحقیق کی ہلکی جھلک ملتی ہے۔ مثلاً سودا کے اعتراضات میں تحقیقی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑا اور آگے چلیے تو مکاتیب غالب میں کچھ ایسے مسائل زیر بحث آئے ہیں جن کو ادبی تحقیق کی ایک شکل کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی اس طرح کی جھلکیاں دیکھنے کو مل سکتی ہیں۔ لیکن اسے باقاعدہ تحقیق کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

یوں تو تحقیق کی طرف باقاعدہ توجہ سرسید کے عہد میں کی گئی لیکن اس سلسلے میں مشہور فرانسیسی محقق

گارساں دتاسی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے، جنھوں نے قدیم اردو ادب پر تحقیقی کام ۱۸۲۵ء سے شروع کیا تھا اور وہ نصف صدی تک اس کام میں مصروف رہے۔ حالانکہ انھوں نے یہ تحقیق فرانسیسی زبان میں کی لیکن اردو زبان وادب کے لیے بڑا بیش قیمت سرمایہ پیش کیا۔ ان کا یہ تحقیقی کام فرانسیسی سے ترجمہ ہو کر اردو میں شائع ہو گیا ہے۔

سرسید سے قبل اردو تحقیق کے میدان میں باقاعدہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت تک لوگوں نے صنف ادب کو اہم نہیں سمجھا۔ سرسید کے عہد میں قومی وملی شعور کی بیداری کی وجہ سے ملک و قوم کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا۔ ملک وقوم کی بہتری کے لیے کوششیں شروع ہوئیں تو زبان وادب کے معاملے میں بھی دلچسپی بڑھی۔ اس بڑھتے ہوئے ذوق وشوق نے تحقیق وجستجو کے جذبے کو بھی مہمیز کیا۔ سرسید اوران کے رفقاء میں تحقیقی شوق بدرجۂ اتم موجود تھا۔ سرسید نے اپنے تحقیقی جذبے کا اظہار ''آثارالصنادید'' میں کیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں کچھ خامیاں رہ گئی تھیں، اس کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی۔ اس میں بہت زیادہ تلاش وجستجو سے کام لیا گیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا، جس میں پہلے ایڈیشن کی کمیاں اور خامیاں دور کر دی گئیں۔ اس ایڈیشن میں مغرب کے آداب تحقیق ملحوظ رکھ کر اس میں اشاریہ وغیرہ کا بھی اضافہ کیا گیا۔ اس ایڈیشن میں داستان کے بجائے مؤرخانہ اور محققانہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ تحقیق کے معاملے میں سرسید کا ایک اور کارنامہ آئین اکبری کی تصحیح ہے۔ بہت ہی محنت اور عرق ریزی کے بعد انھوں نے معیاری متن پیش کیا ہے۔ سرسید کی اس تحقیق کے بارے میں محمود الٰہی نے لکھا ہے:

> ''ایک موضوع پر مغرب ومشرق کے مستند ماخذ کے حوالے کے بعد استخراج کی یہ پہلی شعوری کوشش تھی۔ سرسید نے صرف ابوالفضل کے مطالب میں خامی نہیں نکالی بلکہ ''دانایان فرنگ'' کے حوالے سے دوسرے مشرقی محققین کی رایوں کو بھی غلط قرار دیا۔'' [۱۰]

سرسید کی طرح ان کے رفقاء کے یہاں بھی تحقیق کی طرف ایک شعوری کوشش کا رجحان نظر آتا ہے۔ اس عہد میں حالی، نذیر احمد، شبلی اور آزاد سبھی کے یہاں تحقیقی شعور اور تنقیدی بصیرت نظر آتی ہے۔ ''مقدمۂ

شعر و شاعری'' کی وجہ سے حالی کا شمار اولین تنقید نگاروں میں ہوتا ہے لیکن ''حیات جاوید'' اور ''حیات سعدی'' کی جیسی تصانیف میں وہ اچھے محقق نظر آتے ہیں۔ شبلی اپنی مورخانہ تحقیق کے لیے مشہور ہیں۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں تحقیقی جذبے سے کام لیا ہے۔ آزاد بھی مؤرخانہ شعور کے ساتھ تحقیق کے میدان میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

تاریخی حالات کی دریافت یا سوانح کی ترتیب بھی تحقیق کا ایک جزو ہے۔ اس میں شامل افراد لوگوں کو بجا طور پر محقق کہا جا سکتا ہے۔ حالی نے سوانح لکھتے وقت واقعات کی صحت اور حقائق پر زور دیا اور ان کے مآخذ کی تلاش و جستجو کی۔ آج کے مقابلے میں اس وقت تحقیق کے وسائل کی کمی تھی جس کی وجہ سے اس وقت کی لکھی ہوئی بہت سی باتیں غلط ثابت ہو گئیں۔ لیکن اس سے ان کی تحقیق کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ ان کی یہی کوشش کافی ہے کہ انھوں نے واقعات کو ان کی صحیح شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی اور انھوں نے تمام تصنیفات میں اس صحت کا خیال رکھا ہے۔ یادگار غالب لکھتے وقت انھوں نے مرزا غالب کی زندگی سے متعلق حتی المقدور معلومات جمع کیں۔ اس کی ترتیب کے وقت انھوں نے غالب کی تصنیفات سے بھی رجوع کیا۔

حالی کے مقابلے میں شبلی نسبتاً آگے نظر آتے ہیں کیوں کہ وہ بذات خود مؤرخ بھی ہیں۔ ایک مؤرخ کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ تحقیق کے معاملے میں بہت محتاط ہوتا ہے۔ شبلی نے تاریخ اور سوانح کے علاوہ تنقید میں بھی تحقیق کے پہلو کو ملحوظ رکھا ہے۔ شبلی نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جیسے 'المامون، الفاروق، سیرت النبی، علم الکلام، شعرالعجم، موازنۂ انیس و دبیر' وغیرہ۔ ان میں المامون اور الفاروق سیرت و سوانح کا عمدہ نمونہ ہے۔ شعرالعجم فارسی شاعری سے متعلق ہے۔ موازنۂ انیس و دبیر شبلی کے شعری ذوق اور انیس شناسی کی عمدہ مثال ہے۔

تحقیق و تلاش شبلی کا مزاج تھا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا بڑی چھان بین کے بعد لکھا۔ شعرالعجم میں شبلی نے شاعر کے حالات، اس کے کلام، اس زمانہ کے سیاسی و سماجی حالات اور ان کے اثرات سے متعلق حقیقت کی تلاش کی ہے اور واقعات کا پتہ لگایا ہے۔ شبلی نے اس عہد کے شعرا کے حالات حتی المقدور پوری تحقیق کے ساتھ لکھے۔ اس وسیع موضوع پر لکھتے ہوئے اس کا امکان ہے کہ کچھ چیزیں بیان کرنے سے رہ گئی ہوں گی اور جو قابل گرفت بھی ہوں لیکن اس سے ان کی تحقیقی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ شعرالعجم کی اہمیت کا

اعتراف کرتے ہوئے محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''اس موضوع پر اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئیں شعرالعجم ان میں بغیر کسی استثناء کے بہترین تالیف کہی جاسکتی ہے۔''[۱۱]

حالانکہ آزاد کو تحقیق کے میدان کا شہسوار نہیں مانا جاتا اور ان کی تحقیق کا مسئلہ بحث کا موضوع رہا، لیکن ان کو محقق نہ ماننا ان کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنی تصنیفات ''سخندان فارس'' اور ''آب حیات'' کے ذریعہ لسانی حقیقتوں پر روشنی ڈالی ہے اور اردو شاعری کو تاریخی ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کی الگ الگ خصوصیات لکھیں۔ اس طرح قدیم شعرا کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ ان کے اسلوب نگارش کی وجہ سے ان کی تحقیقات پر اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں تحقیقی رنگ سے زیادہ افسانوی رنگ ہے۔ ان کا انداز تمثیلی ہے جو ناولوں اور افسانوں کے لیے تو مناسب ہوسکتا ہے لیکن تحقیق کے لیے نہیں لیکن اس میں ان سے زیادہ ان کے عہد کا قصور ہے، جہاں ادب میں یہ رنگ غالب تھا۔ دوسرے وہ اس لیے قابل معافی ہوسکتے ہیں کہ آج کی طرح اس وقت تحقیق، تنقید، افسانے اور ناول کے لیے اسلوب اور انداز طے نہیں تھا۔ مسعود حسن ادیب نے ان کے بارے میں درست لکھا ہے کہ:

''حضرت آزاد نے آب حیات میں معلومات کا وہ انبار لگا دیا تھا کہ جو تنگ نگاہوں میں سما نہیں سکتا۔ ان کی تحقیق کی وسعت اور جامعیت کا یقین کرنے سے زیادہ آسان یہ معلوم ہونے لگا کہ ان کے اکثر بیانوں کا من گڑھت افسانوں میں شمار کرلیا جائے...... آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں لیکن کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کا فرق سمجھتے ہیں ان کی نظر میں وہ محقق ہی ٹھہرتے ہیں۔''[۱۲]

آزاد نے اپنی تحقیق کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ مآخذ سے فائدہ اٹھایا ہے، لیکن تحقیق ایسا موضوع ہے کہ کسی چیز کے بارے میں قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہی حرف آخر ہے۔ ان کی روشنی میں پچھلے فیصلے رد ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں یہ کہنا کہ انھوں نے مخصوص باتیں بغیر کسی تحقیق کے

لکھ دیں، غلط ہی نہیں نا مناسب بھی ہے۔

اردو کے جدید محققین کی فہرست میں عبدالحق کا نام بہت معتبر اور اہم ہے۔ دوسرے موضوعات کے علاوہ ان کی تحقیق کا خاص موضوع دکنی ادب اور تذکرہ ہے۔ ان کی کتابوں میں ''نصرتی ملک الشعراء بیجاپور''، ''اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے ملا وجہی کی تصنیف ''سب رس'' اور ''قطب مشتری'' کو تحقیقی مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''دیوان اثر، تذکرہ ریختہ گویاں، تذکرہ ہندی، گل عجائب یعنی تذکرہ شاعراں، ریاض الفصحا (تذکرہ ہندی) دیوان تاباں، انتخاب داغ، باغ و بہار، مرحوم دہلی کالج'' وغیرہ کو مرتب کیا اور تحقیقی مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ انھوں نے شبلی کے مرتب کیے ہوئے تذکرے ''گلشن ہند'' پر ایک طویل عالمانہ اور محققانہ مقدمہ لکھا۔

عبدالحق کا یہ کارنامہ ہے کہ قدیم اردو کے سرمایے جو مخطوطات کی شکل میں تھے، کی تلاش کر کے انھیں ترتیب دے کر شائع کیا اور انھیں برباد ہونے سے بچالیا۔ ان کتابوں پر مقدمے لکھے، ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مصنفین کے حالات زندگی دریافت کر کے ہم تک پہنچائے۔ ان تصانیف کے عہد کی خصوصیات واضح کیں۔ عبدالحق نے کسی بھی کتاب کی ترتیب کے وقت اس کے جو نسخے جہاں کہیں سے ملے، ان کا تقابلی مطالعہ کر کے متن کی صحت کی اور بہت زیادہ عرق ریزی سے چھان بین کے بعد بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ مثال کے طور پر انھوں نے اس خیال کی تردید کی کہ میر امن کی ''باغ و بہار'' فارسی کے قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ انھوں نے دلیلوں سے ثابت کر دیا کہ اس کا ماخذ 'نوطرز مرصع' ہے۔ وہ اردو ادب کی تحقیق میں زبان کی تدریجی خصوصیات کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ''باغ و بہار'' کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''باغ و بہار اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔
> میر امن خاص دلی کے رہنے والے ہیں اور ان کی زبان خاص ٹھیٹھ دلی
> کی زبان ہے اور ان کا لکھنا سند ہے۔ مصنف کو زبان پر قدرت ہے۔ وہ
> ہر موقع پر اسی کی مناسبت سے ٹھیٹھ الفاظ استعمال کرتا ہے اور ہر کیفیت
> اور ہر روایت کا نقشہ ایسی خوبی سے کھینچتا ہے کہ اس کے کمال انشاپردازی
> کی داد دینی پڑتی ہے۔''[۱۳]

عبدالحق ایک بے لوث محقق ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں خلوص اور صداقت کے عناصر موجود ہیں۔اس میں جانب داری اور بغض وعناد کا اظہار نہیں ہوتا۔

پروفیسر محمود شیرانی کا نام اردو کے نامور محققوں میں ہوتا ہے۔تحقیق سے ان کی طبعی مناسبت تھی۔ ایک زمانے تک وہ اورینٹل کالج میگزین میں مختلف موضوعات پر تحقیقی مضامین لکھتے رہے۔ان میں سے بعض کو انھوں نے کتابی شکل بھی دے دی۔انھوں نے اپنا میدان صرف تحقیق کو سمجھا، اسی وجہ سے تنقید کی طرف توجہ نہیں کی۔تحقیق سے ان کو غیر معمولی شغف تھا۔

تحقیق سے طبعی مناسبت کی وجہ سے محمود شیرانی نے کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ان کی اہم ترین تحقیقی تصانیف میں ''پرتھی راج راسا، تنقید شعرالعجم، پنجاب میں اردو، مجموعۂ نغز، تنقید آب حیات، فردوسی پر چار مقالے، خالق باری'' وغیرہ اہم ہیں۔

''پرتھی راج راسا'' کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دیسی زبانوں کی قدیم ترین کتابوں میں ہے جس کو چندر بردائی نام کے ایک شاعر نے پرتھوی راج کے عہد میں تصنیف کیا تھا جس میں راجپوت خاندان کے حسب ونسب، اس زمانے کے حالات، پرتھوی راج اور شہاب الدین کے حالات اور جنگی کارناموں کی تفصیل ملتی ہے، جو تاریخی اور لسانی دونوں اعتبار سے اہم ہے۔ان کی اس تحقیق سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بعض محققین نے راسا کی بنیاد پر جو بدگمانی پھیلائی تھی، اس کی حقیقت واضح ہوگئی۔

''تنقید شعرالعجم'' ان کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے، جس میں انھوں نے ''شعرالعجم'' کے مصنف شبلی نعمانی کی تحقیقی خامیوں اور غلطیوں کو نشان زد کیا ہے۔اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران کی تاریخ اور وہاں کے قدیم ادب پر ان کی نگاہ کتنی گہری تھی۔انھوں نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

> ''تنقید ہٰذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقبت نہیں ہے بلکہ محض
> احتجاج ہے اس مروجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی
> جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔[۱۴]

''پنجاب میں اردو'' میں شیرانی نے اردو کی پیدائش کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اردو پنجاب سے نکلی ہے۔انھوں نے مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ اردو کا مولد پنجاب ہے۔''پنجاب میں اردو''

لسانی تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ محی الدین قادری زور نے 'پنجاب میں اردو' کے بارے میں لکھا ہے:

''محمود شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اردو' اردو زبان کی پہلی معیاری تحقیقی کتاب ہے اور اس نے تحقیق کا ایک ایسا اونچا معیار قائم کر دیا ہے جو کسی بھی ترقی یافتہ زبان اور ادب کے لیے قابل فخر سمجھا جا سکتا ہے۔''۱۵

قدرت اللہ قاسم کے ''مجموعہ نغز'' کا واحد نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ تھا۔ انھوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ اسے ترتیب دے کر شائع کیا۔ اس کے علاوہ ''فردوسی پر چار مقالے''، ''خالق باری'' اور 'تنقید آب حیات' ان کے اہم کارنامے ہیں۔

شیرانی عربی و فارسی کے بڑے عالم تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ وہ محققین اور مصنفین کی غلطیوں پر بہت آسانی سے انگلی رکھ دیتے تھے۔ آزاد اور شبلی وغیرہ کی غلطیوں کی انھوں نے خاص طور پر گرفت کی ہے۔

اردو تحقیق کی دنیا میں قاضی عبدالودود کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان کا تحقیقی رویہ بہت محتاط ہے۔ ان کے یہاں ذوق وشوق، مطالعے میں ہمہ گیری اور مستقل مزاجی وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو ایک محقق کے لیے ضروری ہیں۔ ان کے مزاج میں اکھڑ پن ہے، وہ خوش خلق ہونے کے باوجود سچ بات بڑی بے باکی اور دوٹوک انداز میں کہتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں بخشتے ہیں۔ یہ باتیں تحقیق کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی تنقید بالکل غیر جانب دارانہ ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بڑی قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں۔

قاضی صاحب کا انداز دوسرے محققین سے مختلف ہے۔ وہ حالات و واقعات کی جستجو، شاعر اور مصنف، اس کے احباب واعزاء وغیرہ کے رشتوں کی تلاش اور متن کی صحت کا موازنہ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے مضامین اور کتب کو بسا اوقات اغلاط، تضاد، اختلاف متن وبجہ وغیرہ کا کٹیلاگ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے غالب اور شاد سمیت دوسرے شعراء پر بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ اپنی تحقیق میں انھوں نے دوسرے محققین کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے اس میدان کے نو واردوں کو محتاط بنا دیا ہے۔

قاضی صاحب کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور ان کی نگاہ باریک بیں ہے۔ انھیں بہ یک وقت کئی زبانوں پر

عبور حاصل ہے۔ انھیں اردو، عربی، فارسی اور کچھ یورپی زبانوں پر دسترس حاصل ہے۔ اس وجہ سے انھیں دوسرے محققوں پر سبقت حاصل ہے۔ کسی بھی معاملے میں وہ سارے اسناد، شواہد اور ثبوت اکٹھا کرنے کے بعد ہی اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔ تحقیق کے معاملے میں وہ سارے ممکنہ مآخذ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے اہم تحقیقی کارناموں میں ''غالب بحیثیت محقق، یادداشتہائے قاضی عبدالودود، جہان غالب، آوارہ گرد اشعار'' اور ''تعین زمانہ'' شامل ہیں۔ ''دیوان رضا، قطعات رضا'' اور ''تذکرہ ابن طوفان'' مرتب کر کے انھوں نے تدوین کا معیاری نمونہ پیش کیا ہے۔ ''دیوان جوشش''، ''قاطع برہان''، ''اشتر وسوزن''، ''تذکرہ سرمست افزا'' ان کے دیگر اہم کام ہیں۔ انھوں نے پٹنہ سے ایک تحقیقی مقالہ 'معاصر' بھی نکالا جس نے تحقیق کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ایک اور رسالہ 'تحقیق' شروع کیا جس کا صرف ایک شمارہ نکل سکا۔

تحقیق کی دنیا میں قاضی صاحب نے جو راہ متعین کی وہ نئی نسل کے محققوں کے لیے ایسی راہ ثابت ہوئی جس پر چل کر وہ تحقیق کے آداب اور انداز سے آشنا ہو سکے۔ یہ ان ہی کی دین ہے جس کی وجہ سے نئی نسل کے محققوں میں تشکیک اور احتیاط پسندی کا رجحان بڑھا ہے۔ ان کی وجہ سے مضبوط دلیلوں کے بغیر دعوؤں کو قبول نہ کرنے کا انداز فروغ پایا۔ یہ ان ہی کی برکت ہے کہ منطقی استدلال نے اہمیت پائی اور زود یقینی اور خوش اعتقادی کو کم عیار مان کر مسترد کر دیا گیا۔

قاضی صاحب نے اپنی تحقیقی کتب اور مضامین میں جو زبان استعمال کی ہے اس میں دلکشی نہیں ہے، لیکن وہ خالص تحقیقی زبان ہے۔ ان کی زبان کو ریاضی کی زبان بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ کفایت لفظی سے کام لیتے ہیں۔ ناپ تول کر لکھتے ہیں، الفاظ کا غیر ضروری استعمال نہیں کرتے۔ اردو تحقیق ان کے احسان سے گراں بار ہے۔ ان کے تحقیقی کارناموں کے اعتراف میں رشید حسن خاں نے لکھا ہے کہ ''قاضی عبدالودود کو اردو میں تحقیق کا معلم ثانی کہنا چاہیے۔''۱۶

قاضی عبدالودود کی طرح ہی تحقیقی ذمہ داری کے سلسلے میں ایک دوسرا اہم نام مسعود حسین ادیب کا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی اردو ادب کے لیے وقف کر دی۔ انھوں نے کئی کتابوں کو مرتب کیا ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے:

''اب تک جن کتابوں کی تصنیف، تالیف، ترتیب، ترجمہ یا تحشیہ میرے ہاتھوں انجام پا چکا ہے، ان کے نام یہ ہیں: ''امتحان وفا، فرہنگ وامثال، ہماری شاعری، فیض میر، مجالس رنگیں، دبستان اردو، روح انیس، نظام اردو، جواہر سخن جلد دوم، شاہ کار انیس'' اس کے علاوہ بہت سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔'' [۱۷]

مسعود صاحب سوچ سمجھ کر بات کرنے کے عادی ہیں۔ تحقیق ان کے مزاج میں رچ بس گئی ہے۔ احتیاط کو وہ شرط ایمان سمجھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا عام رجحان یہ ہے کہ وہ اسلاف کے کارناموں کی اہمیت کو پہچانیں اور ان کا صحیح اندازہ لگائیں۔

جدید محققین میں ایک اور اہم نام رشید حسن خاں کا ہے۔ انھوں نے بہت عرق ریزی اور لگن کے ساتھ اردو کے کلاسیکی ادب کے متن کی صحت اور تحقیق کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مآخذ کی تلاش، واقعات کے چھان بین اور صحت متن کے معاملے میں وہ عہد جدید کے تمام محققین سے زیادہ محتاط اور ذمہ دار رویہ اپناتے ہیں۔ مکمل تحقیق کے بغیر وہ ایک لفظ بھی نہیں لکھتے۔ تحقیق کے معاملے میں ان کا رویہ قاضی عبدالودود جیسا ہے۔ رشید حسن خاں کی تحقیق کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ تحقیق سے تنقیدی بصیرت کا کام لیتے ہیں او راس سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں ''انتخاب سودا، انتخاب ناسخ، مراثی میر انیس ومرزا دبیر، انتخاب نظیر اکبرآبادی، گلزار نسیم، مقدمہ شعر وشاعری حالی، موازنہ انیس ودبیر وشبلی، باغ وبہار میر امن اور حیات سعدی'' بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ''اردو املا'' ہے جس کے ذریعہ انھوں نے اردو زبان کو ایک معیاری املا دینے کی کوشش کی ہے۔

اردو تحقیق کے چند اہم ستونوں میں سے ایک امتیاز علی خاں عرشی ہیں۔ انھوں نے ساری زندگی تحقیق وتصنیف اور تالیف میں بسر کی۔ اس میدان میں ان کے کارنامے نہایت اہم ہیں۔ عرشی صاحب کے کاموں نے تدوین کے اصولوں اور طریقوں کو روشناس کرایا۔ ان کی مرتبہ کتابوں میں ''دستور الفصاحت، تاریخ محمدی، مکاتیب غالب اور دیوان غالب'' معیاری اور مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں ماہر غالبیات کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ غالب ان کا خاص موضوع ہے۔ انھوں نے دیوان غالب کو زمانی اعتبار سے مرتب کیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کون سا کلام کس زمانے کا ہے۔ اس سے غالب کے ذہنی

ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ تدوین کا اچھا نمونہ ہے۔ یہ دیوان غالب نسخۂ عرشی کے نام سے مشہور ہے۔ احمد علی خاں یکتا کا تذکرہ ''دستور الفصاحت'' بھی انھوں نے بہت محنت سے ترتیب دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ کے مقدمے میں کن مباحث کو شامل ہونا چاہیے۔

تاریخ محمدی اور مکاتیب غالب کے حواشی تدوین میں متعلقات متن کی ترتیب کے مثالی نمونے ہیں۔ ان کتابوں سے اردو میں تدوین کی روایت نے فروغ پایا۔ ان سے یہ معلوم ہوا کہ متعلقات متن کو کس طرح مرتب کرنا چاہیے۔ ان سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اچھے کام کے لیے کس طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کی جائے۔ مصادر و مآخذ کا کس طرح احاطہ کیا جائے اور ان سے کس حد تک کام لیا جائے اور تدوین کے کام کو گراں باری سے بچانے کے لیے غیر ضروری اجزا سے کس طرح پرہیز کیا جائے۔

عرشی صاحب کی مکاتیب غالب پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی اور دستور الفصاحت ۱۹۴۳ء میں۔ دیوان غالب ۱۹۵۸ء میں اور تاریخ محمدی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ مذکورہ بالا کتابوں میں دو کتابیں ۱۹۵۰ء سے قبل شائع ہوئیں لیکن تدوین پر ان کے اثرات صحیح معنوں میں ۱۹۵۰ء کے بعد مرتب ہوئے۔ اس لحاظ سے عرشی صاحب کے ان کاموں کو اگر ۱۹۵۰ء کے بعد کے سرمایے میں شمار کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ تدوین کے سلسلے میں ان کے اثرات اسی زمانے میں واضح طور پر نمایاں ہوئے۔

اردو تحقیق میں مالک رام کا پایہ بھی بلند ہے۔ غالب ان کی توجہ کا مرکز رہے اس لیے ماہر غالبیات میں ان کا شمار ہے۔ ان کا پہلا مضمون ذوق اور غالب کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد مالک رام کی مرتب کی ہوئی کتابیں شائع ہوئیں۔ انھوں نے دیوان غالب، کربل کتھا اور غبار خاطر کو بہت سلیقے کے ساتھ ترتیب دیا۔ ان کے کاموں میں سب سے بہتر کربل کتھا کی تدوین ہے جسے انھوں نے ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے اشتراک سے انجام دیا تھا۔

تحقیق کی دنیا میں خلیق انجم کا نام بھی معتبر ہے۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ''متنی تنقید'' اہم ہے۔ سودا پر ان کا تحقیقی کام قابل قدر ہے۔ خطوط غالب کی ترتیب میں بھی انھوں نے بہت عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ خطوط غالب کا مجموعہ چار جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۸۴ء میں اور چوتھی جلد

۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ غالب کے خطوط کا ایسا مکمل مجموعہ اس سے قبل مرتب نہیں ہوا۔ اس مجموعے کی ترتیب میں نہایت دلجمعی اور دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ حواشی میں حتی الوسع ضروری معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔ اس کے مقدمے میں مآخذ ومصادر سے متعلق مفصل بحث کی گئی ہے۔

تحقیق وتدوین کے سلسلے میں یہی آخری نام نہیں ہیں۔ اس میدان میں اور بھی نام ہیں جنھوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں صرف چند ناموں کا ہی اجمالاً ذکر کیا گیا ہے ورنہ یہ فہرست طویل ہوسکتی ہے۔ اب ہم ممتاز حسین کی تحقیقی خدمات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

(iii) ممتاز حسین بحیثیت محقق:

ممتاز حسین کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کے ساتھ تحقیق سے بھی رشتہ استوار رکھا ہے۔ انھوں نے کئی عہد آفریں تحقیقی وتنقیدی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی اکثر تنقیدی وتحقیقی کاوشوں کو اعتبار واستناد کا درجہ حاصل رہا ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی سفر کا آغاز ''باغ وبہار'' کی تدوین سے کیا۔ ''غالب: ایک مطالعہ''، ''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری'' اور ''حالی کے شعری نظریات'' کا شمار ان کی اہم تحقیقی تصانیف میں ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا چاروں کتابوں میں انھوں نے جس تحقیقی دقت نظر سے کام لیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان تصانیف کے تنقیدی وتحقیقی مباحث سے حاصل شدہ نتائج کو آج بھی حرف آخر کا درجہ حاصل ہے۔

''باغ وبہار'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ماخذ قصہ چہار درویش ہے۔ اردو نثر میں قصہ چہار درویش کے تین ترجمے پائے جاتے ہیں۔ سب سے قدیم ترجمہ میر حسین عطا خاں تحسین کا ہے، جسے انھوں نے رنگینیٔ عبارت کی وجہ سے ''نوطرز مرصع'' کا نام دیا۔ محمد حسین آزاد کے مطابق یہ ترجمہ ۱۷۹۸ء میں کیا گیا۔ گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو نثر کی داستانیں'' میں اس کا سن تالیف ۱۷۸۵ء سے ۱۷۸۱ء کے درمیان بتایا ہے۔ دوسرا ترجمہ میر امن کا ہے جو ''باغ وبہار'' کے نام سے مشہور رہا۔ باغ وبہار سے اس کا سن تالیف ۱۸۰۲ء نکلتا ہے۔ تیسرا ترجمہ میر محمد عوض زریں کا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زریں نے پہلے فارسی قصے کا خلاصہ فارسی زبان میں تیار کیا۔ پھر اپنے مربی راجہ رام دین کی فرمائش

پر اس خلاصے کا ترجمہ اردو زبان میں کیا اور اس کا نام ''نوطرز مرصع'' رکھا اور اس کی تاریخ ''باغ و بہار'' نکالی۔ اسے حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں تحسین اور میر امن دونوں کی کتابوں کا نام سمٹ گیا۔

''باغ و بہار'' کے اصل ماخذ کی تلاش میں ممتاز حسین نے جو دلیلیں قائم کی ہیں وہ بڑی عالمانہ اور محققانہ دلیلیں ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''باغ و بہار'' امیر خسرو کی تصنیف ''قصہ چہار درویش'' کا ترجمہ ہے اور ترجمے کا یہ کام جان گلکرسٹ کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ قصہ چہار درویش کا اصل مصنف کون ہے یہ مسئلہ کل بھی تحقیق طلب تھا اور آج بھی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی تحقیق طلب تھا کہ میر امن کے ترجمے کی نوعیت کیا تھی؟ یہ ترجمہ لفظی تھا یا آزاد۔ ممتاز حسین نے اپنی تحقیق میں ان نکات کو مدنظر رکھا ہے۔ خود میر امن دہلوی نے باغ و بہار کے مقدمے میں دو اہم باتوں کا اعتراف کیا ہے۔ اول یہ کہ باغ و بہار طبع زاد نہیں ہے۔ یہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ امیر خسرو نے یہ کتاب اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی علالت کے دوران ان کی دل بستگی کے لیے لکھی تھی۔

میر امن کی کتاب ''باغ و بہار'' ۱۸۰۴ء میں پہلی بار کلکتہ سے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس ایڈیشن کے سرورق پر جلی حرفوں میں جو عبارت درج ہے وہ اس طرح ہے:

''باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امن دہلوی والے کا۔ ماخذ اس کا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا ہے میر حسین عطا خان کا، فارسی قصہ چہار درویش سے۔''

ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اپنے مقدمہ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس کا ماخذ نوطرز مرصع ہے۔ چونکہ بیشتر ہندوستانی مطبعوں نے سرورق پر درج عبارت کو لکھنا چھوڑ دیا اس لیے اس کے بارے میں غلط فہمی رائج ہوئی حالاں کہ انگلستان کے ایڈیشنوں میں سرورق کی مذکورہ عبارت نقل کی جاتی رہی۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر مولوی عبدالحق نے میر امن پر الزام عائد کیا کہ وہ نوطرز مرصع کا ذکر صاف اڑا گئے۔ اور اپنی کتاب کا ماخذ قصہ چہار درویش کو ٹھہرایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کے سامنے باغ و بہار کا ایسا کوئی ایڈیشن نہیں تھا جس میں مذکورہ عبارت درج تھی۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنے مضمون قصہ چہار درویش میں مذکورہ عبارت نقل کر کے میر امن کو مولوی عبدالحق کے الزام سے بری کیا۔ انھوں نے اس روایت کو بھی غلط ٹھہرایا کہ امیر خسرو نے یہ قصہ اپنے پیر و مرشد کی دل بستگی کے لیے لکھا

تھا۔ انھوں نے یہ دلیل دی ہے کہ محمد شاہ کے عہد کا ایک شخص حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں قصہ چہار درویش کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس نے اس کتاب کو ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔''

ممتاز حسین بتاتے ہیں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کیوں کہ آکسفرڈ کی بورڈن لائبریری میں چہار درویش کا ایک نسخہ اس سے پہلے کا موجود ہے۔ اس نسخے کی خبر مشہور محقق گیان چند جین کو بھی تھی کیوں کہ انھوں نے اپنی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اس نسخے کے سرورق پر قصہ چہار درویش لکھا ہوا ہے۔ کاتب کی عبارت اختتام قصہ میں اس طرح درج ہے:

> ''تمام شد قصہ چہار درویش بہ وقت دو کری روز یک شنبہ بتاریخ بست و ہفتم
> شہر شعبان سن ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸ء)۔ محمد شاہی در مکتب (دوسر سدھ؟) بہ محل
> نواب مستطاب امارت و ریاست مرتبت شجاع الدین محمد خاں ناظم صوبہ
> اوڑیسہ بہ کاتب الحرف جمال الدین تحریر یافت۔'' (نقد حرف، ص:۲۶۴)

ممتاز حسین نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کر دیا کہ محمود شیرانی کے پیش نظر جو نسخہ تھا اس کو تقدم حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ یہ کیسے مان لیا جائے کہ اس کتاب کا ہندی عبارت سے فارسی میں سطر بہ سطر ترجمہ ہوا اور اگر یہ سطر بہ سطر ترجمہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قصہ ہندی میں موجود تھا۔ اس کے بعد ممتاز حسین یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ شیرانی نے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ کس ہندی سے ترجمہ کیا گیا۔ برج، راجستھانی، اودھی یا کھڑی سے۔ دوسرے یہ کہ اس قصے کا کوئی نام نہیں بتایا گیا۔ اس کے بعد یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ یہ قصہ اپنے میں ہندی الاصل ہے یا کہ عربی اور فارسی قصوں سے آیا ہے۔ اس سلسلے میں گیان چند جین کی تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ممتاز حسین بتاتے ہیں کہ اس میں صرف گل بکاؤلی والا قصہ ہندی الاصل ہے ورنہ بقیہ دوسرے تمام حصے عجمی الاصل ہیں۔

ممتاز حسین کو اس بات سے انکار نہیں ہے کہ محمد علی نے اس قصے کا خلاصہ فارسی زبان میں کیا۔ وہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ محمد علی چہار درویش کا پہلا مصنف نہیں ہے کیوں کہ اول تو ایک مخطوطہ نسخہ اس سے قبل کا موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے اس قصے کو ہندی زبان سے فارسی میں سطر بہ سطر ترجمہ کیا۔ میر امن کا قیاس ہے کہ یہ قصہ بہت پہلے سے رائج تھا۔ میر امن نے اس کو خسرو سے اس لیے منسوب کیا ہوگا

کہ یہ مقبول عام روایت رہی ہوگی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میر امن سے پہلے بھی کسی نے اس قصے کو امیر خسرو سے منسوب کیا یا نہیں؟ ممتاز حسین اپنی تحقیق سے یہ بتاتے ہیں کہ اس کا ذکر باغ و بہار کے دیباچے سے قبل کسی اور کے قصہ چہار درویش میں نہیں ملتا۔ تحسین اور زریں کسی نے اس روایت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ انھوں نے حافظ شیرازی کے اس بیان کو کہ میر امن نے یہ روایت فارسی کے مطبوعہ نسخے مولفہ میر احمد شاہ خلف محمد شاہ کے دیباچے سے نقل کی ہے، غلط ٹھہرایا ہے، کیوں کہ اس نے فارسی کا نسخہ باغ بہار کی اشاعت کے بعد تالیف کیا ہے اور اپنے دیباچے میں میر امن کے اردو ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ حافظ شیرازی کے سامنے احمد شاہ کا مولفہ وہ مطبوعہ نسخہ نہ رہا ہوگا جس میں اس کا دیباچہ بھی شامل تھا۔ یہ میر احمد شاہ بھی حکیم معصوم علی خاں کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں صرف ولیم اوسلے نے اپنی فہرست میں قصہ چہار درویش کا مصنف معصوم علی خاں کو بتلایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرانی نے اوسلے کی فہرست سے مدد لیتے ہوئے معصوم علی خاں کے اس بیان کو درست مان لیا کہ ''میں نے ہندی زبان سے سطر بہ سطر اس کا ترجمہ عجمی زبان میں کیا، اور انھوں نے اس بیان کو جانچنے کی کوشش نہیں کی۔ ممتاز حسین نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ بھی کہا ہے کہ اب تک فارسی کے جتنے نسخے ملے ہیں ان کا اسلوب امیر خسرو کے اسلوب سے نہیں ملتا اور نہ تاریخ کی کسی کتاب میں امیر خسرو کا کوئی قصہ اس نام سے ملتا ہے۔ ممتاز حسین کا خیال ہے کہ یہ قصہ محمد شاہی عہد سے پہلے مشہور تھا۔

مصحفی نے چہار درویش کا مصنف حاجی ربیع انجب کو بتایا ہے۔ انھوں نے اپنے تذکرے ''عقد ثریا'' میں بتایا ہے کہ بدیع العصر حاجی ربیع انجب نے یک بارشتر یعنی ایک اونٹ کے اٹھانے لائق کتابیں لکھی تھیں۔ ان میں قصہ چہار درویش بھی شامل تھا۔ یہ سب چوری چلی گئیں۔ ممتاز حسین نے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سب قصے اور کہانیاں لائق اعتنا نہیں ہیں۔

''غالب: ایک مطالعہ'' ممتاز حسین کا دوسرا بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے غالب کے فن اور شخصیت کے کئی اہم اور چشم کشا پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے مطالعہ غالب کو ایک نئی جہت عطا کی ہے اور غالب کی مختلف عطایا کا ذکر کیا ہے جس نے اردو ادب کو جلا بخشی ہے۔ انھوں نے غالب کے خیالات کو تجدید حیات کا سرچشمہ مانا ہے۔ غالب نے اپنے خامہ کو خوں چکاں کر کے اور انگلیوں کو فگار

کر کےہمیں حیات نوبخشی ہے۔ اس کی فکر سے زندگی کے نئے سوتے نکلتے ہیں۔ اردو شعر و ادب میں سحر کاری کے فن سے عبارت ہر خیال اور نکتہ ادا کا رشتہ غالب کے فکروفن سے ملتا ہے۔ یہ غالب ہی کا کمال ہے کہ زندگی گناہ آدم ہے، کے تصور سے ہمیں آزاد کیا۔ اس نے احساس گناہ کے بارگراں کو ہمارے سینے سے اٹھا کر چشم تماشہ کو ذوق نظارہ سے آشنا کیا۔ اس نے اخلاق انسانیت کے لیے نیا قانون وضع کیا۔ اس نے تصور اخلاف کو جنم دیا۔ غالب کے اشعار نے ہمارے ادب کو نئی جمالیات عطا کی۔ اس نے ہمیں تقلید کے بجائے تنقید کا شعور بخشا۔ اس نے اپنے عہد میں بدلتے ہوئے حالات کو بغور دیکھا تھا۔ اس نے مغربی اثرات کو قبول کرنے میں جھجک محسوس نہیں کی۔ اسی کے دم سے تاریخی شعور بنا اور بیدار ہونے لگا۔ اس سے شعر و ادب ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم بھی متاثر ہونے لگے۔ اٹھارہویں صدی کے صوفیانہ فکر میں بھی اس سے تبدیلیاں آئیں اور اس پر معقولات کے پیوند لگنے شروع ہوئے۔ جذباتی تصوف کے بجائے معقولاتی تصوف کا رواج جگہ پانے لگا۔

غالب نے غم زمانہ کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے فلسفے کو بھی غزل میں شریک کیا۔ انھوں نے پرانی روش سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی اور نئے محاورے میں گفتگو شروع کی۔ انھوں نے فارسی محاورات کو چھوڑ کر اردو کے سہل الفاظ استعمال کرنا شروع کیے۔ مشکل گوئی کو انھوں نے رفتہ رفتہ کم کر دیا یہاں تک کہ وہ سادہ وسہل زبان میں شعر کہنے لگے۔

''غالب: ایک مطالعہ'' میں ممتاز حسین غالب کے احساس غم کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔ غالب کو اپنا یہ غم عزیز تھا۔ اپنے اس غم کو انھوں نے خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ ممتاز حسین یہ مانتے ہیں کہ اسی غم نے غالب کی تخلیقی قوت کو ابھارا بلکہ اس کی انسانیت اور دل سوزی کو بھی جلا بخشی۔ اسی وجہ سے وہ یہ سوچتے رہے کہ ''جس شہر میں رہوں، اس میں کوئی ننگا بھوکا نہ ہو۔ نہ یہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بنوں اور نہ یہ بخشائش کہ دونوں ہاتھوں سے زر ہاتھی پر سے برساتا چلوں۔'' ممتاز حسین نے یہ محسوس کیا ہے کہ غالب کی اس انسان دوستی میں امرائیت کی شان ضرور ہے لیکن وہ انسان اور انسان کے درمیان ہر قسم کی تقسیم کے مخالف تھے۔ وہ ایسی تقسیم کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔

غالب: ایک مطالعہ اس لحاظ سے بھی ممتاز حسین کی ایک اہم تصنیف ہے کہ اس میں غالب کی تعقل

پسندی اور انسان دوستی کو اہمیت دی گئی ہے۔ یہ مطالعہ تاریخ کا ایک اہم رخ ہے۔ یہ مطالعہ کسی بھی دور کے انسان، ان کی تہذیب، ان کی سوچ، حقائق، مستقبل کی طرف بڑھتے قدم، انسانی ارتقا اور تنزل پر محیط ہے۔اس کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر رکھتے ہوئے سید محمد عقیل کی رائے ہے:

> ''ممتاز حسین کی یہ کتاب غالب اسداللہ خاں غالب کی شاعری کا یقیناً ایک مسکت مطالعہ ہے۔اگر چہ کہیں کہیں اس میں مصنف کی جذباتیت بھی کبھی کبھی غالب ہو جاتی ہے جو قاری کو کہیں کہیں تذبذب میں بھی ڈال دیتی ہے مگر مصنف نے غالب شاعر کے اندرون سے جو نتیجے نکالے ہیں وہ یقیناً انسانی دوستی کے بہترین لمحات کی فکر ہیں۔'' ۱۸

شارب ردولوی ممتاز حسین کی تصانیف بالخصوص ''غالب: ایک مطالعہ'' اور امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''ان کی (ممتاز حسین کی) جدید تصنیفات میں غالب ایک مطالعہ اور امیر خسرو دہلوی حیات او رشاعری بہت اہمیت رکھتی ہیں، جس کے تذکرے کے بغیر ان کے تنقیدی نظریے پر کوئی گفتگو مکمل نہیں کہی جاسکتی۔'' ۱۹

مطالعہ غالب کے سلسلے میں ''انتخاب غالب'' بھی ممتاز حسین کی اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب دلچسپ پیرایے میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب کا مطالعہ ہمیں تصورات کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جہاں غالب بذات خود ممتاز حسین سے ہم کلام نظر آتے ہیں اور ممتاز حسین کے اصرار پر اپنے احوال بیان کرتے ہیں۔ ممتاز حسین نے غالب کے حالات زندگی اور ان کے افکار اس طرح پیش کیے ہیں جیسے پردۂ سیمیں پر ایک کے بعد ایک منظر ظاہر ہوتا ہے۔

اس کتاب میں ممتاز حسین نے غالب کے خاندانی حالات اور ذاتی زندگی کے احوال کے علاوہ ان کی تعلیم اور شعر وشاعری میں کسی کو باقاعدہ استاد ماننے کے سلسلہ میں بھی وضاحت کی ہے۔ غالب نے ابتدائی تعلیم آگرہ میں حاصل کی جو علوم مشرقیہ کا اس وقت بڑا مرکز تھا۔انھوں نے ''گلستان بیجزاں'' میں

درج اس معلومات کی نفی کی ہے کہ غالب نے نظیر اکبرآبادی سے تعلیم حاصل کی تھی انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم یہیں کے مشہور عالم مولوی محمد معظم سے حاصل کی تھی۔ تعلیم کے سلسلے میں ایک مولوی عبدالصمد کا بھی نام آتا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ان ساری معلومات کو ممتاز حسین نے غالب سے اس طرح ادا کروایا ہے:

''اس وقت کا اکبرآباد جہاں کہ میں نے عہد طفلی او رعنفوان شباب کا زمانہ گزارا اور ابتدائی تعلیم حاصل کی، اردو زبان اور علوم مشرقیہ کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کی ایک جھلک تمہیں میاں نظیر اکبرآبادی کے کلام میں مل سکتی ہے۔ یہ بات جو باطن نے ''گلستان بےخزاں'' میں لکھی ہے کہ میں نے نظیر اکبرآبادی سے تعلیم حاصل کی سو وہ صحیح نہیں ہے اور نہ یہ صحیح ہے کہ مجھے ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ میں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اکبرآباد کے مشہور عالم مولوی محمد معظم سے حاصل کی جو کہ بیدل، اسیر اور شوکت کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ تعلیم کے سلسلے میں ایک نام ملا عبدالصمد کا بھی آتا ہے جو کہ ۱۸۱۱ء میں بغرض سیر وسیاحت ایران سے ہندوستان آیا اور اکبرآباد میں دو سال تک نانا کی حویلی میں مقیم رہا۔ چنانچہ جس وقت میں ۱۸۱۳ء دلی آیا ہوں تو وہ میرے ساتھ تھا، میں نے وہیں سے اسے رخصت کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ شاعری میں نہ تو میں مولوی معظم کا شاگرد ہوں اور نہ ملا عبدالصمد کا اور نہ کسی اور کا، چنانچہ اسی چیز کو سامنے رکھ کر، میں نے یہ لکھا کہ ملا عبدالصمد ایک فرضی نام ہے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ قدیم فارسی میں نے اسی ملا عبدالصمد سے سیکھی جو کہ مذہب اسلام قبول کرنے سے پہلے زرتشتی مذہب کا موجد رہ چکا تھا۔''[۲۰]

غالب نے ملا عبدالصمد سے نہ صرف قدیم فارسی سیکھی بلکہ زرتشتیوں کے مذہب اور ایران کی تاریخ کی جانکاری حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ''دستنبو'' لکھتے ہوئے قدیم فارسی کی زبان استعمال کی۔ مہر نیمروز لکھنے میں عربی الفاظ سے پرہیز کیا۔ غالب کے دماغ پر زرتشتی تعلیمات کا گہرا اثر مرتب

ہوا۔ غالب ایران کے قدیم مذہبی فلسفہ ہمہ اوست اور یونانی فلسفہ سے بھی متاثر تھے جو ان کے اس قول ''مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ باوجود اس بات کے کہ میں کلمہ لا الہ کا پڑھنے والا، رسالت، معراج اور امامت کا دل و جان سے ماننے والا تھا، میں توحید مطلق کا ہی نہیں بلکہ فلسفہ وحدت الوجود (Monoism) یا یونانی زبان میں (Hylozoixm) کا قایل تھا'' سے ظاہر ہے۔

ممتاز حسین نے غالب کی شاعری میں عجمیت، زرتشتیت، اشراقیت اور افلاطونیت کے جن عناصر کی نشاندہی کی ہے وہ خصوصیت سے قابل توجہ ہیں۔ اپنے اشعار میں انھوں نے خود کو متعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ ''میرا دین عربی ہے لیکن طریق عجمی ہے اور میری فکر پر گہرا اثر اشراق افلاطون کا ہے۔ ممتاز حسین نے بطور خاص افلاطونی اشراقیت کے عناصر کی چھان پھٹک پر توجہ صرف کی ہے، مثلاً غالب نے مثنوی ''ابر گہر بار'' میں جس قدر شیخ یونانیاں کی تقلید اور قانون پسندی پر زور دیا ہے اس سے غالب کی شخصیت کا اہم رخ سامنے آتا ہے۔

غالب کے متعدد اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف ان کے مزاج میں رچ بس گیا تھا۔ وہ باقاعدہ صوفی تھے لیکن انتخاب غالب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ تصوف سے ان کی دلچسپی عملی کے بجائے نظریاتی تھی جیسا کہ جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد/ پر طبیعت ادھر نہیں آتی سے بھی ظاہر ہے۔

غالب کو فلسفے سے خاصا شغف تھا۔ وہ دوسروں کو بھی فلسفہ پڑھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ وہ تاعمر معقولات کا مطالعہ کرتے رہے۔ ممتاز حسین نے شیخ محمد اکرام کو مفکر کے بجائے مصلحت اندیش قرار دیا ہے اور غالب کی شاعری کو فلسفے سے خارج قرار دینے پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں شیخ اکرام کا ایسا کرنا ناانصافی پر مبنی ہے۔ اگر انھیں غالب کی آزادخیالی پسند نہیں اور یہ آزادخیالی دہریت معلوم ہوتی ہے تو اس سے بہتر ہے کہ غالب پر قلم ہی نہ اٹھایا جاتا۔ کسی کے خیال پر پردہ ڈالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

حالی نے غالب کے سوانح میں ان کی حیات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے غالب کو حیوان ظریف بھی کہا ہے۔ حالی نے اپنی سلیم الطبعی اور بھل منساہٹ میں غالب کی آزادخیالی کو ظرافت پر محمول کیا ہے۔ ممتاز حسین کا خیال ہے کہ غالب کی آزادخیالی، ان کا تشکک زمانے کی عام روش سے ہٹ کر نہ تھا۔

ممتاز حسین نے غالب اور سرسید کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ غالب کو طرز کہن پر اڑنا

اور آئین نو سے ڈرنا بالکل پسند نہیں تھا۔ انھیں مغلیہ سلطنت کے نظام کے مقابلے میں انگریزوں کا نظام بہتر لگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرسید نے ابوالفضل کی آئین اکبری کی تصحیح کے بعد اس کی اشاعت کا ارادہ کیا تو اس کے لیے غالب سے تقریظ لکھنے کی فرمائش کی۔ غالب انگلستان کے آئین کے سامنے آئین اکبری کو بہتر تصور نہیں کرتے تھے چنانچہ انھوں نے جو تقریظ لکھی اس میں آئین جمہوریت کو آئین شہنشاہیت سے بہتر قرار دیا۔ اس مثنوی میں انھوں نے انگریزوں کی ایجادات کی کھل کر تعریف کی اور سرسید کو ''مردہ پروردن مبارک کار نیست'' کہہ کر متنبہ کیا۔

غالب نے اپنے خاندانی احوال میں بتایا ہے کہ ان کے دادا سمرقند سے ترک وطن کر کے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں خود کو ''از خاک پائے تورانیم'' بتایا ہے۔ انھوں نے خود کو ترک زادہ کہا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ترکوں میں ان کا خاندان ایک قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنے آپ کو تورانی نسل اور ایرانی نسل بتانے کے باوجود وہ اپنا مولد ہندوستان ہی کو بتاتے تھے اور ہندوستان کو ہی اپنا وطن جانتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ قرض خواہی کے معاملے میں جب انھیں جیل جانا پڑا تو ذلت و رسوائی کی وجہ سے ترک وطن کا بھی ارادہ کیا تھا مگر جلد ہی اس خیال سے باز بھی آ گئے۔ ان کو دلی سے بے حد لگاؤ تھا، ویسے تو انھوں نے کلکتے اور بنارس کی بھی تعریف کی ہے۔ غالب نے دلی میں اپنی زندگی کے بہت سارے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ کے وظیفہ خوار ہوئے۔ اس زمانے میں قلعہ معلیٰ سے تعلق برائے نام ہی تھا۔ بعد میں ولی عہد، مرزا فخرو کے استاد بنے۔ پھر بادشاہ کے بھی استاد ہوئے، لیکن ملکہ وکٹوریہ کے درباری شاعر بننے کے متمنی رہے۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامی حالات بھی دیکھے۔ پھر اپنے اعزہ و اقرباء کی ہلاکت کی خبریں سنیں یا مناظر دیکھے۔ بغاوت کے الزام میں دلی والوں پر انگریزوں کے ستم دیکھے۔ شاہ جہاں آباد کو تاخت و تاراج ہوتے دیکھا۔ انگریزوں کے ان ہی مظالم سے متاثر ہو کر انھوں نے وہ مشہور قطعہ لکھا جس میں ہر سلحشور انگلستان کو فعال یا یزید پایا، چوک کو مقتل پایا، گھر کو قید خانے کا نمونہ بتایا، دلی کے ذرہ ذرہ کو مسلمانوں کے خون کا پیاسا پایا۔

جہاں تک غالب کے افکار کا تعلق ہے، وہ میانہ روی اور سلامت پسندی کے قائل تھے۔ کسی بھی معاملے میں وہ مخصوص حد سے قدم آگے نہیں بڑھاتے تھے۔ اپنے خیالات میں وہ ہم عصروں سے زیادہ

ترقی پسند تھے۔ ایسے عہد میں جب لوگ تجدید مذہب اور مذہبی روایات کے احیاء میں مشغول تھے وہ ان باتوں سے بے نیاز تھے۔ جب لوگ قدامت پسندی کو حرزِ جاں بنائے ہوئے تھے۔ وہ اہل وطن کو مغرب کی ایجادات کی طرف متوجہ کرر ہے تھے۔ ممتاز حسین کی یہ کتاب غالب شناسی کی روایت میں ایک اضافہ تصور کی جاتی ہے۔

ممتاز حسین کی کتاب ''حالی کے شعری نظریات: ایک مطالعہ'' تنقیدی اور تحقیقی دنیا میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس نے اردو ناقدین اور محققین کے لیے غور وفکر کے کئی گوشے فراہم کیے ہیں۔ یہ کتاب حالی کے مقدمہ شعر وشاعری پر ممتاز حسین کے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ مقدمہ شعر وشاعری حالی کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس نے اردو تنقید کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ یہ اردو تنقید کی تعمیر میں خشت اول بھی ثابت ہوئی۔ حالی نے یہ مقدمہ دس سال کی محنت سے تیار کیا تھا۔

یہ کتاب ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ حالی کے نزدیک اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی جس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے کتاب کے ٹائٹل پیج پر دیوان حالی مع مقدمہ نہیں بلکہ مقدمہ مع دیوان حالی لکھا۔ اس میں چند صفحات پر مشتمل ایک مختصر دیباچہ بھی ملتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ دونوں کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ حالی اس کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ ''مقدمے کا تعلق شاعری سے ہے اور دیباچے کا تعلق میری جدید شاعری سے ہے۔''

حالاں کہ حالی کے بعض مآخذ کے اصل مغربی متون کو پہلی بار ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے نسخہ مقدمہ شعروشاعری کے ذریعے متعارف کرایا تھا لیکن اس سلسلے میں اہم کوشش ممتاز حسین کی ہے۔ اس میں انھوں نے مقدمے کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر حالی کے ماخذ پر ہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حالی نے اپنا مقدمہ شعروشاعری ۱۸۹۳ء میں پیش کیا۔ اب ۹۴ برس کے بعد اس مقدمے کا ایک نیا مقدمہ پیش کیا جارہا ہے...... اس درمیانی عرصے میں بہت کچھ لکھا گیا اور میں نے حتی الوسع اس سے بھی استفادہ کیا ہے مگر اپنی توجہ بیشتر حالی کے مآخذ ہی پر رکھی ہے۔ ان کا پتہ چلانا ضروری سمجھا۔ اسی سے ان کی تنقید کے مسائل سلجھتے گئے۔ ورنہ یہ حقیقت

ہے کہ حالی کا مقدمہ خاصہ الجھا ہوا ہے۔''۲۱

یہ صحیح ہے کہ حالی کے جدید شاعری پر بہت زیادہ احسانات ہیں لیکن یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ اس سلسلے میں وہ سر سید احمد خاں کے اثرات سے مغلوب اور مغربی افکار سے مرعوب ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مشرقی حوالوں کے بجائے مغربی حوالے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے افلاطون، شیکسپیئر، ملٹن، والٹر اسکاٹ وغیرہ سے استفادہ کیا ہے اور ان کے حوالے دیے ہیں۔ بعض مباحث کے دوران انھوں نے لکھا ہے ''ایک یوروپین محقق ان لفظوں کی شرح اس طرح کرتا ہے'' اور پھر واوین میں اس کی رائے درج کی ہے۔ ممتاز حسین نے اپنی تحقیق میں اسے ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ یورپی محقق کولرج ہے۔ انھوں نے کولرج کی اصل عبارت بھی اپنی کتاب میں درج کر دی ہے۔ ممتاز حسین نے اپنی کتاب میں ان تمام مآخذ کو دریافت کیا جو اس سے قبل دریافت نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے تمام مآخذ پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔

حالی نے اپنے مقدمے میں شعر کی خوبیوں سے متعلق باتوں مثلاً سادگی، اصلیت اور جوش کو ملٹن کے الفاظ بتایا ہے، جب کہ اس نے اس پر بحث کی ہی نہیں ہے۔ ملٹن نے سادگی کی بات شاعری کے بارے میں نہیں کی تھی۔ اس نے یہ بات موضوع تعلیم پر بحث کرتے ہوئے کہی تھی۔ اصلیت اور جوش سے متعلق بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ یہ سب باتیں ملٹن نے اس لیے لکھی تھیں کہ طلبا کو شاعری کے ایسے نمونے پڑھانے چاہئیں جو آسانی سے ان کی سمجھ میں آ جائیں اور انھیں متاثر کر سکیں نہ کہ شاعری بالعموم کے لیے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''شاعری کی تعریف کے سلسلے میں ملٹن نے یہ تین الفاظ نصاب تعلیم کو مد نظر رکھتے ہوئے ادا کیے تھے...... حالی نے اس پورے مسئلے کو نصاب تعلیم کے ضمن میں نہیں جانچا بلکہ ان تین الفاظ-سادگی، اصلیت اور جوش کو اچھی شاعری کی کسوٹی قرار دیتے ہوئے پوری اردو شاعری کو پرکھنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ایسی باتیں بھی لکھیں جو ان کے اپنے بیان کی تکذیب کرتی ہیں۔''۲۲

ممتاز حسین کی کتاب ''حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ'' نہایت دلچسپ اور معلومات

افزا کتاب ہے۔اس نے مطالعہ حالی کی ان تاریک پہلوؤں کو روشن کیا ہے، جو تنقید و تحقیق کی دنیا کے لیے بہت اہم ہیں۔ یہ حالی کے شعری نظریات پر کئی سوالات قائم کرتی ہے اور نئے سرے سے بحث و تمحیص کی دعوت دیتی ہے۔اس سلسلے میں سید محمد عقیل کہتے ہیں:

''ممتاز حسین کی یہ کتاب ''حالی کے شعری نظریات: ایک مطالعہ'' حالی کے مطالعے میں بہت سے نئے سوالات پیدا کرتی ہے۔ممتاز حسین نے جو سوالات حالی اور مقدمہ شعر و شاعری کے سلسلے میں اٹھائے ہیں ان کی روشنی میں حالی کا پھر سے محاسبہ ہونا ضروری ہے۔ یقیناً حالی کا مقدمہ شعر و شاعری، اردو تنقید کی تاریخ میں پہلی تنقیدی کتاب ہے مگر اس میں بنیادی سوالات، اب حالی کے نہیں رہ جاتے اور یہ بھی کہ حالی نے اردو شاعری کے مسائل کی تفہیم کے لیے جو مغربی پیمانہ حاصل کیا، وہ کہاں تک درست رہ جاتا ہے۔اس طرح ممتاز حسین کی یہ کتاب ''حالی کے شعری نظریات: ایک مطالعہ'' خاصی خیال انگیز بحث طلب اور اردو تنقید میں تحقیق اور حک و اصلاح کی دلچسپ دعوت دیتی ہے۔لیکن اس کو پرکھنے کے لیے کولرج، ورڈس ورتھ اور ملٹن کے شعری نظریات نیز نقد شعر کی اچھی اور ایماندارانہ تفتیش اور معلومات لازمی ہے۔ایک بات اور کہ حالی تو انگریزی جانتے نہیں تھے، یہ انگریزی ناقدین کے خیالات کے چربے اور کبھی کبھی بالکل ترجمے حالی کے لیے کون تیار کرتا تھا؟ نیز یہ بھی کہ آخر حالی اپنے مقدمے میں ان لوگوں کا تذکرہ کیوں نہیں کرتے جنھوں نے ان کے لیے مسالہ تیار کیا تھا۔ ہاں، مقدمہ شعر و شاعری پر اپنے کو مصنف نہ لکھ کر مولف لکھا ہے۔ یہاں سے کچھ اشارہ مل سکتا ہے۔ بہر حال یہ معمہ خاصہ دلچسپ ہے جس کا حل اب شاید ہی کوئی پیش کر سکے۔اس دور کے حالی کے مخالفین نے بھی اس بات کا کوئی اشارہ

نہیں کیا ہے۔''۲۳

''امیر خسرو: حیات اور شاعری'' بھی ایسی تصنیف ہے جس کا شمار ممتاز حسین کے گراں قدر تحقیقی کارناموں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے امیر خسرو کی حیات اور شاعری سے متعلق متعدد باطل روایات کی تکذیب عالمانہ اور محققانہ دلائل سے کی ہے۔ یہ کتاب ان کی برسوں کی مسلسل اور متواتر محنتوں کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی پذیرائی بڑے پیمانے پر ہوئی۔ اس کتاب کے ذکر کے بغیر ان کے تنقیدی نظریات اور تنقیدی رویے پر گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ اس میں ان کے تنقیدی نظریات کا پورا پورا اطلاق ہوا ہے۔ یہ کتاب ان کی تنقیدی بصیرت کے ساتھ ساتھ ان کے تحقیقی دقت نظر کا بھی خوبصورت مظہر ہے۔ یہ کتاب جہاں امیر خسرو کی حیات کے سربستہ رازوں سے پردہ ہٹاتی ہے، وہیں تنقید و تحقیق کے باہمی ارتباط پر بھی اصرار کرتی ہے۔ بہر حال اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ مذکورہ بالا کتاب ممتاز حسین کی ایک معتبر، مستند اور معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔

ممتاز حسین نے اپنی اس عالمانہ تصنیف میں جس محنت اور دیدہ وری کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ انھوں نے اس کتاب کے ذریعہ بڑے بڑے علماء و محققین کا بھرم کھول کر رکھ دیا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ممتاز حسین کی اس تنقیدی و تحقیقی تخریب نے ادبی سطح پر ایک خوبصورت تعمیر کی شکل اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے سابق ڈائرکٹر زیڈ. اے دیسائی کا خیال غلط نہیں ہے کہ:

> ''۱۹۷۵ء کے بعد یونسکو کی طرف سے امیر خسرو کے سلسلے میں جتنے یوم منائے گئے اور حکومت یا دیگر پرائیوٹ اداروں سے بھی یادگاری کتابیں شائع ہوئیں ان میں ممتاز حسین کی تصنیف مذکورہ کی حیثیت نہ صرف اس وقت بلکہ آنے والے دنوں میں بھی حرف آخر رہے گی۔''

بہر حال، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ''امیر خسرو: حیات اور شاعری'' ممتاز حسین کا سب سے اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کتاب سے قبل علامہ شبلی کی شعر العجم کو سب سے اہم ذریعہ اور سب سے معتبر اور مستند حوالہ سمجھا جاتا تھا۔ ممتاز حسین کی مذکورہ بالا تصنیف کے منظر عام پر آجانے کے بعد ''شعر العجم''

کی حرف آخر والی حیثیت باقی نہیں رہی۔ ممتاز حسین نے خسرو کے خاندان، عہد اور تخلیقی کارناموں کو صحیح تناظر میں پیش کر کے ان کی حیات و خدمات سے متعلق بنیادی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔

ممتاز حسین نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق بھی تھے۔ امیر خسرو پر لکھتے ہوئے انھوں نے تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ امیر خسرو کی حیات اور شاعری سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے نئی معلومات بہم پہنچائی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ امیر خسرو کے والد کا ترکی نام لاچین تھا جبکہ ان کا اسلامی نام شمس الدین تھا۔ وہ سیف الدین شمسی کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''امیر خسرو نے اپنے پہلے دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچے میں اپنے والد کا نام لاچین بتایا ہے اور اپنے تیسرے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں انھیں ''پدرم سیف شمسی'' اور پھر بعد میں سیفی کہہ کر یاد کیا ہے۔ لیکن انھوں نے کہیں بھی محمود کا لفظ اپنے والد کے نام کے سلسلے میں استعمال نہیں کیا ہے۔ نہ تنہا، نہ کسی اور لفظ کے ساتھ ملا کر۔ لیکن دور حاضر کے مصنفین اول تو لاچین کو نظر انداز کرتے ہیں گویا یہ کوئی نام نہیں بلکہ اسقاط نام ہے۔ ثانیاً سیف الدین شمسی لکھنے کے بجائے سیف الدین محمود اس دھڑلے سے لکھتے ہیں گویا یہ نام محقق ہے۔ مجھے اعتراض لاچین کو صرف نظر انداز کرنے اور سیف الدین کے ساتھ محمود کے اضافے پر ہے کیونکہ خود خسرو یا ان کے کسی معاصر مورخ یا تذکرہ نگار نے نہ تو انھیں تنہا محمود کے نام سے یاد کیا ہے اور نہ سیف الدین کے ساتھ محمود کا اضافہ کیا ہے۔''[۲۴]

محققین کے ذریعہ خود خسرو کے بیان سے غفلت برتنے کے سلسلے میں ممتاز حسین اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تحقیق کی دنیا میں ایسا کوئی سانحہ شاذ و نادر ہی گزرا ہوگا جب کسی محقق نے کسی شخص کے والد کے نام سے متعلق اس کے صحیح الدماغ بیٹے کے

بیان کو جھٹلایا ہو۔ ایسا ایک المناک واقعہ کچھ دنوں تک میر تقی میر کی
ولدیت سے متعلق روا رکھا گیا تھا۔ ایک فرضی نام عبداللہ ان کے والد کا
گھڑ لیا گیا تھا۔ لیکن یہ سانحہ اتنا سنگین نہ تھا کیوں کہ ''ذکر میر'' کے
دستیاب ہونے سے پہلے میر کے والد کا نام لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ وہاں
معاملہ صرف ایک فرضی نام گھڑنے کا تھا۔ یہاں معاملہ صحیح الدماغ خسرو
کے بیان کی تردید کا ہے نہ کہ عدم واقفیت یا کسی افسانہ طرازی کا۔''۲۵

خود خسرو نے اپنے والد کا نام جس وضاحت سے بیان کیا ہے اس کے بارے میں ممتاز حسین کہتے ہیں:

''خسرو لاچین بندۂ کم ترین، اپنے شاہانہ نام سے نادم ہانک پکار کر کہتا
ہے کہ اس بندہ کم ترین کے والد کا نام لاچین ہے۔''۲۶

اس کے باوجود علامہ شبلی اور ڈاکٹر وحید مرزا کا یہ اصرار ہے کہ یہ ان کے والد کا نام نہیں ہے۔
ممتاز حسین نے شبلی اور وحید مرزا کے اصرار کے جواز کو سامنے لاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی اور ڈاکٹر وحید مرزا دونوں کا یہ اصرار ہے کہ یہ ان کے والد کا
نام نہیں، بلکہ ان کے قبیلے یا ان کے قبیلے کے کسی مورث اعلیٰ کا نام ہوگا
اور اپنے اس اصرار کا یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ سمرقند کا ایک تذکرہ نگار
دولت شاہ سمرقندی جو کبھی خود ہندوستان آیا نہ گیا، خسرو کی وفات کے
پونے دو سو سال بعد اپنے ''تذکرۃ الشعراء'' (سن تالیف ۸۹۲ھ) میں
ان کے والد کا نام نہ تو لاچین لکھتا ہے اور نہ سیف شمسی بلکہ محمود بتاتا ہے
اور اس محمود کو ہزارۂ لاچین نام کے قبیلے کا سردار بھی بتاتا ہے۔''۲۷

ممتاز حسین نے اپنی تحقیق میں خسرو کی جائے پیدائش پٹیالی کے بجائے دہلی بتایا ہے۔ اس سلسلے میں
قبل کے محققین کی رائے کو مسترد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''امیر خسرو سے متعلق جہاں بہت سے افسانے گڑھے گئے ایک افسانہ
یہ بھی وضع کرلیا گیا کہ وہ پٹیالی میں پیدا ہوئے تھے......سب سے پہلے

اس افسانے کو جہاں تک میں دریافت کر سکا ہوں حامد فضل اللہ جمالی نے ''سیر العارفین'' میں تصنیف کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولد او در قصبہ مومن آباد است کہ او را قصبہ پٹیالی گویند بکنار گنگ واقع است۔'' ۲۸

وہ مزید کہتے ہیں:

''دوسرا واقعہ جو سیر الاولیا سے نقل کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ جب شیخ نظام الدین اولیا معز الدین کیقباد کے زمانے میں شہر دلی کی روز بروز گرتی ہوئی اخلاقی حالت سے عاجز آ کر یہ محسوس کرنے لگے کہ اب اس شہر میں ایمان کو محفوظ رکھنا ممکن نہیں تو انھوں نے غیاث پور میں سکونت اختیار کرنے سے پہلے ایک بار اس خیال کا اظہار کیا کہ کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ پٹیالی چلا جاؤں جہاں ان دنوں ترک (یعنی امیر خسرو) رہ رہا ہے۔ چنانچہ ان دونوں الگ الگ واقعات کو جوڑ کر لوگوں نے یہ بات وضع کر لی کہ خسرو کے والد پٹیالی میں سکونت پذیر تھے اور وہیں خسرو کی پیدائش ہوئی۔'' ۲۹

اس کے برعکس جن تذکرہ نگاروں نے خسرو کا مولد دہلی بتایا ہے، اس کو نظر انداز کرنے کے بارے میں کہا ہے:

''جن تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا کہ ان کے والد دہلی میں سکونت پذیر ہوئے یا یہ کہ خسرو دہلی میں پیدا ہوئے ان کو نہ صرف یکسر نظر انداز کیا گیا بلکہ ان کی تردید میں افسانہ پٹیالی کو نہایت آب و تاب کے ساتھ بیان کیا گیا۔'' ۳۰

خسرو کے وطن اصلی کے تعلق سے ڈاکٹر وحید مرزا کے اصرار کے متعلق ممتاز حسین لکھتے ہیں:

خسرو کے والد کے وطن اصل کے تعین سے متعلق تو ڈاکٹر وحید مرزا نے دولت شاہ سمرقندی کے بیان کی اس قدر پرزور وکالت کی ہے کہ اگر وہ غریب خود اپنی وکالت کرتا تو اتنے دلائل و براہین مہیا نہ کر پاتا جتنے کہ

ڈاکٹر صاحب نے مہیا کیے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر خسرو کے والد کے
وطن اصلی سے متعلق دولت شاہ کا بیان صحیح ہے تو پھر ان کے نقل وطن سے
متعلق اس کا بیان کیوں غلط ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے
'(پدر امیر خسرو) بدیار ہند افتادہ بہ دہلی مقام گرفتہ، ڈاکٹر وحید مرزا اس
دولت شاہ سمرقندی کا ساتھ اس مقام پر چھوڑ دیتے ہیں۔'' ۳۱؎

ممتاز حسین نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ خسرو کی مادری زبان دہلوی تھی جس میں انھوں نے دل آویز اشعار کہے ہیں۔ اس سلسلے میں ممتاز حسین کہتے ہیں:

''خسرو کا مولد اور منشا دہلی تھا اور ان کی والدہ ماجدہ عماد الملک راوت کی
بیٹی تھیں جو ایک نو مسلم راجپوت تھے۔ عماد الملک علم و فضل کے اعتبار سے
سر برآوردہ روزگار تھے۔ خسرو نے انھیں آصف دوراں بزرجمہور زمانہ
اور دستور عصر کے القاب سے سراہا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات
بغیر تذبذب کے کہی جا سکتی ہے کہ وہ ہندوی جو دہلی اور اس کے اطراف
میں بولی جاتی تھی اور جسے خسرو نے زبان دہلی یا دہلوی کے نام سے یاد
کیا ہے، وہ ان کی مادری زبان تھی۔ اس زبان کو انھوں نے شیر مادر کے
ساتھ حاصل کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے والد ولایت بالا کے
ترک تھے لیکن چوں کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزرا،
سلطان التمش کے عہد سے لے کر سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے
تک ہندوستان ہی کی سرزمین میں زندگی بسر کی اور ایک ایسے گھرانے
میں شادی کی جو تمام تر ہندی الاصل تھا، اس لیے یہ بات بغیر کسی
تذبذب کے کہی جا سکتی ہے کہ وہ بھی اپنے گھر میں اور باہر عوام کے
ساتھ ہندی ہی میں گفتگو کرتے۔ چنانچہ انہیں حقائق کے پیش نظر جہاں
خسرو نے اپنے آپ کو ''ترک ہندوستانیم'' کہا ہے وہاں اپنی مادری

زبان کو ہندی یا ہندوئی کہا ہے۔''۳۲؎

خسرو کا ایک شعر ہے:

ہست خطا و مغل و ترک و عرب　　　در سخن ہندیٔ ما دوختہ لب

'ہندی ما' کے اظہار سے خسرو کی ہندی یا ہندوی سے قربت کا پتہ چلتا ہے۔

ان معروضات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ممتاز حسین نے ''باغ و بہار'' کی تدوین کے ذریعہ نہ صرف اس کتاب کو صحت متن کے ساتھ پیش کیا بلکہ اس پر ایک عالمانہ مقدمہ لکھ کر اس کتاب اور مصنف و مترجم سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ پرانے مفروضات کی تردید کی اور نئے حقائق کا انکشاف کیا۔ ان کی یہ تحقیقی دقت پسندی اور دقیقہ سنجی ''غالب: ایک مطالعہ''، ''حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ'' اور ''امیر خسرو: حیات اور شاعری'' میں بھی جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ مذکورہ بالا تصانیف کے حوالے سے انھیں اردو تحقیق کی دنیا میں بھی یاد رکھا جائے گا اور ان کی تحقیقی ژرف نگاہی آیندہ محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

حواشی:

(۱) ادبی تحقیق، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۶ء، ص:۱۱

(۲) تحقیق کا فن، ڈاکٹر گیان چند جین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص:۹

(۳) تحقیق وتنقید، ڈاکٹر یوسف سرمست، آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرس کونسل ۱۹۹۹ء، ص:۴۵

(۴) اصول تحقیق، مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق، اصول او رطریقہ کار، ترتیب: پروفیسر عبدالستار دلوی، شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی، بمبئی ۱۹۸۴ء، ص:۷۷

(۵) تحقیق وتنقید، مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریق کار، پروفیسر عبدالستار دلوی، شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی ممبئی ۱۹۸۴ء، ص:۱۱۱

(۶) Robert Ross Research, an Introduction (New York 1974) p.4

(۷) تحقیق شناسی، ترتیب وحواشی، رفاقت علی شاہد، ندیم یونس پرنٹرس، لاہور، ص:۳۸

(۸) بیج ناتھ سنگھل، سودھ سورپ ایوم مانک دیوہاک کاریہ ودھی (میکملن کمپنی آف انڈیا دلی طبع اول ۱۹۸۰ء) ص:۸

(۹) ڈاکٹر چندر بھان راوت اور ڈاکٹر رام کمار کھنڈیلوال، سودھ پرودھی اور پرکریا (جواہر پسکتالے، متھرا، ۱۹۷۹ء) ص:۱۱

(۱۰) فکر ونظر، جولائی ۱۹۶۳ء، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص:۸۰-۷۹

(۱۱) تنقید شعر العجم، پروفیسر محمود شیرانی، ۱۹۴۳ء، ص:۲۰

(۱۲) فیض میر، مصنفہ سلطان الشعرا حضرت میر تقی میر، مع مقدمہ وترجمہ فرہنگ، مرتب سید مسعود حسن رضوی ادیب، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، ص:۴، ۳

(۱۳) مقدمات عبدالحق (اضافہ شدہ) ڈاکٹر عبادت بریلوی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۷۵ء، ص:۳۲۸-۳۲۷

(۱۴) تنقید شعر العجم، پروفیسر شیرانی، پیش کلام

(۱۵) قدیم اردو ادب کی تازہ تحقیق، محی الدین قادری زور، سیدازرسری نگر، ص:۳۴۳

(۱۶) تدوین، تحقیق روایت، رشید حسن خاں، ایس اے پبلیکیشنز، ۱۹۹۹ء، ص:۲۰۲

(۱۷) سید مسعود حسن رضوی، ہماری شاعری، مصنف کی آپ بیتی، ص:۲۴۱

(۱۸) ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ، ہندوستان میں، سید محمد عقیل، دریا آباد، الہ آباد ۲۰۰۹ء، ص:۱۰۶، ۱۰۵

(۱۹) جدید اردو تنقید: اصول ونظریات، ڈاکٹر شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء، ص:۳۷۹

(۲۰) انتخاب غالب، ممتاز حسین، اردو اکیڈمی، سندھ کراچی، ۱۹۵۷ء، ص:۱۴

(۲۱) حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ، ممتاز حسین، سعد پبلیکیشنز، ۱۹۸۸ء، ص:VII

(۲۲) محولہ بالا، ص:۵۷

(۲۳) ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ، ہندوستان میں، سید محمد عقیل، دریا آباد، الہ آباد ۲۰۰۹ء، ص:۱۰۹، ۱۰۸

(۲۴) امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری، ممتاز حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی ۱۹۸۲ء، ص:۱۳

(۲۵) محولہ بالا، ص:۱۵، ۱۴

(۲۶) محولہ بالا، ص:۱۵

(۲۷) محولہ بالا، ص:۱۵

(۲۸) محولہ بالا، ص:۱۰۵

(۲۹) محولہ بالا، ص:۱۰۷، ۱۰۶

(۳۰) محولہ بالا، ص:۱۱۵

(۳۱) محولہ بالا، ص:۱۱۵

(۳۲) محولہ بالا، ص:۳۳۷

باب پنجم

ممتاز حسین کی خدمات پر مجموعی تبصرہ

ممتاز حسین کی علمی اور ادبی خدمات کے مطالعے اور جائزے کے سلسلے میں گزشتہ ابواب میں ان کی سوانح، سیرت وشخصیت، علمی وادبی سفر کے آغاز، کتابوں کے تعارف، ممتاز حسین کی تنقید نگاری اور ان کی تحقیقی خدمات کا احاطہ کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ممتاز حسین یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو قصبہ پارہ ضلع غازی پور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پارہ ہی میں ہوئی۔ انٹرنس کا امتحان یہیں سے پاس کیا۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں ہائی اسکول کیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایونگ کرسچین کالج الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی ایڈ کیا اور ۱۹۴۶ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔

ممتاز حسین نے تدریسی زندگی کا آغاز کالون کالج لکھنؤ سے کیا۔ اس کے بعد ممبئی میں دو برس تک انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیے۔ اس کے علاوہ ممبئی یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے طالب علموں کی تدریس بھی کی۔ تقسیم ہند کے بعد وہ لاہور چلے گئے۔ جہاں دو سال تک وہ فری لانس جرنلزم کرتے رہے۔ اس سے قبل بمبئی میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار ''نیا زمانہ'' سے وابستہ رہے۔ پاکستان میں کئی اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ایک رسالہ ''روح ادب'' نکالا۔ مشہور روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر بھی رہے، کچھ عرصے کے بعد دوبارہ انھوں نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور کراچی کے مختلف کالجوں میں بیس برس تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ وہ سراج الدولہ کالج کراچی سے ۱۹۷۶ء میں بحیثیت پرنسپل ریٹائر ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد بھی کئی برسوں تک کراچی یونیورسٹی میں ایم اے کے طلبا کو اعزازی طور پر پڑھایا، اور پی ایچ ڈی کے نگراں بھی

رہے۔ اپنی وفات کے وقت تک وہ فیڈرل کالج کراچی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے ایم اے اردو کے طلبا کو تعلیم دیتے رہے۔

ممتاز حسین نے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا، ان کے کچھ افسانے ممتاز رومانی کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کے یہاں طبع زاد اور غیر طبع زاد دونوں طرح کے افسانے ملتے ہیں۔ ان کا پہلا طبع زاد افسانہ ''مصور کی شکست'' ہے جو الہ آباد کے سالانہ میگزین ۱۹۳۸ء میں چھپا تھا، لیکن ان کی بیٹی ڈاکٹر ناہید سلطان کا کہنا ہے کہ میں نے ان کا ۱۹۳۵ء میں شائع شدہ افسانہ جس کا عنوان شاید ''کالی لڑکی'' تھا، پڑھا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی ۱۴ کتابیں اردو اور انگریزی میں شائع ہوئیں۔ اگر ان کی کتاب ''امیر خسرو دہلوی (انگریزی)'' کے اردو ترجمہ کو بھی شامل کرلیا جائے تو مطبوعہ کتابوں کی کل تعداد پندرہ ہو جاتی ہے۔ ممتاز حسین کو ان کی دو کتابوں ''غالب: ایک مطالعہ'' اور ''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری'' پر انھیں داؤد ادبی انعامات سے نوازا گیا۔ ان کتابوں پر انھیں رائٹرز گلڈ کا انعام بھی ملا۔

ترقی پسند خیالات کی وجہ سے ممتاز حسین کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ ۱۹۵۲ء میں فیض احمد فیض کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کیا گیا۔ تقریباً چھ ماہ قید میں رہے۔ دوسری بار ۱۹۵۴ء میں گرفتاری کا حکم جاری ہوا۔ اس دفعہ روپوش ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے لیے ہندوستان چلے آئے پھر حالات معمول پر آنے کے بعد پاکستان لوٹے۔

ممتاز حسین مطالعے کے عادی تو تھے ہی انھیں کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ انھیں سائنس کے مضامین سے بڑی رغبت تھی۔ وہ علوم فلکیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

دیگر مصروفیات کے ساتھ ممتاز حسین تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہے۔ تحقیق و تنقید کے مختلف موضوعات پر ان کی چودہ کتابیں منظر عام پر آئیں، جس کا تفصیلی ذکر باب دوم میں آچکا ہے۔ ان کی دو اور کتابوں ''میر تقی میر: حیات اور شاعری'' اور ''اقبال'' کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے بارے میں آصف فرخی کا بیان ہے کہ میر اور اقبال پر کتابیں انھوں نے کمپوزنگ کے لیے دی تھیں مگر بہت کوشش کے باوجود ان کا سراغ نہ مل سکا اور نہ ہی مسودے کی کوئی نقل دستیاب ہوئی۔ خود ان کی بیٹی ڈاکٹر ناہید سلطان کے مطابق یہ کتابیں شائع نہیں ہوئیں۔ ممتاز حسین کی ایک اور کتاب ''ادب اور روح عصر''

۲۰۰۳ء میں پاکستان میں شائع ہوئی جو ہماری دسترس سے ہنوز باہر ہے۔ ''نقد حیات'' ۱۹۵۰ء ممتاز حسین کی پہلی تصنیف ہے جو تنقید سے متعلق ہے۔ اس میں گیارہ مضامین شامل ہیں جو ''کلچر اور فرقہ پرستی، غزل کی ہیئت، تنقید کا مارکسی نظریہ، بدلتی ہوئی نفسیات، انفعالی رومانیت، کچھ فسانہ کچھ حقیقت، کیا اقبال آفاقی شاعر ہیں، اردو شاعری کا مزاج اور غالب کی شکست کا تجزیہ'' نئے ادب کے معمار اور سیاہ حاشیے'' کے عنوان سے ہیں۔

''نئی قدریں'' ممتاز حسین کی دوسری کتاب ہے جو استقلال پریس کراچی سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں '' آرٹ اور حقیقت، نیا ادبی فن، غالب کا نظریۂ شعر، اردو زبان میں عوامی ادب کا مسئلہ، پشکن کی شاعری، تغزل اور انقلابی شاعری، تحلیل نفسی، حقیقت نگاریاں، چند ادبی اصطلاحیں، نئی غزل کا موجد- حالی، سرسید کا تاریخی کارنامہ، علامہ اقبال اور تصوف، اردو ادب میں انیس کی جگہ، وجدان، ناول اور افسانہ'' غزل یا شاعری کے عنوانات کے تحت سولہ مضامین شامل ہیں۔

تقریباً سارے مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں لیکن خود ممتاز حسین نے ''وجدان'' اور ''اردو ادب میں انیس کی جگہ'' کو زیادہ اہمیت کا حامل سمجھا ہے۔ ''وجدان'' ایک سنجیدہ مضمون ہے اور تنقید کا اچھا نمونہ ہے۔

''ادبی مسائل'' ممتاز حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۵۵ء میں مکتبہ اردو لاہور سے منظر عام پر آیا۔ اس میں '' یہ انسان خود اپنی تخلیق ہے، زبان اور شعر کا رشتہ، تخیل کی دنیا اور حقیقت، آرٹ میں حسن کا تعین، جمالیاتی حظ اور افادیت، ادب اور پراپا گنڈہ، اسلوب، تکنیک، ترقی پسند ادب'' اور ''عوامی ادب'' جیسے عنوانات پر مضامین شامل ہیں۔ دوسری خوبیوں کے ساتھ اس کتاب کی یہ بھی خوبی ہے کہ اس میں تنقیدی عمل کے دوران اچھائی اور برائی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھی گئی ہے۔

ممتاز حسین کی کتاب ''انتخاب غالب'' مارچ ۱۹۵۷ء جاوید پریس لاہور سے منظر عام پر آئی۔ ایک سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب نہایت دلچسپ اور اہم ہے۔ غالب کی غزلیات، نوحہ، مرثیہ، قصائد، رباعیات کے انتخاب کے علاوہ اس میں ۵۶ صفحات پر مشتمل ممتاز حسین کا بسیط مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ

مقدمہ غالب سے گفتگو کی شکل میں دلچسپ پیرایے میں لکھا گیا ہے۔

ممتاز حسین نے میرامن دہلوی کی مشہور کتاب ''باغ و بہار'' کو بھی مع مقدمہ و فرہنگ مرتب کیا تھا جو ۱۹۵۸ء میں اردو ٹرسٹ کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب تحقیقی اور تنقیدی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس میں باغ و بہار کے ماخذ، میرامن کے ترجمے کی نوعیت و اہمیت اور دلی کی معاشرت کی جھلکیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

ممتاز حسین کی تصنیف ''ادب اور شعور'' ایجوکیشنل پریس کراچی سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ دراصل گزشتہ چھ سات سال کے دوران مختلف رسائل میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں مختلف عنوانات کے تحت کل ۲۲ مضامین شامل ہیں۔ یہ عناوین ''نثر معلیٰ، رسالہ درمعرفت استعارہ، ہمارا کلچر اور ادب (۵۷ء سے پہلے اور ۵۷ء کے بعد) ہماری تہذیبی جدوجہد، قومی زندگی میں علاقائی کلچر کی اہمیت، تنقید کے چند بنیادی اصول، فن اور فطرت (فکر اقبال کے آئینے میں)، ادب اور سائنس، ادب اور شخصیت، اسٹائل، ناول نگار۔ منشی پریم چند، حسرت کی غزل گوئی، فیض کی شاعری، راشد کی شاعری کا کیرکٹر، مجاز کی موت پر، منٹو کی یاد میں، یزید (سعادت حسن منٹو)' شذرات' کے تحت چار عناوین ''غالب۔ ایک تہذیبی قوت، حالی۔ اردو کا پہلا نقاد؟، کردار نگاری، قومیت کے معمار۔ ادیب'' ہیں۔

ممتاز حسین کی کتاب ''نئے تنقیدی گوشے'' یونین پرنٹنگ پریس دلی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۲۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں تین مضامین ''سائنس اور اخلاقی نظام''، ''رجعت پسند ادب کیا ہے'' اور ''صورت و معنی'' شامل ہیں۔ حصہ دوم میں چار مضامین ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق''، ''تنقید اور اپنی تنقید اور ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق (ایک ڈیموگاگی کا تجزیہ) پر مشتمل ہے۔ حصہ سوم میں چار مضامین ''افلاطون کا نظریۂ جمالیات''، ''ارسطو کا نظریۂ جمالیات''، ''فلوطینس کا نظریۂ جمالیات'' ''سینٹ اگسٹائن کا نظریۂ جمالیات'' شامل ہیں۔ حصہ چہارم میں ''ہمارے افسانوں میں ادب کے چند رجحانات''، ''حالی کا نقطۂ نظر''، ''انسان اور حیوان'' کے عناوین کے تحت تین مضامین شامل ہیں۔

ممتاز حسین کی کتاب ''غالب ایک مطالعہ'' غالب کی صدسالہ برسی پر انجمن ترقی اردو پاکستان کی

جانب سے انجمن پریس کراچی سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ''حرف آغاز''، تاریخ کی رزم گاہ میں غالب کا موقف''، ''غالب کا ردعمل''، ''غالب کا آئینہ فن''، ''احساس ظرف اور طنز'' اور ''احساس غم'' کے عناوین کے تحت کل چھ ابواب ہیں۔

''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری'' مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آئی۔ تحقیق کے لحاظ سے یہ کتاب زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں ممتاز حسین نے امیر خسرو کے والد کے نام، جائے پیدائش وغیرہ سے متعلق نئی باتیں دریافت کی ہیں۔

''نقد حرف'' تین سو صفحات پر مشتمل ممتاز حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۸۵ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں ''غالب - ایک آفاقی شاعر''، جوش - فکر و فن کے آئینے میں، مرزا یاس یگانہ کی شاعری، شاعر فراق گورکھپوری، فیض کی شاعری، ادب روایت، جدت اور جدیدیت، ادب - ایک اسلوب اختلاف رائے کا، ادیب اور آزادئ رائے، معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ، شاعری اور شخصیت، طرز تحریر اور نفسیات، تصوف اور شاعری، آزاد نظم کا موجودہ تجزیہ، جدید اور جدید تر شاعری، لفظ 'ستار' کی سرگزشت، قومی بیداری میں اکبر کا حصہ، اقبال کا تصور اجتہاد، فانی کے کلام پر ایک نظر، اختر حسین رائے پوری اور گرد راہ، خدیجہ کا فن، ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت، داستانوں کی ماہیت، باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوانات کے تحت کل ۲۳ مضامین شامل ہیں۔ سارے مضامین بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مختلف مضامین میں ممتاز حسین نے مختلف شعرا کے کلام، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، ادیبوں اور ادب کے مختلف اصناف کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔

''حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ'' ۱۹۸۸ء میں سعد پبلی کیشنز سے منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب طویل محنت کا نتیجہ ہے جو ۱۹۶۴ء کے آس پاس شروع ہوئی تھی۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے متعلق وہ کہتے ہیں کہ حالی کی یہ تحریر ان کی ناقدانہ حیثیت متعین کرتی اور پھر یہی تحریر دیوان سے علاحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مکتفی تصنیف کی حیثیت کی حامل بن گئی اور رفتہ رفتہ اردو تنقید کی بنیاد بن گئی۔

''یگانہ: شخص اور شاعری'' لاہور پریس دہلی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب یاس یگانہ چنگیزی کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں ممتاز حسین نے

یگانہ کے کلام کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے ان کی قادرالکلامی، مخصوص اندازِ بیان اور منفرلب ولہجہ کی تعریف کی ہے۔

جمالیات کے موضوع پر ان کی کتاب ''مارکسی جمالیات'' پہلی بار دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ مارکسی جمالیات پر ممتاز حسین کا مقالہ ان کے آخری دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے مارکسی جمالیات پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ وہ مارکسی جمالیات کو سمجھنے کے لیے مارکسی فلسفے کے مبادیات کی جانکاری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مارکس کے تصور آدمی پر بھی زور دیتے ہیں۔ مارکس کے فلسفے میں انسانی اخلاق کو بہت زیادہ دخل ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ فن کی دنیا میں فن کار اپنی تخلیق میں چھپ کر گفتگو کرے۔ اس سلسلے میں وہ ایک مخصوص لب و لہجے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ مارکس نے ہیگل کے فلسفے کو رد بھی کیا ہے اور قبول بھی۔ مارکس ہیگل سے کس قدر متاثر ہے اس کے بارے میں لینن کا یہ خیال ہے کہ جس نے ہیگل کو نہیں پڑھا وہ مارکس کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ ادب میں اخلاق کے اظہار کے اسلوب میں ہیگل کی کتاب جمالیات بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور یہ مارکسی جمالیات کے خلاف نہیں ہے۔

ممتاز حسین کی پہلی تنقیدی کتاب ''نقد حیات'' ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آئی، اپنی اس پہلی تصنیف کے ذریعہ ہی انھوں نے تنقید کی دنیا میں جگہ بنالی۔ وہ ادب میں مارکسی اور ترقی پسند نظریہ کے حامی تھے۔ ان کے طرز تحریر میں انفرادیت تھی۔ انھوں نے اپنے پیش رووٴں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی ڈگر الگ بنائی اور اس رستے میں فعال رہے۔ وہ اردو کے ان چند گنے چنے نقادوں میں سے ایک ہیں جو ادبی تنقید اور اس کی شرائط سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان شرائط کو ممکنہ حد تک پورا بھی کرتے تھے۔ ممتاز حسین کی ان ہی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر ایم کاظم رضا کا خیال ہے:

> ''تنقید کے اپنے اسرار ہوتے ہیں اور ممتاز حسین کی شخصیت ان ہی اسرار سے عبارت تھی...... ممتاز حسین جو ایک بے چہرہ ادیب کہے جاسکتے ہیں، وہ اردو ادب کا چہرہ نما لکھ گئے۔ ان کا وجود ان کی اپنی شناخت کے لیے نہیں۔ ہماری شناخت کے لیے ضروری تھا۔'' (سہ ماہی خیال، کراچی، ایڈیٹر حبیب احسن، جلد ۵، شمارہ ۱۷، اپریل تا جون

۲۰۰۶ء،ص:۱۱۶-۱۱۸)

ممتاز حسین ایک طویل عرصے تک تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہے۔تصنیف و تالیف کا یہ عرصہ کوئی پچاس سال پر محیط ہے۔احمد ہمدانی کے الفاظ میں:

''تصانیف کی اس طویل فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم و ادب پروفیسر ممتاز حسین کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ وہ ادب کو مشغلہ کے طور پر اپنائے ہیں بلکہ یہ ان کا ایک ایسا مشغلہ ہے جو ہمہ وقت انہیں اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔خود کو علم و ادب کے لیے وقف کر دینے والے پروفیسر ممتاز حسین جیسے لوگ خال خال پیدا ہوتے ہیں۔''

(ایضاً،ص:۱۳۷)

ممتاز حسین کی تنقیدی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل احمد خاں کہتے ہیں:

''ممتاز حسین ایسے ادبی ناقدین کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔جنھوں نے تنقید کو ایک سنجیدہ علمی کارروائی کے طور پر منوانے کے لیے لگ بھگ پچاس سال محنت کی۔ وہ تنقید کو ایک سماجی علم کے طور پر قبول کرتے تھے اور اعلیٰ انسانی خیالات کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کی تنقید کی ٹھوس علمی اساس ہے۔اس میں فلسفیانہ تصورات،سماجی بصیرتیں اور سیاسی اعمال آپس میں گندھے ہوئے ہیں۔ممتاز حسین کے لیے تنقید نقد حیات بھی ہے اور نقد حرف بھی۔''(ایضاً،ص:۱۲۲)

ممتاز حسین کے تنقیدی نظریے سے متعلق آل احمد سرور رقم طراز ہیں:

''ممتاز حسین ایک مارکسی نقاد ہیں وہ ادب کو کسی فنی یا جمالیاتی نظر سے دیکھنے کے بجائے حیات انسانی کے ابھرتے ہوئے اور پیداوار کے ذرائع کے ساتھ بدلتے ہوئے شعور سے کام لیتے ہیں۔ان کی تنقید میں ایک منطقی لب ولہجہ اور سائنٹفک ترتیب پائی جاتی ہے۔''(ایضاً،ص:۱۱۰)

ممتاز حسین کا تعلق ترقی پسندی اور مارکسیت دونوں سے بہت گہرا تھا۔اس کے باوجود وہ لبرل خیال کے حامی تھے۔ ادب میں وہ کسی بھی تنگ نظری اور تعصب سے پاک تھے۔ترقی پسند ہونے کے باوجود ادب کے معاملے میں ترقی پسندوں کے بعض نظریات سے انھوں نے اختلاف کیا۔ ترقی پسندی کی انتہا پسندی کے دور میں جب بعض ادیبوں نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھانے کی تلقین کی تو اس موقع پر سب سے پہلے ممتاز حسین نے ہی ترقی پسند ادیبوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی۔تنقید نگاروں کے درمیان ممتاز حسین کی پہچان ایک وسیع النظر، وسیع المشرب، اور بے تعصب نقاد کی ہے۔ وہ ایک آزاد خیال مفکر اور تنقید نگار تھے۔ان کی تنقید ترقی پسندی اور مارکسزم سے بلند ہوکر کثیر الجہت حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ممتاز حسین کی اسی پہچان کی وجہ سے پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا ہے کہ:

''ممتاز حسین ایسے نہ تھے کہ لکیر کے فقیر بنے رہتے۔ وہ اکثر لوگوں سے اختلاف کرتے اور اپنی ڈگر بنانے میں زیادہ فعال نظر آتے ہیں۔''

وہ کسی بھی مطالعے کو سرسری طور پر پیش کرنے کے خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض کتابیں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ان کی طرف بار بار توجہ کی جارہی ہے۔

شہزاد منظر کا خیال ہے کہ ''بعض معاملات میں پروفیسر ممتاز حسین کے پائے کا کوئی دوسرا نقاد نہیں تھا۔'' وہ ممتاز حسین کو احتشام حسین سے بھی ایک درجہ اوپر سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے نہ صرف احتشام حسین سے زیادہ کام کیا بلکہ کیفیت کے اعتبار سے ان سے بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔

ممتاز حسین کے مطالعے، ان کا علمی تعمق، ان کی عقلیت پسندی اور حقیقت کی تلاش کو اکثر ناقدین نے سراہا ہے۔ممتاز حسین کے بارے میں سید محمد عقیل کا خیال ہے کہ ''نقد حیات کے بعد ان کی دیگر کتابیں خاصی فصاحت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ پھر ان کی تحریر کا تاثر اور فکری تعمق ان کی تنقیدوں کو وزن اور وقار کے ساتھ لے کر چلتا ہے جس سے وہ اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز اور اہم ناقد نظر آتے ہیں۔''

ممتاز حسین نے مارکسی فلسفہ کا بہت زیادہ مطالعہ کیا تھا۔ان کی تنقید میں اس فکر و فلسفہ کا بہت زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔ادبی مطالعے میں طبقاتی کشمکش اور اس کے اثرات کا انھوں نے بغور جائزہ لیا ہے۔ مارکسی نقطۂ نظر سے اقتصادی مسئلے کی بنیادی اہمیت ہے یہ ایک ایسی بنیاد ہے جس پر مختلف فنون کی عمارتیں تعمیر کی

جاتی ہیں۔ اس کو نظر انداز کر کے زندگی کی تنقید کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ واضح علمی اسلوب اور فلسفیانہ طریقہ کار کے ساتھ ساتھ ان کی تنقید میں منطق، لب ولہجہ اور سائنٹفک ترتیب پائی جاتی ہے۔

ممتاز حسین نے ہندوستانی ادیبوں کے ساتھ ساتھ مغربی ادیبوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ مغربی مصنفین میں انھیں شیکسپیئر، گوئٹے، پسکن، چیخوف، میکسم گورکی، روماں، رولاں، بالزاک، لوٹرگاں، برگ اور سولوخوف بہت زیادہ پسند تھے۔ ان کے غائر مطالعہ کے بعد ممتاز حسین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مغربی ادیبوں کے کارناموں پر سطحی نظر ڈالنے کی وجہ سے ادب میں بعض غلط فہمیوں کا اضافہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں آل احمد سرور کی رائے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ:

> ''ہمارے ادب میں مغربی رجحانات کا مطالعہ بہت سرسری طور پر کیا گیا ہے اور وہ بھی انگریزی کے واسطے سے اسی لیے فرانسیسی، روسی یا جرمن ادیبوں کے کارناموں پر بہت سطحی اور طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ممتاز نے ٹھیک لکھا ہے کہ بودلیئر کی زندگی نفسیات اور نقطۂ نظر کو سمجھے بغیر بعض لوگ اس کی ادبی عظمت کے گیت گانے لگتے ہیں اور اسی وجہ سے پڑھنے والوں کی غلط فہمیاں بڑھتی جاتی ہیں۔'' (خیال، ص:۱۱۱)

غزل کے بارے میں مختلف تنقید نگاروں نے اپنی رائیں پیش کی ہیں۔ کسی نے اس کو اردو شاعری کی آبرو کہا تو کسی نے اسے نیم وحشی صنف سخن کہہ دیا۔ دیکھا جائے تو ان رایوں میں پوری صداقت پیش نہیں کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ممتاز حسین کا خیال ہے کہ:

''غزل جاگیردارانہ تمدن کی ایک مخصوص صنف ہے اور یہ دور چوں کہ زیادہ انتشار اور ابتری کا رہا ہے۔ اس لیے تسلسل اور انضباط سے گریز کرنے کے لیے اسے ایک خاص اہمیت دی گئی ہے۔''

ان کا یہ قول زیادہ بنیادی حقیقتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ آل احمد سرور اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ:

> ''صنف شاعری میں غزل پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے ممتاز حسین نے غزل کے مرکزی موڈ اور تصور کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کے بقول ''وہ ان نقادوں میں سے نہیں ہیں جو جاگیردارانہ تمدن کے ہر ورثے کو

فرسودہ سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ وہ غزل کے سوز وگداز سے منکر
نہیں ہیں اور اس کے اندر جو لچک پائی جاتی ہے اسے مانتے ہیں۔ اس
طرح یہ تنقید ازسرتاپا تخریبی ہونے کے بجائے ایک نئی تعمیر کا آلہ بن
جاتی ہے۔ (خیال، ص:۱۱۰)

ممتاز حسین نے اردو شاعری میں مختلف شعرا کے فکر وفن کا محاسبہ کیا ہے۔ اپنی تنقید میں انھوں نے غالب، حالی اور اقبال کے فکر وفن کو بطور خاص جگہ دی ہے۔ غالب کے فن پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے انھوں نے غالب کو مفکر طبقے کا پیش رو تسلیم کیا ہے۔ حالی کو انھوں نے پہلا ترقی پسند نقاد تسلیم کیا ہے، جس نے ادب اور زندگی میں رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر اقبال کی شاعری کو بہت عقیدت و احترام کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں شاعر مشرق اور شاعر اسلام بھی سمجھا جاتا ہے۔ شخصیت پرستی کے اس رجحان نے اقبال کی کئی خوبیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اقبال پر ممتاز حسین کی تنقید بہت خیال انگیز ہے۔

ممتاز حسین کا یہ اعتراض ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کے زوال پر نظر ڈالتے وقت صرف فکری تحریکات پر غور کیا ہے، مادی اسباب کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اقبال مابعدالطبیعاتی رجحانات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ذرائع پیداوار کی تبدیلی اور نئے معاشرہ کے وجود میں آنے کو اہمیت نہیں دی۔ اس سلسلے میں ممتاز حسین کی دوٹوک رائے یہ ہے کہ ''کوئی بھی شاعر کسی مذہبی یا سیاسی تحریک کی بنا پر آفاقی نہیں بن سکتا۔''

ممتاز حسین کی تنقیدوں میں ''انسان'' کو مرکزیت حاصل ہے اور یہیں سے عملی تنقید کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ انسان کو انھوں نے ایک نظریہ اور ایک اجتماعی قوت تصور کیا ہے۔ عالم گیریت، حریت اور اخوت کے تصورات کو وہ اسی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ممتاز حسین کی تنقید ان تصورات کو سامنے لاتی ہے اور ان اقدار کے خلاف رنگ ونسل اور طبقاتی امتیاز کو رد کرتی ہے۔ یہ انسان دوستی انھیں قدیم ادب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ممتاز حسین کا ''انسان'' تاریخ کو اپنے شعور سے تخلیق کرتا ہے اور کائنات پر چھا جاتا ہے۔ ان کا یہ تصور ان کے دل ودماغ پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ اس کے تصور کا اعلان تبلیغی انداز اختیار کر لیتا ہے۔

وہ اپنے مضامین میں بار بار اس کا حوالہ دیتے ہیں۔

ممتاز حسین کی تنقیدی کاوشوں کو بحیثیت مجموعی دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اردو تنقید میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ وہ جس خیال اور رجحان کے علمبردار تھے، اس ڈگر پر ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آتی۔ کچھ کمیوں کے باوجود انھوں نے تنقیدی فکر کو سائنسی سمت دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو تنقید کی تاریخ میں وہ اپنے رجحان کے اہم ترین نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ زندگی اور معاشرہ کے تمام حالات واقدار کو حرکت و تغیر کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ممتاز حسین کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تنقید نگاری میں بیش بہا خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ تحقیق سے بھی گہری وابستگی رکھی۔ تحقیق کے میدان میں ان کی کئی یادگار تصانیف ہیں جو مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ ممتاز حسین کا تحقیقی سفر ''باغ و بہار'' سے ہوا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''باغ و بہار'' امیر خسرو کی تصنیف قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے اور یہ ترجمہ میر امن دہلوی نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر کیا تھا۔ قصہ چہار درویش کے اصل مصنف کا مسئلہ تحقیق طلب تھا اور آج بھی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی اہم تھا کہ میر امن کے ترجمے کی نوعیت کیا تھی؟ لفظی یا آزاد؟

ممتاز حسین نے اپنی تحقیق میں ان باتوں کو مدنظر رکھا۔ اپنی تحقیق سے انھوں نے یہ ثابت کیا کہ اس کا ماخذ نوطرز مرصع ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے یہ غلط فہمی بھی دور کی کہ میر امن نے باغ و بہار کی تالیف کے وقت نوطرز مرصع کا ذکر نہیں کیا اور اپنی کتاب کا ماخذ چہار درویش کو ٹھہرایا۔ ممتاز حسین یہ بتاتے ہیں کہ آکسفورڈ کی بورڈن لائبریری میں چہار درویش کا ایک نسخہ موجود ہے اور اس نسخے کے سرورق پر قصہ چہار درویش لکھا ہوا ہے۔ ممتاز حسین کی تحقیق کے مطابق محمود شیرانی کے پیش نظر جو نسخہ تھا اس کو تقدم حاصل نہیں ہے۔ انھوں نے حافظ شیرانی کے اس بیان کو کہ میر امن نے امیر خسرو سے متعلق روایت کو فارسی مطبوعہ نسخے مولفہ امیر احمد شاہ خلف محمد شاہ کے دیباچے سے نقل کیا ہے، غلط ٹھہرایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قصہ محمد شاہی عہد سے پہلے عوام کے درمیان مشہور تھا۔

''غالب ایک مطالعہ'' ممتاز حسین کا دوسرا بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اپنی تصنیف میں ممتاز حسین نے غالب کے فن اور شخصیت کے کئی اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے مطالعہ غالب کو نئی جہت عطا کی

ہے۔انھوں نے اس تصنیف میں غالب کی مختلف عطایا کا ذکر کیا ہے،جس نے اردو ادب کو جلا بخشی ہے۔ انھوں نے غالب کے خیالات کو تجدید حیات کا سر چشمہ مانا ہے۔غالب کے اشعار نے ہمارے ادب کو نئی جمالیات عطا کی۔اس نے تقلید کے بجائے تنقید کا شعور بخشا۔

غالب پر ان کی تصنیف جو خود ان کی نظر میں ادھوری صورت میں شائع ہوئی، اس میں ان کا انداز ناقدانہ ہے اور اس میں ان کا زور انگریزی تہذیب کے باعث آنے والے تغیر سے غالب کے ذہنی رشتے کو سمجھنے ہی میں صرف ہوا اور غالب کے دوسرے تصورات پر لکھتے ہوئے وہ اپنے دوسرے مضامین میں کہی ہوئی باتوں ہی کو نسبتاً تفصیل سے بیان کرتے رہے۔

''غالب ایک مطالعہ'' اس لحاظ سے بھی ممتاز حسین کی ایک اہم تصنیف ہے کہ اس میں انھوں نے غالب کی تعقل پسندی اور انسان دوستی کو اہمیت دی ہے۔ یہ مطالعہ تاریخ کا ایک اہم رخ ہے۔ یہ مطالعہ کسی بھی دور کے انسان، ان کی تہذیب، ان کی سوچ، حقائق، مستقبل کی طرف بڑھتے قدم، انسانی ارتقا اور تنزل پر محیط ہے۔

حیات غالب اور ان کے کلام کے مطالعے سے متعلق ممتاز حسین کی کتاب ''انتخاب غالب'' بہت اہم ہے۔انھوں نے یہ کتاب بہت دلچسپ پیرایے میں لکھی ہے۔اس میں ممتاز حسین اور مرزا غالب ہم کلام نظر آتے ہیں۔ممتاز حسین غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ان سے سوال کرتے ہیں اور وہ ان کا جواب دیتے ہیں۔اس کتاب میں ممتاز حسین نے غالب کے خاندانی حالات اور ذاتی زندگی کے احوال کے علاوہ ان کی تعلیم اور شعر و شاعری سے متعلق بعض نکتوں کی وضاحت کی ہے۔انھوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ غالب نے نظیر اکبرآبادی سے تعلیم حاصل کی تھی۔انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم سے حاصل کی تھی۔غالب کی تعلیم کے سلسلے میں ایک نام ملّا عبدالصمد کا بھی آتا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ممتاز حسین نے غالب کی شاعری میں عجمیت، زرتشتیت، اشراقیت اور افلاطونیت کے جن عناصر کی نشاندہی کی ہے وہ قابل توجہ ہے۔غالب نے اپنے اکثر اشعار میں تصوف کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔''انتخاب غالب'' میں ممتاز حسین نے بتایا ہے کہ تصوف سے ان کی دلچسپی نظریاتی تھی نہ کہ عملی۔غالب کو فلسفے سے خاصی دلچسپی تھی۔وہ تاعمر فلسفے کا مطالعہ کرتے رہے۔دوسروں کو بھی اس کے

مطالعے کی تلقین کرتے تھے۔ ممتاز حسین نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ شیخ محمد اکرام نے غالب کی شاعری کو کیوں کر فلسفے سے خارج قرار دیا۔ ان کے خیال میں اکرام کی یہ رائے ناانصافی پر مبنی ہے۔ ممتاز حسین نے اس نکتے کی بھی بھرپور وضاحت کی ہے کہ غالب پرانے فرسودہ خیالات کے حامی نہیں تھے بلکہ ہر جدت کو خوش آمدید کہنے کو تیار رہتے تھے۔ چنانچہ جب سرسید نے انھیں آئین اکبری کے تصحیح شدہ نسخے کے لیے تقریظ لکھنے کے لیے کہا تو غالب نے مغلوں کے جاگیردارانہ نظام کے برعکس انگریزوں کے جمہوری نظام کی تعریف و تحسین کی۔

تنقید اور تحقیق کی دنیا میں ممتاز حسین کی کتاب ''حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ'' کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ حالاں کہ حالی کے بعض مغربی مآخذ کو پہلی بار ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمہ شعر و شاعری مرتب کرتے ہوئے متعارف کرایا تھا مگر حالی کے سلسلے میں ان کا انداز جارحانہ تھا۔ اس سلسلے میں ممتاز حسین کا رویّہ وحید قریشی سے مختلف ہے۔ انھوں نے مقدمے کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر حالی کے ماخذ پر ہی رہی۔ حالی نے افلاطون، شیکسپیئر، ملٹن، والٹر اسکاٹ، گولڈ اسمتھ وغیرہ کا خود تذکرہ کر دیا ہے، لیکن بعض مباحث کے بیان میں یہ لکھا ہے کہ ''ایک یوروپین محقق ان لفظوں کی شرح اس طرح کرتا ہے'' اور پھر واوین میں اس کی رائے درج کی ہے۔ ممتاز حسین نے اپنی تحقیق سے یہ ڈھونڈ نکالا ہے کہ وہ یورپین محقق کولرج ہے۔ انھوں نے کولرج کی اصل عبارت بھی اپنی کتاب میں درج کر دی ہے۔ اس طرح انھوں نے حالی کے بیانات کو اصل ماخذ کی روشنی میں پرکھا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے ممتاز حسین کی اس کوشش کو تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ ممتاز حسین نے اس کتاب میں ان تمام ماخذ کو دریافت کیا ہے، جو اس سے قبل دریافت نہیں کیے گئے تھے۔ انھوں نے ان تمام ماخذ پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ سید محمد عقیل نے ممتاز حسین کی اس تصنیف کو اردو والوں کے لیے Eye Opener (انتباہ) بتایا ہے۔

غالب کے مطالعے کے بعد ممتاز حسین نے امیر خسرو کے مطالعے پر اپنی توجہ صرف کی۔ ایک طویل اور عمیق مطالعے کے بعد ان کی کتاب ''امیر خسرو دہلوی - حیات اور شاعری'' منظر عام پر آئی۔ جس میں انھوں نے امیر خسرو سے متعلق متعدد غلط روایات کی نشاندہی اور ان کی تردید کی۔ انھوں نے ۳۶۵ صفحات کی اس تصنیف میں بہت چھان بین کے بعد بعض ایسے نکتے ابھارے جن پر یا تو لوگوں کی نظر نہیں

گئی تھی یا گئی تو اختلافات باقی رہے تھے۔ اپنی تحقیق سے انھوں نے ثابت کیا کہ امیر خسرو کے والد کا نام سیف الدین لاچین تھا جبکہ عوام کے درمیان سیف الدین محمود رائج تھا۔ خسرو کی جائے پیدائش کے بارے میں انھوں نے تحقیق کے ذریعہ بتایا کہ خسرو پٹیالا میں نہیں بلکہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود خسرو کے نام کے متعلق ان کی تحقیق ہے کہ ان کا نام ابوالحسن یمین الدین نہیں بلکہ اصل نام محمد خسرو تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ سے ان کے تعلقات پیری مریدی کے نہیں دوستی و ہم نشینی کے تھے۔ امیر خسرو نے ایک سیاست داں اور دنیا دار کی زندگی گزاری۔ امیر خسرو کی عقیدت حضرت نظام الدین سے چاہے جتنی گہری ہو لیکن انھوں نے اپنی جاہ طلبی کو خیر باد نہیں کہا۔ حافظ کی غزل گوئی سے متعلق ممتاز حسین نے یہ نکتہ پیدا کیا۔ حافظ نے خسرو سے فیض حاصل کیا ہے۔ سعدی اور حافظ کے درمیان خسرو ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ممتاز حسین کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے خود کو مطالعے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ ان کی تنقیدی اور تحقیقی تصنیفات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ علم و ادب سے متعلق ان کی خدمات بے بہا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر ناقدین نے ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ان کی تنقید میں منطقی لب و لہجے اور سائنٹفک ترتیب کے لیے ان کی تعریف کی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی' ممتاز حسین کی تنقید کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان کی کتابوں کی تعریف کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک نقاد کی حیثیت سے ان کی جگہ محفوظ ہے۔ پروفیسر شہزاد منظر نے ممتاز حسین کو احتشام حسین کے پائے کا نقاد تصور کیا ہے اور بعض معاملات میں تو احتشام حسین پر بھی فوقیت دی ہے۔ سلیم احمد نے بھی ممتاز حسین کی خدمات کو بہت زیادہ سراہا ہے۔ سید محمد عقیل نے ممتاز حسین کے تنقیدی انداز بیان کے لیے ان کی تعریف کی ہے اور ان کے فکر کی گہرائی کی وجہ سے ان کے ہم عصروں کے درمیان ممتاز قرار دیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کے ابتدائی مضامین کے انداز بیان کی ثقالت کا ذکر تو کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اعتراف کیا ہے کہ ان کی بعد کی تنقیدوں میں یہ عیب کم ہوتا گیا۔ انھوں نے ممتاز حسین کے مضامین ''نثر معلیٰ'' اور'' رسالہ درمعرفت استعارہ'' کی خوب تحسین کی ہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے ممتاز حسین کے پختہ خیالات کے لیے ان کی تعریف کی ہے۔ مذکورہ بالا مشاہیر کی آرا کی روشنی میں کہا جاسکتا

ہے کہ ممتاز حسین کی تحریروں میں خامیاں کم اور خوبیاں زیادہ ہیں۔ سید محمد عقیل کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ ممتاز حسین کی تنقید عقلیت پسندی، سماجی اور تاریخی قوتوں سے اصلیت کی تلاش کا بہترین نمونہ ہیں جس میں جمالیات اور نفسیات کی جا بہ جا عملی اور امکانی بحثیں طرز تحریر کو بیحد وقیع اور جامع بناتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ مارکسی تنقید کا بھی مثالی نمونہ بنتی ہیں۔

ممتاز حسین نے اپنے تحقیقی مضامین اور تصانیف میں نہایت باریک بینی کے ساتھ نئے نئے حقائق کا انکشاف کرتے ہوئے بہت سی مروجہ روایتوں کی تردید کی۔ اردو تحقیق میں وہ اپنی اس باریک بینی اور نکتہ رسی کی بنا پر یاد رکھے جائیں گے۔ ادبی نقاد کی حیثیت سے انھوں نے افراط وتفریط سے گریز کرتے ہوئے توازن اور اعتدال کی راہ اختیار کی۔ ترقی پسند ہونے کے باوجود ان کے نظریات میں وہ شدت نہیں ہے جو بعض دوسرے ترقی پسند نقادوں کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ ممتاز حسین نے کلاسیکی شعر وادب کا از سرنو مطالعہ کر کے اس کا جائزہ لینے اور قدر و قیمت متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اردو تنقید میں بھی وہ اپنے متوازن انداز اور اصابت رائے کی بنا پر یاد رکھے جائیں گے۔

○

مآخذ ومصادر

(الف) ممتاز حسین کی تصانیف/تالیفات

تصنیف	مصنف	ناشر	سن
ادب اور شعور	ممتاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۶۱ء
ادبی مسائل	ممتاز حسین	مکتبہ اردو، لاہور	۱۹۵۵ء
امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری	ممتاز حسین	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
انتخاب غالب مع مقدمہ	ممتاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۵۷ء
باغ و بہار مع مقدمہ و فرہنگ	ممتاز حسین	اردو ٹرسٹ، کراچی	۱۹۵۸ء
حالی کے شعری نظریات (ایک تنقیدی مطالعہ)	ممتاز حسین	سعد پبلیکیشنز، کراچی	۱۹۸۸ء
غالب: ایک مطالعہ	ممتاز حسین	انجمن ترقی اردو، کراچی	۱۹۶۹ء
مارکسی جمالیات (نظام لکچر)	ممتاز حسین	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی	۱۹۸۹ء
نقد حرف	ممتاز حسین	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۵ء
نقد حیات	ممتاز حسین	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	۱۹۵۰ء
نئی قدریں	ممتاز حسین	استقلال پریس، لاہور	۱۹۵۳ء
نئے تنقیدی گوشے	ممتاز حسین	آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی	۱۹۶۴ء
یگانہ: شخص اور شاعری	ممتاز حسین	اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۸ء

(ب) دیگر امدادی کتب

تصنیف	مصنف	ناشر	سن
ادب اور انقلاب	اختر حسین رائے پوری	ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد	۱۹۴۳ء
ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۴ء
ادبی اصناف	ڈاکٹر گیان چند	گجرات اردو اکادمی	۱۹۸۹ء
ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خاں	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۵ء

کتاب	مصنف	ناشر	سال
ادبی تحقیق	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۶ء
ادبی تنقید کے اصول	کلیم الدین احمد	کے جی سیدین میموریل ٹرسٹ جامعہ نگر، دہلی	۱۹۸۳ء
ادبی تنقید کے لسانی مضمرات	مرزا خلیل احمد بیگ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۲ء
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	۱۹۸۳ء
اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ	۱۹۸۳ء
اردو تنقید کا ارتقا	عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۲ء
اردو تنقید-منتخب مقالات	حامدی کاشمیری	ساہتیہ اکادمی	۱۹۹۷ء
اردو تنقید (مسائل ومباحث)	مرتبہ: پروفیسر منظر عباس نقوی	شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۹۳ء
اردو تنقید کی تاریخ	ڈاکٹر مسیح الزماں	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۶ء
اردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۲ء
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۷ء
اصول انتقادِ ادبیات	عابد علی عابد	مجلس ترقی اردو، لاہور	۱۹۶۰ء
اصول تحقیق و ترتیب متن	تنویر احمد علوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۳ء
اصول تحقیق	عبدالستار دلوی	شعبہ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی	۱۹۸۴ء
افکار کے دیئے	آل احمد سرور	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۰ء
ایجاب وانحراف (تحقیق وتنقید)	نسیم احمد نسیم/ ذہن اختر ندوی	نئی دہلی	۱۹۹۹ء
آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید	شارب ردولوی	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۹۱ء
پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال	شہزاد منظر	منظر پبلیکیشنز	۱۹۹۶ء
تاریخ ادب اردو	نور الحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۱ء
تاریخ ادب اردو (ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک، جلد اول)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۷ء
تاریخ ادب اردو (ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک، جلد دوم)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۷ء
تحقیق شناسی (ترتیب وحواشی)	رفاقت علی شاہد	القمر انٹرپرائزز، غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور	۲۰۰۳ء
تحقیق کا فن	ڈاکٹر گیان چند	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۴ء
تحقیق نامہ	مشفق خواجہ	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی	۱۹۹۱ء

تحقیق وتدوین (مسائل اور مباحث)	حنیف نقوی	اسکرین پلے، تل بھانڈیشور، وارانسی	۲۰۱۰ء
تحقیق وتدوین	ابن کنول	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی	۲۰۰۶ء
تحقیق وتنقید	یوسف سرمست	آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرس کونسل	۱۹۹۹ء
تدوین، تحقیق، روایت	رشید حسن خاں	ایس اے پبلیکیشنز	۱۹۹۹ء
ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر	قمر رئیس	نیا سفر پبلیکیشنز	۱۹۸۷ء
ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	۱۹۵۷ء
ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری	یعقوب یاور	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۷ء
ترقی پسند تحریک	اطہر نبی	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۸۶ء
ترقی پسند تنقید اور محمد حسن	شبنم ناز	شوبی آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، دہلی	۲۰۱۰ء
ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ	سید محمد عقیل	دریا آباد، الہ آباد	۲۰۰۹ء
ترقی پسند تنقید	تنویر خانم	تخلیق مرکز، لاہور	۱۹۸۴ء
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	پرو پرائٹر ادارہ اشاعتِ اردو	۱۹۴۵ء
ترقی پسند تحریک کی نصف صدی	علی سردار جعفری	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی	۱۹۸۷ء
تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین	یونین پرنٹنگ پریس، اردو بازار جامع مسجد دہلی	۱۹۵۲ء
تنقید اور اصول تنقید	عبادت بریلوی	ادارہ ادب وتنقید، لاہور	۱۹۸۴ء
تنقید اور جدید اردو تنقید	وزیر آغا	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۹ء
تنقید اور تجزیہ	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۹ء
تنقید شعرالعجم	محمود شیرانی		۱۹۴۳ء
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۲۰۱۱ء
تنقید کے بنیادی مسائل	آل احمد سرور	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ	۱۹۶۷ء
تنقیدی اشارے (مع اضافہ جدیدہ)	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۶۴ء
تنقیدی تناظر	قمر رئیس	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۸ء
تنقیدی دبستان	ڈاکٹر سلیم اختر	بک کارپوریشن، دہلی	۲۰۰۵ء
تنقیدی عمل	شارب ردولوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۵ء
تنقیدی مباحث	شارب ردولوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۵ء
تنقیدی مطالعے	شارب ردولوی	نصرت پبلشرز	۱۹۸۴ء

تنقیدی نظریات (حصہ دوم)	سید احتشام حسین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۹ء
تنقیدیں	خورشید الاسلام	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۷ء
تنقیدی افکار	شمس الرحمٰن فاروقی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۴ء
تنقیدی مقالات	سید محی الدین قادری زور	مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی اسٹیشن روڈ حیدرآباد، دکن	۱۹۲۷ء
جدید ادب منظر اور پس منظر	احتشام حسین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
جدید اردو تنقید: اصول و نظریات	شارب ردولوی	اتر پردیش اردو اکادمی	۱۹۹۴ء
جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات	ڈاکٹر خورشید جہاں	منشا پبلی کیشنز، ہزاری باغ	۱۹۸۹ء
جدید تنقیدی مقالے	محمد حنیف/ ارتضیٰ کریم	معرف گنج، گیا	۱۹۸۳ء
دبستانوں کا دبستان- کراچی حصہ اول	احمد حسین صدیقی	محمد حسن اکیڈمی	۲۰۰۳ء
سودھ پرودھی اور پرکریا	چندر بھان رات اور رام کمار کھنڈیلوال، جواہر پشتکالے، متھرا		۱۹۷۹ء
سودھ سوروپ ایوم مانک	بیج ناتھ سنگھل	میکملن کمیٹی آف انڈیا، دہلی	۱۹۸۰ء
شعرائے اردو کے تذکرے	حنیف نقوی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۸ء
صورت و معنیٰ سخن	شمس الرحمٰن فاروقی	اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس	۲۰۱۱ء
فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	نور الحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۹ء
فیض میر	مصنفہ: سلطان الشعراء حضرت میر محمد تقی میر، مع مقدمہ و ترجمہ فرہنگ		
	مرتب: سید مسعود حسن رضوی ادیب، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ		دوسرا ایڈیشن
قاضی عبدالودود: تحقیقی و تنقیدی جائزے	نذیر احمد	غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ نئی دہلی	۱۹۹۱ء
قدیم اردو کی تازہ تحقیق	محی الدین قادری زور	سید از سری نگر	
لفظ و معنی	شمس الرحمٰن فاروقی	شب خون، کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد	۱۹۶۸ء
مابعد جدیدیت (مضمرات و ممکنات)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۴ء
مارکسی جمالیات	اصغر علی انجینئر	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۸۴ء
مارکسی فلسفہ (اشتراکیت اور اردو ادب)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۰ء
مارکسزم اور ادب (منتخب مضامین)	پروفیسر محمد حسن	اعلیٰ پریس، دہلی	۱۹۸۱ء
مشرقی شعر اور اردو تنقید کی روایت	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۲ء
مطالعہ و تنقید	اختر انصاری	فرینڈس بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۶۵ء
معاصر اردو تنقید: مسائل و میلانات	شارب ردولوی	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۹۴ء

معاصر تنقیدی رویے	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۵ء
مقدمات عبدالحق (اضافہ شدہ)	ڈاکٹر عبادت بریلوی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۵ء
نظریاتی تنقید- مسائل اور مباحث	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۶ء
نقد و تحقیق	ساحل احمد	اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد	۱۹۹۸ء
نئی تنقید	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۸ء
ہماری شاعری (معیار و مسائل)	سید مسعود حسن رضوی ادیب	کتاب نگر دین دیال روڈ، لکھنؤ	۱۹۶۷ء

(ج) رسائل و جرائد

فکر و نظر	جولائی	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۶۳ء
روح ادب ماہنامہ	ادارہ فروغ اردو کراچی	شمارہ نمبر ۱۹	
روح ادب ماہنامہ	ادارہ فروغ اردو کراچی	شمارہ نمبر ۱۷	
روح ادب ماہنامہ	ادارہ فروغ اردو کراچی	شمارہ نمبر ۱۸	
روح ادب ماہنامہ	ادارہ فروغ اردو کراچی	شمارہ نمبر ۱۵، ۱۶، مئی- جون ۱۹۵۳ء	
خیال (سہ ماہی)	حبیب احسن	جلد ۵- شمارہ: ۱۷- اپریل تا جون ۲۰۰۶ء	
جدید رجحانات کا ادبی آئینہ)			
ہم قلم (ماہنامہ، جلد ۱، شمارہ ۱۲)	ادارہ مصنفین پاکستان، حلقہ کراچی، اگست ۱۹۶۱ء		
ہم قلم (ماہنامہ، جلد ۱، شمارہ ۳)	ادارہ مصنفین پاکستان، حلقہ کراچی، نومبر ۱۹۶۰ء		

☆

ممتاز حسین کی علمی اور ادبی خدمات

تلخیص

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی

نگراں

پروفیسر شہاب الدین (ثاقبؔ)

مقالہ نگار

نازیہ سنبل

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۲۰ء

گئی تھی یا گئی تو اختلافات باقی رہے تھے۔ اپنی تحقیق سے انھوں نے ثابت کیا کہ امیر خسرو کے والد کا نام سیف الدین لاچین تھا جبکہ عوام کے درمیان سیف الدین محمود رائج تھا۔ خسرو کی جائے پیدائش کے بارے میں انھوں نے تحقیق کے ذریعہ بتایا کہ خسرو پٹیالا میں نہیں بلکہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود خسرو کے نام کے متعلق ان کی تحقیق ہے کہ ان کا نام ابوالحسن یمین الدین نہیں بلکہ اصل نام محمد خسرو تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ سے ان کے تعلقات پیری مریدی کے نہیں دوستی و ہم نشینی کے تھے۔ امیر خسرو نے ایک سیاست داں اور دنیا دار کی زندگی گزاری۔ امیر خسرو کی عقیدت حضرت نظام الدین سے چاہے جتنی گہری ہو لیکن انھوں نے اپنی جاہ طلبی کو خیر باد نہیں کہا۔ حافظ کی غزل گوئی سے متعلق ممتاز حسین نے یہ نکتہ پیدا کیا حافظ نے خسرو سے فیض حاصل کیا ہے۔ سعدی اور حافظ کے درمیان خسرو ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ممتاز حسین کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے خود کو مطالعے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ ان کی تنقیدی اور تحقیقی تصنیفات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ علم وادب سے متعلق ان کی خدمات بے بہا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر ناقدین نے ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ان کی تنقید میں منطقی لب و لہجے اور سائنٹفک ترتیب کے لیے ان کی تعریف کی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی، ممتاز حسین کی تنقید کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان کی کتابوں کی تعریف کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک نقاد کی حیثیت سے ان کی جگہ محفوظ ہے۔ پروفیسر شہزاد منظر نے ممتاز حسین کو احتشام حسین کے پائے کا نقاد تصور کیا ہے اور بعض معاملات میں تو احتشام حسین پر بھی فوقیت دی ہے۔ سلیم احمد نے بھی ممتاز حسین کی خدمات کو بہت زیادہ سراہا ہے۔ سید محمد عقیل نے ممتاز حسین کے تنقیدی انداز بیان کے لیے ان کی تعریف کی ہے اور ان کے فکر کی گہرائی کی وجہ سے ان کے ہم عصروں کے درمیان ممتاز قرار دیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کے ابتدائی مضامین کے انداز بیان کی ثقالت کا ذکر تو کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اعتراف کیا ہے کہ ان کی بعد کی تنقیدوں میں یہ عیب کم ہوتا گیا۔ انھوں نے ممتاز حسین کے مضامین ''نثر معلیٰ'' اور ''رسالہ درمعرفت استعارہ'' کی خوب تحسین کی ہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے ممتاز حسین کے پختہ خیالات کے لیے ان کی تعریف کی ہے۔ مذکورہ بالا مشاہیر کی آرا کی روشنی میں کہا جاسکتا

ہے کہ ممتاز حسین کی تحریروں میں خامیاں کم اور خوبیاں زیادہ ہیں۔ سید محمد عقیل کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ ممتاز حسین کی تنقید عقلیت پسندی، سماجی اور تاریخی قوتوں سے اصلیت کی تلاش کا بہترین نمونہ ہیں جس میں جمالیات اور نفسیات کی جابہ جا عملی اور امکانی بحثیں طرز تحریر کو بیحد وقیع اور جامع بناتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ مارکسی تنقید کا بھی مثالی نمونہ بنتی ہیں۔

ممتاز حسین نے اپنے تحقیقی مضامین اور تصانیف میں نہایت باریک بینی کے ساتھ نئے نئے حقائق کا انکشاف کرتے ہوئے بہت سی مروجہ روایتوں کی تردید کی۔ اردو تحقیق میں وہ اپنی اس باریک بینی اور نکتہ رسی کی بنا پر یاد رکھے جائیں گے۔ ادبی نقاد کی حیثیت سے انھوں نے افراط وتفریط سے گریز کرتے ہوئے توازن اور اعتدال کی راہ اختیار کی۔ ترقی پسند ہونے کے باوجود ان کے نظریات میں وہ شدت نہیں ہے جو بعض دوسرے ترقی پسند نقادوں کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ ممتاز حسین نے کلاسیکی شعر وادب کا از سر نو مطالعہ کرکے اس کا جائزہ لینے اور قدر و قیمت متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اردو تنقید میں بھی وہ اپنے متوازن انداز اور اصابت رائے کی بنا پر یاد رکھے جائیں گے۔

○